DUE DATE

Late Fine Ordinary books 25 Paise per day. Text Book Re. 1/- per day. Over Night book Re. 1/- per day.

آفریں فطرت شناسی تیری قسامِ ازل
برقؔ کے حصے میں لطفِ سوز و ساز آہی گیا

یادگارِ برق

مرتبہ

شیش چندر سکسینہ طالب بی۔ اے دہلوی

مطبوعہ دیال پرنٹنگ پریس دہلی

قیمت:- [illegible] سنہ ۱۹۵۵ء علاوہ محصول ڈاک

فہرست مضامین

معروضات

اختصار مدِ نظر ہے چونکہ جنگ سے پیدا شدہ حالات کے باعث یہ ممکن نہیں کہ بالتفصیل کچھ عرض کیا جا سکے۔

اکثر تذکرے نظر سے گذرے لیکن سب کے سب تشنہ محسوس ہوتے۔ وہ مولفین ہوں خواہ مصنفین۔ لیکن ان کا مطمحِ نظر یہی رہا کہ اپنے تذکروں میں زیادہ سے زیادہ شاعروں کا ذکر کیا جائے۔ غرضکہ بہت سے فصلی شاعروں کے اذکار کے سبب بعض چوٹی کے شاعر و ادیب نظر انداز ہو گئے یا ان کے حالات و انتخابِ کلام میں اس درجہ قطع و بُرید روا رکھی گئی کہ بہت سی صورتیں مسخ ہو گئیں اور بہزار کوشش بھی پہچان میں نہ آئیں۔ کاشکہ ان کا ذکر ہی نہ کیا جاتا۔

یہ عرض کرنا غالباً بے محل نہ ہوگا کہ محض گنتی گنوانا لاحاصل ہے ایسے تذکروں کی ضرورت ہے جو ہر پہلو اور ہر لحاظ سے مکمل ہوں مجھے تسلیم ہے کہ یہ تذکرہ بہت کچھ تفصیلی ہونے پر بھی نامکمل ہے اس میں کئی ابواب شامل ہونے سے رہ گئے۔ اپنے مضامین نہ دے سکا۔

خواجہ تاش بھائیوں کے حالات و منتخب کلام سے اہلِ ذوق کو محروم رکھنا پڑا۔ نیز وہ مقالے بھی نہ دیئے جا سکے جو یومِ برقؔ کے سے رقم نہیں کئے گئے تھے اور نہ ہی ان کے تحریر کئے جانے میں میری کسی استدعا کو کوئی دخل تھا بلکہ یہ براہِ راست نتیجہ ہیں اُس سانحہ اور اُس سانحہ سے پیدا ہونے والے تاثر کا جو اُستاذی مرحوم کی ناگہانی وفات سے متعلق ہے۔ چاہتا تھا کہ مطلعِ انوار اور حرفِ ناتمام کی ایک ایک جلد صفِ اوّل کے ادیبوں اور شاعروں کی نذر کروں اور ان سے ملتجی ہوں کہ بعدہٗ مطالعہ وہ اُستاذی مرحوم کے کلام کے متعلق اپنی رائے ظاہر فرمائیں۔ اور وہ تمام قیمتی آرا بعنوان حدیثِ دیگراں، کتاب کی زینت بنیں بہت ممکن تھا کہ ایک آدھ جلد کا اور اضافہ ہو جاتا لیکن نامساعدتِ حالات بالخصوص کاغذ کی حصولیابی کی دقتوں سے عاجز آ کر کتاب کو یہیں ختم کرنا پڑا۔ اگر عوام کی جانب سے اس تذکرہ کا مناسب خیر مقدم کیا گیا تو شاید یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔

انتہائی ناسپاس گزاری ہوگی اگر میں اُن احباب کا شکریہ ادا نہ کروں جن کے اشتراک کے بغیر مجھے کاغذ دستیاب ہونا قریب قریب ناممکن تھا۔ جناب منشی اشیشور پرشاد صاحب منورؔ لکھنوی کے مشورے سے

کتاب کا سرورق تیار ہوا۔ جناب اختر حسن صاحب نے بحسن و خوبی
کتابت فرمائی اور عام روش سے ہٹ کر وعدے کے مطابق کام دیا۔

اس کے علاوہ اپنے اُن بیشمار دیدہ و نادیدہ کرمفرماؤں کا بھی دل
سے ممنون و مشکور ہوں جن کے اشتراک کی بدولت آج اس یادگار کو
آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہو سکا ہوں۔

خادمِ ادب
طالب دہلوی

۴ر دسمبر ۱۹۲۴ء



مہاراج بہادر برقؔ دہلوی - بی - اے

تعارف

(ماخوذ از "شعاع" سکندر آباد - ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء)

دنیائے ادب استاذی مرحوم افتخار الشعراء منشی مہاراج بہادر برقؔ دہلوی کو ایک مسلّم الثبوت اور بلند پایہ شاعر و ادیب تسلیم کر چکی ہے۔ اس بارے میں کچھ عرض کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان سطور میں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اپنے ادبی اور شاعرانہ کمال کے علاوہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو کن صفات سے متصف و ممتاز کیا تھا۔ بالفاظ دیگر اس مضمون میں آپ کے ذاتی شعار اور آپ کی نجی زندگی کے طور و طریق اور تہذیب و تمدن پر روشنی ڈالی جائے گی۔ زندگی میں عزیز و اقارب اور خویش و بیگانہ سے آپ کے مراسم اور تعلقات کا بھی تذکرہ مجملاً کیا جائیگا۔

استاذی مرحوم کے مجموعۂ نظم مطلع انوار کے مقدمہ سے جو جناب چودھری جگت موہن لال صاحب رواںؔ مرحوم ایم - اے - ایل - بی مصنف روح ادب کے زور قلم کا نتیجہ ہے - پتہ چلتا ہے کہ آپ ماہ جولائی ۱۸۸۴ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ آپ سکسینہ کائستھ تھے اور آپ کے آباؤ اجداد کا قدیم وطن سیکٹ ضلع

اسٹیٹ تھا۔ آپ اپنے والد کی ڈھلتی عمر میں پیدا ہوئے تھے۔ قبل ان کے والد کے کئی بچے فوت ہو چکے تھے اس لئے ان کے لئے بہت منتیں مانی گئیں اور بہت محبت سے آپ کی پرورش کی گئی۔

خاندان کے مورث اعلیٰ رائے جگروپ بہادر تھے جو اسٹیٹ کے مایہ ناز بزرگوں میں سمجھے جاتے تھے۔ کئی پشت سے آپ کے بزرگ دہلی میں متوطن تھے اور شاہی زمانے میں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز رہ چکے تھے۔ آپ کے دادا منشی خوب چند صاحب آخری دورِ شاہی میں شاہی وکیل تھے بقول حضرتِ مضطر دہلوی استاذی مرحوم کو شاعری بزرگوں سے ورثہ میں ملی تھی۔ آپ کے والد منشی ہر نرائن داس حسرت ایک خوش فکر شاعر تھے اور آپ کے نانا رائے دولت رام صاحب عبرت جو راجہ کنول نین کے خاندان کے ایک رکن تھے۔ ایک فاضل ادیب بلند پایہ شاعر تھے آپ صاحبِ دیوان بھی تھے اور آپ کو خاقانیٔ ہند اُستاد ذوق دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ ان بزرگوں کے حالات و کلام پُرانے تذکروں میں ملتے ہیں۔

عبرت آنجہانی کے درجِ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

سخت جانی تو نے شرمندہ کیا قاتل سرہانے   وقتِ کشتن پھر گیا مُنہ یار کی تلوار کا

ہر دم صبا سے ہے طلب بوئے زلفِ یار   لڑتے ہیں بات بات پہ اب تو ہوا سے ہم

کون سا ہے وہ پری رو کہ جسے اے عبرت   دے کے دل ایسے بنے پھرتے ہو دیوانے سے

جب کہ سلطنت رو بہ زوال آ گئی تو وہ قوم سب سے زیادہ مصیبت کا شکار

ہوتی ہے جو دربارِ شاہی سے وابستہ ہو۔ چنانچہ اسلامی حکومت کے خاتمہ پر اکثر کایستھ خاندانوں کا زوال ہوا۔ برق صاحب کا خاندان بھی اس انقلابِ سلطنت کا شکار رہا اور ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اس کی بھی معمولی حیثیت رہ گئی جب مرحوم نے ہوش سنبھالا تو اس وقت آپ کے والد ڈاکخانہ میں ایک معمولی کلرک تھے۔ بعد میں وہ گوڑگانوہ میں پوسٹ ماسٹر ہو گئے تھے۔

آپ کی والدہ بہت زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں مگر وہ ننھے شاعر کو روزانہ رامائن سنایا کرتی تھیں۔ انھوں نے مثنوی گلزار نسیم کے چند اشعار بھی انھیں یاد کرا دیئے تھے۔ جیسے ؎

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
شبنم کے سوا چرانے والا اوپر کا تھا کون آنے والا
جس کف میں ہو گل وہ داغ ہو جائے جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے

۱۹۰۲ء میں استاذی مرحوم نے انٹرنس پاس کیا۔ آپ کا تعلیمی زمانہ نہایت کامیاب تھا۔ آپ نہایت ذہین و فہیم طالب علم تھے۔ ماہ فروری ۱۹۰۵ء میں شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ حوادثِ زمانہ سے مجبور ہو کر آپ کو سلسلہ ملازمت میں پابند ہونا پڑا۔ تعلیم ناتمام رہ جانے کا آپ کو بے حد ملال رہا۔ بالآخر موقع ہاتھ آنے پر ۱۹۱۸ء میں آپ کو منشی فاضل (آنرز ان پرشین) کے امتحان میں جس شان سے کامیابی حاصل ہوئی اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک ممتحن آپ کی

کاپی دیکھ کر اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنی غزل آپ کی خدمت میں اصلاح کے لئے روانہ کی۔

دوسرے سال ایف اے اور ۱۹۲۰ء میں بی۔ اے پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ بعد ازاں ۱۹۲۲ء میں سب آرڈینیٹ اکاونٹ سروس کے ڈیپارٹمنل امتحان میں کامیابی حاصل کی اور سپرنٹنڈنٹ کے جلیل القدر عہدہ پر مامور ہوئے اور اسی عہدہ کے فرائض نہایت سرخروئی کے ساتھ انجام دیتے ہوئے آپ نے فروری ۱۹۳۶ء میں انتقال کیا۔ ملازمت آپ کے لئے ایک ذریعۂ ناگزیر رہی ورنہ حقیقت میں آپ کا رجحانِ طبع شعر و سخن اور مطالعہ کتب کی جانب تھا۔

آپ کی پہلی شادی سے ایک اولاد ہوئی لیکن اس نے صغر سنی ہی میں انتقال کیا۔ کچھ عرصہ بعد بچہ کی ماں نے بھی رحلت کی۔

آپ کی دوسری شادی ہمارے خاندان میں ہوئی۔ آپ کو میرے والد کے حقیقی چاچا کی دوسری لڑکی منسوب ہیں اس وقت آپ کے دو لڑکے اور ایک لڑکی حیات ہیں۔ لڑکے ہنوز سکول میں[1] تعلیم پاتے ہیں اور لڑکی کی شادی ہو چکی ہے، اور بفضلہ صاحب اولاد ہے۔

پروردگار سے یہی دعا ہے کہ انھیں طول حیات اور زندگی کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔

---

[1] بڑے صاحبزادے مسٹر کرشن اوتار ہندو یونیورسٹی بنارس میں، اور چھوٹے صاحبزادے رام اوتار کسی مقامی سکول میں تعلیم پا رہے ہیں۔

پہلے آپ کا تخلص کچھ اور تھا لیکن ایک موقع پر جب آپ کو ہندوستان کے بلند مرتبہ شاعر اور نثار ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی سے شرفِ نیاز حاصل ہوا تو وہ آپ کی طباعی، ذہانت اور خوش گوئی سے بہت متاثر ہوئے لیکن انہیں آپ کا تخلص پسند نہ آیا۔ چنانچہ اُنہیں کے ایما سے آپ نے برقؔ تخلص اختیار کیا۔

آپ نے ابتدا میں ڈرامہ نویسی کی طرف بھی توجہ فرمائی مگر یہ سلسلہ دیرپا اور مستقل ثابت نہ ہوا۔ آپ کے ڈرامے ساوتری، اور کرشن اوتار کئی بار اسٹیج پر کامیابی کے ساتھ کھیلے گئے لیکن اب نایاب ہیں۔

مغربی شعرا میں آپ ورڈز ورتھ، کیٹس، شیلی اور براؤننگ کے کلام کے دلدادہ تھے۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا بھی تھا کہ اب اردو میں بھی کیٹس اور شیلی پیدا ہو چلے ہیں۔

آپ آتشؔ و انیسؔ کو دورِ قدیم کی صفِ اول کے اردو شعرا میں شمار کرتے تھے۔ بلبلِ ہند جہاں اُستاد مرزا داغؔ کی شگفتہ بیانی کے ساتھ ساتھ آپ کی غزلوں میں آتشؔ اور آپ کی نظموں میں انیسؔ کا رنگ صاف جھلکتا معلوم ہوتا ہے۔ تشبیہات آپ کے کلام کی جان ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ صائبؔ کے کلام کے عاشقِ زار تھے۔ اور غزل میں نظیری کو استاد تسلیم کرتے تھے۔

دورِ جدید کے اردو شعرا میں منشی درگا سہائے سرورؔ جہاں آبادی کے

پیرو اور قائل تھے جیسا کہ آپ کی نظموں سے ظاہر ہے، آپ پر سرور مرحوم کے کلام کا اثر زیادہ غالب تھا۔

شروع شروع میں آپ نے فصیح الملک حضرت داغ اور بعد ازاں انہیں کے مشورہ اور ایما سے جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی کے روبرو زانوئے ادب تہ کیا۔ مگر فی الحقیقت ان کا تلمذ محض برائے نام تھا اس لئے کہ آپ کی چونچال طبیعت نے بہت جلد اپنے لئے ایک علیحدہ شاہراہ سخن نکال لی تھی۔ جس کے لئے حضرت داغ کی پیروی اور جناب آغا شاعر ہی کی رہنمائی کافی نہ تھی۔ آپ شاگردی کی منزلوں کو تیزی کے ساتھ طے کرنے کے بعد خود استاد بننے کی صلاحیت حاصل کر چکے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ مطلع انوار کی نظموں کا انداز و طرز بیان اچھوتا ہے وہ اپنے مشاہدات جس وقت نظم کرنے بیٹھتے حسن ادا کو ہاتھ سے نہ چھوڑتے۔ ان کا اسلوب بیان تقلید سے بے نیاز ہوتا۔ ان کی جدت طبع ایک ہی نفس مضمون کو ادا کرنے کے لئے متعدد پہلو تلاش کرتی اور وہ نہایت کامیابی کے ساتھ اس راہ کو طے فرماتے۔ اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ شاگرد نظم گوئی کے میدان میں ان دونوں اساتذہ سے کہیں آگے بڑھا ہوا تھا۔ ان کے اخیر زمانہ کی غزلیں بھی بڑے سے بڑے شاعر کے کلام کے ساتھ ٹکر لیتی ہیں حتیٰ کہ داغ اور آغا شاعر دونوں کے مجموعہ کلام میں بھی شاید اس پایہ

کی غزلیں نہ ملیں گی۔ اس کا ایک بڑا سبب غالباً یہ بھی ہے کہ اب مذاقِ شاعری بہت کچھ بدل گیا ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بہتر سے بہتر نظم کہنے والے شعرا جب تغزل کے میدان میں قدم رکھتے ہیں تو بُری طرح ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اگرچہ یہ لازم نہیں کہ ایک اچھا شاعر ایک اچھا مقرر ایک اعلیٰ پایہ کا نثر نگار بھی ہو۔

برقؔ مرحوم میں یہ دونوں کمال موجود تھے وہ ایک طرف جہاں عرصۂ شاعری کے شہسواروں میں سے تھے وہاں دوسری طرف ان کا رنگ تغزل بھی نہایت بلند پایہ تھا اور آپ نثر بھی خوب لکھتے تھے۔ آپ کا شمار نظم گو شعرا میں ہے لیکن تو بھی آپ کا کلام کیا بلحاظ حُسنِ بیان اور کیا بلحاظ تخیل دورِ جدید کے کامیاب سے کامیاب غزل گو شاعر کے کلام سے ٹکر لیتا ہے۔ اردو شاعری کی جس ارتقائی منزل پر اصغرؔ، فانیؔ، حسرتؔ، سیمابؔ اور جگرؔ پہنچ چکے ہیں وہ استاذی مرحوم کے حصہ میں بھی آئی تھی۔

استاذی مرحوم ایک کامیاب مقرر بھی تھے جو اصحاب سری جیتر گپت سبھا کے پلیٹ فارم پر آپ کی انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تقاریر سُن چکے ہیں وہ میرے اس قول کی تائید ضرور کریں گے۔

آپ کے حُسنِ اخلاق کے متعلق منشی تلوک چند صاحب محرومؔ کے دو شعر درج کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔

برنگ ساہ کھنچکر برق کی جانب گئے دہلی　　که ان کو جذبِ الفت میں مثالِ کہربا دیکھا
دلِ مرحوم نازاں ہے کہ جن سے راہ تھی اسکو　　انھیں سرتاقدم مجموعۂ صدق وصفا دیکھا

تاہم آپ قدرِ زود رنج ضرور تھے۔ لیکن چونکہ دل میں میل نہ ہوتا تھا اس لئے بس یہ کیفیت ہوتی تھی کہ جیسے بادل برسا اور کھل گیا۔ فوراً ہی محبت اور یگانگت کی باتیں شروع ہو جاتیں۔ یا زیادہ سے زیادہ دوسری ملاقات تک وہ قضیہ طے ہو جاتا۔

آپ حد درجہ خوددار تھے لیکن آپ میں غرور کا شائبہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ نجی زندگی کے معاملات ہوں خواہ منصبی کاروبار یا شعروادب، آپ کی یہ روش ہر جگہ یکساں طور پر قائم تھی۔ ایک طرف دوست واحباب میں آپ ہردلعزیز تھے دوسری طرف ماتحتوں اور حاکموں کی نظر میں قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ یہی حال دنیائے شاعری میں تھا۔ اپنے سے بڑوں کے سامنے ادب سے سر جھکاتے۔ چھوٹوں کے ساتھ محبت سے پیش آتے۔ مبتدی اور نومشق شعرا کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ مگر خودداری کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے نہ چھوٹتا۔

مرحوم کی حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور شگفتہ طبعی بھی ضرب المثل ہے۔ یوں تو آپ کی برجستہ گوئی کے ہزاروں ایسے واقعات ہیں جو آپ کے اسی جوہرِ نمایاں کے شاہد ہیں اور جن سے ناظرین کو حد درجہ محظوظ ومسرور کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہاں بنظرِ اختصار بعض چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

گلی پیپل مہادیو میں منشی کشن دیال صاحب شاد کے یہاں بسنت کا جلسہ تھا۔ کچھ کھانے پینے کا بھی انتظام تھا اس کے بعد مشاعرہ آغاز ہونا تھا عزمی منور صاحب نے مزاحیہ انداز میں فرمایا

شوقِ شغلِ نقل نے شاعر اکٹھے کر دیئے

برق صاحب نے فی الفور مصرعہ لگایا

سنترے ایسے کھلائے دانت کھٹے کر دیئے

اس مشاعرہ میں مصرعہ طرح یہ تھا

کھِلا ہے غنچۂ دل جوشش بہار سے آج

حضرتِ برق نے ایک طویل غزل پڑھی جو بہت پسند کی گئی۔ یہ شعر خاص طور پر انتہائی مقبول ہوا جو اب تک لوگوں کے زبان زد ہے۔

نفس کی آمد و شد کا اگر ہے نام حیات برائے نام ہوں زندہ اس اعتبار سے آج

افسوس کہ آج اس برائے نام زندگی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

نئی دہلی میں ایک مشاعرہ وحید العصر حضرت بیخود دہلوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ایک صاحب نے جن کا تخلص پریشاں ہے، ایک نہایت لغو اور رکیک غزل پڑھی جو طرح میں تھی۔ دو ایک مصرعہ یاد ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

پیشاب بھی خطا ہوا جاناں کے سامنے

مقطع کا مصرعہ ثانی تھا۔

ٹھہرے گا کون منشی پریشاں کے سامنے

اس غزل سے شعرا بہت بدمزہ ہوئے نشست اس طرح پر تھی کہ ہر شاعر صدر کے سامنے آکر غزل پڑھتا تھا۔ جونہی منشی پریشاں غزل پڑھ کر اُٹھے استاذی مرحوم نے پہلا مصرعہ ان کی طرف اشارہ کرکے اور دوسرا مصرعہ صدر کی طرف مخاطب ہوکر یہ شعر پڑھا

بزمِ سخن کی آپ نے مٹی خراب کی — یہ شعر اور ایسے سخنداں کے سامنے

منوّر صاحب کے یہاں مشاعرہ تھا۔ اتفاق سے لسان الہند حضرتِ صفیؔ لکھنوی کے مشہور و معروف مطلع کا ذکر آیا۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا — ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

برقؔ صاحب نے اس زمین میں ایک غزل سنائی جس میں آواز کا قافیہ کئی جگہ نظم تھا۔ محترمی نیّرِ ذت ساحر دہلوی صدر مشاعرہ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے فرمایا غزل میں آوازیں بہت سی ہیں۔ برقؔ صاحب نے فوراً جواب میں فرمایا لیکن سب بیٹھی ہوئی ہیں۔

خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمائیں۔ اس سے متضاد معنی پیدا ہوتے ہیں۔ بیٹھی ہوئی ہیں۔ سے اظہارِ عجز و انکساری کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ اور دوسری طرف یہ مطلب بھی پایا جاتا ہے کہ قافیہ "آواز" کی نشست نہایت پختہ و مضبوط ہے۔ غزل میں بالخصوص اس قافیہ کو بطرزِ حسن ادا کیا گیا ہے۔ اربابِ ذوق کیلئے

استاذی مرحوم کے صرف وہ شعر نقل کرتا ہوں جس میں قافیہ آواز نظم کیا گیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

میں صرف تجسس ہوں دیر و حرم میں　　جہاں بھی کہیں ہو تم آواز دینا
بلائے شبِ غم نے دم پر بنا دی　　اجل کو ذرا کوئی آواز دینا
وہ بادِ بہاری کی کیف آفرینی　　چٹک کر وہ غنچوں کا آواز دینا
مرے دل کی گہرائیوں سے وہ تیرا　　خموشی کے پردے میں آواز دینا

منوّر صاحب اور برق صاحب میں گفتگو ہو رہی تھی کسی شاعر کے کلام کو برق صاحب کے کلام کا مقابلہ تھا۔ برق صاحب نے فرمایا کہ میری غزل اُن کی غزل کو لڑا لیجئے۔ منوّر صاحب نے جواب میں کہا قبلہ کوئی غزل بھی بیٹر ہے۔

رائے کرسن صاحب حیدرآباد سے تشریف لائے۔ اُن کی آمد پر حضرتِ ساحر کے یہاں چیدہ چیدہ شعرا کی ایک مختصر صحبت جمی۔ جناب احسن لکھنوی نے ایک غزل فرمائی جس کا مطلع یہ تھا۔

بشر کے دل میں اگر حرص و آز باقی ہے　　تو جملہ رنج و الم کا جواز باقی ہے

اتفاق سے غزل کا مقطع نہ تھا۔ غزل ختم ہوتے ہی استاذی مرحوم نے برجستہ فرمایا

ابھی تو مقطع بھی بندہ نواز باقی ہے

جناب بسمل الہ آبادی دہلی تشریف لائے۔ ساحر صاحب کے یہاں ان کی

آمد پر شعراء کا اجتماع ہوا۔ برق صاحب کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ ان کی شرکت مشکوک تھی لیکن وہ تشریف لے آئے۔ اتفاق سے اسی محفل میں بسمل جہاں آبادی بھی موجود تھے۔ لوگوں نے برق صاحب کو دیکھتے ہی کہا۔ برق صاحب آگئے۔ برق صاحب نے محفل پر نظر ڈالی اور بسمل جہاں آبادی و بسمل الہ آبادی کو ایک ساتھ بیٹھے دیکھ کر فرمایا۔

کھینچ کر لایا یہاں دو بسملوں کا اشتیاق

بلند شہر میں مشاعرہ تھا جس کا مصرع طرح تھا

خورشید ماند ہے رخِ جاناں کے سامنے

میرے پاس طرحی غزل نہ تھی۔ سفر طے ہوتا جاتا تھا اور میں اشعار نظم کرتا جاتا تھا استاد ؒ میں اصلاح فرما دیتے اور شعر بنا دیتے۔ مقطع کا مصرعۂ ثانی میں نے یوں نظم کیا۔

مضموں کی قدر کم ہے خوش الحان کے سامنے

مصرعہ زبان سے نکلتا تھا کہ استاد نے برجستہ فرمایا۔

طالب ہوں بزمِ شعر میں جوہر شناس کا

مندرجہ ذیل شعر کی بلند شہر میں قرار واقعی داد ملی۔ یہ شعر خالص استادی مرحوم کا عطیہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

بجلی ہے منفعل دلِ بے تاب سے مرے
پانی ہے ابر دیدۂ گریاں کے سامنے

اسی طور پر ایک مرتبہ دہلی میں سودیشی نمائش تھی۔ میرے پیر بھائی جناب

شیر سنگھ صاحب نازؔ استاذی مرحوم کے ہمراہ بغرض سیر و تفریح نمائش گئے ہوئے تھے لیکن نازؔ صاحب کچھ پریشان خاطر معلوم ہوتے تھے اور نمائش میں کوئی دلچسپی نہ لیتے تھے۔ استاذی مرحوم نے سبب دریافت فرمایا تو آپ نے جواب میں عرض کیا کہ ایک مطلع کا مصرع ثانی موزوں ہوا ہے اور جب تک مصرع اولیٰ نظم نہ ہو جائے گا طبیعت کو سکون نہ ہوگا۔ وہ مصرع یہ تھا۔

جو سفینہ دل کا تھا درہم ہوا برہم ہوا

استاذی مرحوم نے فوراً ہی فرمایا

قلزم الفت میں وہ طوفان کا عالم ہوا

اور جناب نازؔ کو دماغی کاوش سے نجات حاصل ہو گئی۔

ایک مرتبہ آپ ہاپوڑ مشاعرہ میں تشریف لے گئے۔ خیال تھا کہ دہلی سے دیگر اساتذہ بھی شرکت فرمائیں گے۔ لیکن اتفاق سے صرف برقؔ صاحب ہی تشریف لے گئے ــــ ایک معمر بزرگ نے آپ کو سروقد تعظیم دی اور فرمایا۔ آپ کیا آئے گویا تمام دہلی آ گئی۔ بالفاظ دیگر ان بزرگ نے استاذی مرحوم کو دہلی کے بقیہ شعرا پر فضیلت دی۔

قریب ۱۹ برس کی بات ہے۔ اس وقت میری عمر دس سال ہو گی۔ انھیں دنوں استاذی مرحوم کو ایک شادی میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ جانا پڑا میں بھی وہاں موجود تھا بچپن کا زمانہ۔ انھیں دیکھتے ہی بول اٹھا "سنا ہے آپ بڑے

شاعر ہیں" اگر آپ اسی وقت ایک تازہ شعر کہہ کر سنائیں تو ہم جانیں" مسکرا کر ایک شعر سنایا اور ساتھ ہی فرمایا" بری پیشین گوئی ہے کہ تم شاعر ہوگے اور جس وقت میری یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہو تم اپنا تخلص طالب رکھنا" چنانچہ میرا تخلص استاذی مرحوم کا عطیہ ہے۔

جیسا مطلع الانوار کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے، ایک مرتبہ آپ کی آنکھیں تھیں۔ ابتدائے سن شعور کا زمانہ تھا۔ ایک دوست نے پوچھا کہو کیا حال ہے؟ بے ساختہ آپ کی زبان سے نکلا

دل تو آتا تھا مگر اب آنکھ بھی آنے لگی
سخت کاری عشق کی یہ رنگ دکھلانے لگی

اس قسم کے اور بھی بے شمار واقعات ہوں گے جو میرے علم میں نہیں اور جن میں سے بعض میں نے بنظر اختصار ارادتاً نظر انداز کر دئے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جبکہ "ہمدرد" اور "کامریڈ" دو اخبار مشہور محبّ وطن مولانا محمد علی مرحوم کے زیر اہتمام شائع ہوتے تھے۔ مولانا مرحوم نے استاذی مرحوم اور مشہور فسانہ نویس منشی پریم چند مرحوم کو اول الذکر کے منظومات اور آخر الذکر کے افسانوں کے لئے تیس تیس روپے فی نظم و فی افسانہ پیش کیا تھا۔

استاذی مرحوم کی قدر و منزلت ہندو اور مسلمان شعرا میں یکساں تھی، اور دور جدید کے تمام شعرا انھیں دہلی کا بہترین شاعر قرار دیتے ہیں حتیٰ کہ حسرت موہانی جیسے

سخت گیر اہلِ کمال اور جگر مرادآبادی جیسے عدیم المثال شاعر بھی ان کی عظمت تسلیم کرتے ہیں اور حضرت اصغر گونڈوی مرحوم نے تو مطلع انوار کے دیباچہ میں آپ کے کمالاتِ شاعری کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے۔

اسی طور پر جناب منور لکھنوی کے مضمون "ادب اردو اور ہندو" جو سالنامہ "وطن" دہلی ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ دہلی کے ایک قدیم مسلمان بزرگ جو اب بقیدِ ہستی نہیں ہیں۔ کہا کرتے تھے کہ اگر برق ہندو نہ ہوتے تو وہ انھیں دہلی کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کر لیتے۔ وائے افسوس! یہ صدا اس ہستی کی تھی جو

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

کا نعرہ بلند کیا کرتا تھا۔

اگرچہ ان بزرگ کے اظہارِ خیال سے تعصب کی بو پائی جاتی ہے۔ پھر بھی اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ برق مرحوم کے کہاں تک قائل تھے۔

عوام تو خیر آپ کے قدر دان تھے ہی لیکن راج درباروں میں بھی آپ کی کافی عزت تھی۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں خُلد مکانی ملک معظم اعلیٰ حضرت جارج پنجم کی جشنِ تاجپوشی پر آپ کو اپنے قصیدہ کے صلہ میں پنجاب گورنمنٹ کی جانب سے نقرئی تمغہ، اور اعزازی سرٹیفکیٹ ملا۔

۱۹۱۶ء میں والیٔ ریاست نرسنگھ گڑھ نے بھی انعام و اکرام سے نوازا اور دربار پٹیالہ نے بھی آپ کو دو مرتبہ مدعو کیا۔

حیدرآباد کے ایک مناظمہ میں آپ کی نظم "صبح امید" جو آپ کے مجموعہ نظم مطلع انوار میں شامل ہے۔ درجہ اول پر شمار کی گئی اور آپ کے شاعرانہ کمال کے اعتراف میں ایک تمغہ عنایت ہوا۔

آپ کی ملازمت کو قریب ۳۰ سال کا عرصہ ہوچکا تھا اور آپ کا ارادہ تھا کہ پنشن پانے کے بعد آپ اپنی بقیہ بیش بہا زندگی شعروادب کی خدمت کے لئے وقف کردیں گے۔ آپ نے ایک مرتبہ حیدرآباد اور ہندوستان کے ان دوسرے شہروں کی سیروسیاحت کا بھی ارادہ کیا تھا جو کسی نہ کسی زمانہ میں ادب اردو کا مرکز رہے ہوں۔ آپ وہاں کے موجودہ سرکردہ ادیبوں اور شاعروں سے بھی ملنا چاہتے تھے۔ پنشن لینے کے بعد آپ نے اپنے رجحان طبیعت کے مطابق یہ بھی ارادہ کیا تھا کہ کسی علمی ادارہ سے متعلق ہوجائیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ بآسانی قائم ہوسکتا تھا کون ایسا علمی ادارہ تھا جو آپ کو ہاتھوں ہاتھ نہ لیتا اور آپ کی مسلمہ قابلیت سے فائدہ نہ اٹھاتا۔ آپ جہاں بھی جاتے آپ کی قدر و منزلت میں کوئی کسر باقی نہ رہتی لیکن بقول کسے

سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

ان ارادوں میں سے کسی ایک کی بھی تکمیل نہ ہوسکی وائے لبا ارزو کہ خاک شدہ

فروری ۱۹۳۶ء میں آپ جناب شگن چند صاحب روشن بی اے ایل ایل بی وکیل کی دختر نیک اختر کی شادی میں معہ بال بچوں کے پانی پت تشریف لے گئے۔

۱۲ر کی صبح کو دہلی واپس تشریف لانے والے تھے لیکن مشیتِ ایزدی کچھ اور ہی تھی۔ ۱۲ر فروری ۱۹۳۶ء کی شب آپ کے لئے شب قیامت ثابت ہوئی۔ تقریباً ۱۲ بجے دفعتاً آپ کو کچھ بے چینی سی محسوس ہونے لگی اور ایسا معلوم ہوا کہ قلب کی حرکت بند ہو رہی ہے۔ ابھی علاج معالجہ کا بندوبست بھی نہ ہونے پایا تھا کہ آن واحد میں اس باکمال شاعر نے نہایت خاموشی کے ساتھ موت کے نہ ٹلنے والے فرمان کے سامنے سر جھکا دیا۔ افسوس ہے

عمر برق و شرار ہے دنیا　　کتنی ناپائدار ہے دنیا

آپ نے محلہ رام نگر واقع پہاڑ گنج میں زر کثیر صرف کر کے ایک عالیشان مکان تعمیر کرایا تھا۔ اس میں مشاعرہ کے لئے ایک ہال خاص طور پر تعمیر کرایا تھا۔ چاہتے تھے کہ افتتاح کی رسم مشاعرہ سے ہو لیکن اب تو اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

افسانۂ غم کو طول دینے سے کیا حاصل؟ البتہ اس قدر کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ بالخصوص آپ کے استاد آغا شاعر زار و قطار رو رہے تھے۔ ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں ویسے تو آپ کے حسنِ اخلاق کا مداح کون نہیں تھا۔ اس افسوسناک خبر کے موصول ہوتے ہی آپ کے دفتر میں چھٹی ہوگئی تھی اور دوپہر ہوتے ہوتے یہ المناک خبر تمام شہر میں پھیل گئی تھی جس وقت آپ کا جنازہ اٹھا

سیکڑوں احباب شریک میت تھے جس میں آپ کے حکام یعنی اکاونٹنٹ جنرل اور ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل کے علاوہ ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک تھے لیکن استاد اور شاگرد کے مابین جو ایک قلبی تعلق ہوتا ہے اس کے باعث فی الواقع جناب آغا صاحب کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

یوں تو مشیت ایزدی کسی کو کیا معلوم لیکن بظاہر آپ کی مرگ ناگہانی کا باعث وہ حادثہ ہے جس کے ہاتھوں آپ کی دختر جگر راج کنور جل کر فوت ہو گئی تھی اس صدمہ کو آپ تا دم آخیر فراموش نہ کر سکے اس وقت سے آپ کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ ذرا سی بات سے بھی زیادہ متاثر ہو جاتے اور ہر وقت سفر آخرت کے لئے تیار رہتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ دنیا سے دل برداشتہ ہو گئے ہیں۔ چنانچہ یہ ذہنی کیفیت آپ کے کلام سے بھی ظاہر ہونے لگی تھی۔ بزم مشاعرہ میں شعر پڑھتے ہوئے آپ پر رقت طاری ہو جاتی یا رامائن سنتے ہوئے دفورِ جذبات سے آنکھ کا پُرنم ہو جانا معمولی بات تھی۔ ضبط و استقلال کا دامن بہت کچھ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

آپ کی نا وقت وفات کا باعث ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو اپنے نئے مکان واقع رام نگر محلہ پہاڑ گنج کے تعمیر کرانے میں بہت سخت دوڑ دھوپ کرنی پڑی جس سے آپ کی صحت خراب ہو گئی اور اس میں روز بروز انحطاط ہی پیدا ہوتا گیا۔

کرشن ودہن، مطلع انوار، اور حرف ناتمام کے علاوہ بھی آپ کا بہت سا کلام آپ کی اہلیہ محترمہ کے پاس محفوظ ہے (خدا کرے محفوظ ہو) جس کی اشاعت کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔ نظمیں تو خیر بجز معدودے چند کے سب شائع ہو چکی ہیں اور کسی نہ کسی مجموعہ میں شامل ہیں، لیکن غزلوں کا خدا حافظ ہے۔

حرف ناتمام، میں جو غزلیں اور منتخب اشعار ہیں، وہ آپ کے مجموعۂ غزلیات کا ایک فیصدی بھی نہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ آپ کے رنگ تغزل پر کسی نے بالتفصیل روشنی ڈالنے کی کوشش نہیں کی تاہم ان منتخب اشعار کے مطالعے سے بھی آپ کے ذوق شعری کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے اور اہلِ نظر غزل گو شعرا کی صف میں آپ کا درجہ مقرر کر سکتے ہیں۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات کو برق مرحوم کے کلام میں کسی پیغام کی تلاش ہو۔ ان کی تسکینِ قلب کے لئے سبزۂ بیگانہ، دلِ درد آشنا اور کارِ خیر کی نوع کی نظمیں کافی ہیں۔ ان نظموں کا اندازِ بیان مرحوم کی شاعری کا جزو لاینفک ہے جو آخری دم تک قائم رہا۔ اس میں آپ نے نہ صرف زندگی کی افادیت پر روشنی ڈالی ہے بلکہ خود بھی اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ آپ کے قول و عمل میں ایک نہایت دلکش مطابقت پائی

جاتی تھی فلسفۂ حیات کو آپ نے جس حسن وخوبی سے سمجھا اس کا ثبوت آپ کی آخری نظم 'خودشناسی' سے بھی ملتا ہے جس کا اندازِ بیان وہی ہے جو کارِ خیر کا ہے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ مرحوم سیاسی شاعر نہ تھے البتہ آپ کے دواوین برنبائے مصلحت اس نوع کے کلام سے خالی ہیں۔ آپ کی سیاسی نظمیں اکثر دوسروں کے دیوان کی زینت ہیں، اور بقول

ہم سے کہاں چھپینگے وہ ایسے کہاں کے ہیں

آج بھی اہلِ نظر سے دادِ تحسین حاصل کر رہی ہیں۔

طالب دہلوی

باب اوّل

عرضِ ناشر

استاذی مرحوم افتخار الشعراء منشی مہاراج بہادر برقؔ دہلوی۔ بی
اے۔ منشی فاضل کے درج ذیل تین مجموعۂ نظم۔

(۱) کرشن درپن

(۲) مطلع انوار

(۳) حرفِ ناتمام

زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر لائے جا چکے ہیں۔ اول الذکر
دو مجموعے آپ کی حیات میں شائع ہوئے اور تیسرا مجموعہ میری حقیر سعی و
کاوش کا نتیجہ ہے۔

ہاں دو امین میں ملک کے سربرآوردہ اور برگزیدہ ادیبوں اور شعرانے مقالات کی صورت میں استاذی مرحوم کے کمالِ فن کی داد دی ہے اور نذرِ عقیدت پیش کی ہے۔ یہ جملہ مقالات اس باب میں یکجا کردئے گئے ہیں۔ اُمید ہے کہ اِن بلند پایہ مقالات کے مطالعہ سے آپ کو خاطرخواہ فائدہ پہنچے گا۔

طالب دہلوی

کرشن درپن

تمہیدی الفاظ

(از قلم معجز رقم و یدانت رتن علامۂ دہر منشی سورج نرائن صاحب مہر دہلوی)

جناب برق سے شاعری کے رسیاؤں کا تعارف کرانا روز روشن میں آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ آپ کا نام نامی اردو علم ادب کے آسمان پر مہر جہاں تاب بن کر چمک رہا ہے جن اصحاب نے مشاعروں اور قومی جلسوں میں آپ کی زبانِ مبارک سے آپ کا کلام سنا ہے وہ پھڑک اٹھے ہیں۔ اور جنھوں نے رسالوں اور اخباروں میں آپ کی نظمیں پڑھی ہیں وہ ایسے گرویدۂ کمال ہو گئے ہیں کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔

مضمون، زبان، بندش اور دہلی کا ٹکسالی محاورہ غرض ہر پہلو کے لحاظ سے آپ کا کلام مجموعۂ محسنات ہے۔ عرصے سے اربابِ ذوق اصرار کر رہے تھے اور انھیں میں فقیر مہر بھی ہے کہ آپ اپنا ذخیرۂ نظم شائع کرا دیں۔ شکر کا مقام ہے کہ اگر پورا ذخیرہ نہیں تو اس کا ایک دلچسپ حصہ آج ہدیۂ ناظرین ہوتا ہے۔ امید ہے کہ شائقینانِ ادب اس نوجوان شاعر کے لطیف کلام سے لطف اندوز ہونگے۔

یہ ایک گلدستہ ہے جس میں پریم اور بھگتی کے پھول یکجا جمع کر کے

آنند کند بھگوان کرشن کے چرنوں میں صدق عقیدت سے چڑھائے گئے ہیں بھگوان کا اوتار پوری سولہ کلا کا بتایا جاتا ہے اور اس متبرک بھارت ورش میں اس غرض سے ہوا تھا کہ دھرم کو فروغ ہو۔ اسی غرض کو مدِ نظر رکھ کر بھاگوت گیتا میں وہ دھرم اُپدیش دیا ہے جسے عالمگیر و ہمہ گیر کہنا چاہیئے۔ کرمی یوگی بھگت اور گیانی چار ہی قسم کے آدمی مذہب و روحانیت کی راہ میں گامزن ہوا کرتے ہیں۔ بھگوان ان چاروں کو لیتے ہیں اور وہ تعلیم دیتے ہیں جن سے چاروں ہی بندِ ذلیل سے رہائی پائیں اور موکش کے بامِ بلند پر چڑھیں یہی وجہ ہے کہ گیتا ایسی ہر دلعزیز کتاب ہے اور بھگوان کرشن کو ہر عقیدہ کا آدمی اس پریم اور بھگتی کی نظر سے دیکھتا ہے۔

جناب برقؔ نے گیتا کو اپنا رہبر و رہنما بنایا ہے اور اپنی پُر زور و دلکش نظموں میں کہیں کرم اور گیان کے فلسفے کی توضیح کی ہے اور کہیں بھگتی رس کے آنند کا سمندر بہایا ہے۔ یہ پیاری نظمیں ہر طرح کی نظم کے رسیاؤں کی نظر میں پیاری محسوس ہوں گی اور سب لُطف لے لے کر ان کو پڑھیں گے۔ کرشن بھگتی کے بھجنوں سے کیا سنسکرت اور کیا ہندی شاعری کی آواز تمام ہندوستان میں سدا سے گونج رہی ہے۔ شکر ہے کہ اس رسیلی بھگتی پر شعرائے اردو بھی طبع آزمائی کرنے لگے۔ پھر جناب برقؔ سے مصفا قلب "ایشور بھگت" اور باکمال شاعر کا اس کوچے میں قدم رکھنا اردو شاعری کی خوش بختی کا موجب سمجھنا

چاہیئے۔ غزل کی فرسودہ عشقیہ شاعری کے مقابلے میں اس قسم کی دل ہلانے اور اونچا اٹھانے والی نظمیں حقیقت میں اُردو ادب کے لئے باعث فخر و ناز ہیں سب مجھے یقین ہے کہ اور ارباب مذاق بھی ایسی ہی نظمیں لکھ کر اپنے کلام کو شاعرانہ اور متبرک بنائیں گے اور دنیا و عقبیٰ دونوں میں ثواب کمائیں گے۔

دہلی ۲۰ جون ۱۹۲۶ء

خاکسار سورج نرائن مہر

حضرت مہر کا وصال ۱۹۳۱ء میں بمقام لاہور ہوا -

اوم تت ست

(تقریظ از سالک راہِ طریقت مجموعۂ فضیلت شاعر شیوا زباں جادو بیاں پنڈت امرناتھ صاحب ساحرؔ دہلوی)

فروغِ علم سے روشن ہے شمع بزمِ سخن   صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

اس مختصر سے مجموعۂ نظم اور ناظم کی نسبت جناب منشی سورج نرائن صاحب مہرؔ دہلوی نے اپنے تمہیدی الفاظ میں جو کچھ ارقام فرمایا ہے اس کا ایک ایک حرف گوہر آبدار ہے جو صداقت واقعات کی چمک دمک سے گرویدہ کر لینے کے لئے کافی سے زیادہ ہے۔ اس سے زیادہ مناسب اور موزوں الفاظ میں اپنے عزیز دوست منشی فاضل مہاراج بہادر صاحب برقؔ دہلوی کا تعارف اہلِ علم و کمال سے کرانا مجھ ناچیز ہیچمدان کی قابلیت کے احاطے سے باہر ہے۔ مگر برقؔ صاحب کے جوشِ محبت سے مجبور اور کلام معجز نظام سے متاثر ہو کر دل بے اختیار ہو گیا اس لئے ان کی اعلیٰ قابلیت سخندانی اور صدق دلی کی داد دینا میرا فرض ہے اگر خاموش رہتا ہوں تو گنہگار ہوتا ہوں۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں جس کے درست ہونے میں بھی مجھے شک ہے اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہوں۔ شائقین معنی پر غور فرمائیں اور الفاظ کو نظر انداز کریں۔

اس مختصر سے رسالہ میں جس کا نام "کرشن درپن" ہے۔ ۸ نظمیں شامل ہیں۔ میں مصنف کی اُس حسن عقیدت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس نے ان ۸ نظموں پر اس رسالہ کو ختم کیا ہے کہ اس سے آگے زبان، دِل اور عقل کو جائے طاقت نہیں ہے۔ یہ ۸ نظمیں کیا ہیں گویا ان ۸ پرکرتیوں کی نمائندہ ہیں جن کا ظہور ذات بحت نور علیٰ نور سے ہوا ہے اور جن کا مفصل بیان سر ہید بھگوت گیتا کی ساتویں ادھیائے کے (اشلوک ۴ تا ۵) میں زبانی سری کرشن بھگوان کے ہوا ہے۔ انہی ۸ پرکرتیوں کی پردہ میں جان جو نویں قوت ہے اور سولہ کلا سمپورن کہلاتی ہے کونین میں جلوہ گر ہو کر کارکن ہو رہی ہے وہ خیال، قیاس، گمان اور وہم سے برتر ہے۔ اس لئے زبان۔ دل عقل اور انا نیت کی رسائی اُس تک نہیں ہو سکتی۔ اس رسالہ میں لائق مصنف نے اسرارِ حقیقت اور رموزِ معرفت کا وہ دلچسپ مرقع دکھایا ہے جس کو صفائے قلب اور عشقِ صادق کی بدولت اس نے خود بچشم ظاہری و باطنی مشاہدہ کیا ہے۔

نظم اوّل موسومہ کرشن بھگوان، فی الواقع اس کے سگن اور نرگن روپ کی توضیح ہے۔ جو پرا بھگتی یعنی عشق و فنا کے وسیلہ سے کی گئی ہے۔ باعتبار نفس مضمون اعلیٰ درجہ کا فلسفۂ اُلوہیت ہے اور باعتبار زبان و اظہار اعلیٰ پایہ کی فصاحت اور زباندانی کا نمونہ ہے۔ نا پر لطف یہ ہے کہ کلام صاف شستہ سریع الفہم اور پُر اثر ہے۔ ہر ایک شعر سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے اور یہی حال باقی ماندہ دیگر کلام کا ہے۔ بنظرِ اختصار مُشتے نمونہ از خروارے پیش کیا جاتا ہے

مطلع۔ تو وہ بُت ہے کعبۂ دل ہے صنم خانہ ترا
شمع جاں افروز ہے تو میں ہوں پروانہ ترا

جانِ علیم ہر دل میں متمکن ہے وہ شاہد ازل کا پرتو حسن ہے۔ شاہد ازل وہ صنم ہے جو بُت تھا دل میں مقیم ہوکر جلوہ افگن ہے۔ پس دل اسی بُت کا صنم خانہ ہوا جہاں صنم پرست عشق کے وسیلہ سے پروانہ وار شمع جمال شاہد ازلی کا شیدا ہوکر انجام کار محو فنا ہوجاتا ہے۔ کیا اچھی تصویر عشق و فنا کی لفظ و بیان میں کھینچی گئی ہے۔ اہلِ ذوق اندازہ کرسکتے ہیں

شعر:۔ عکسِ وحدت پردۂ کثرت میں ہے پرتو فگن
یہ طلسمات جہاں ہے آئینہ خانہ ترا

کس دقیق مسئلہ کو کس خوش اسلوبی سے سادہ الفاظ میں واضح کیا گیا ہے نور ذات کا ظہور تین صفات میں ہوا ہے۔

برہما صفت ایجاد۔ وشنو صفت قیام۔ شیو صفت فنا۔ یہ توحید کی لطف تثلیث ہے جو علم سے بہرہ ور نہیں ہی اس راز سے انکار کرسکتے ہیں۔ اہلِ علم اس حقیقت کے آشنا ہیں دیدن بلا ثلاثہ ممکن نہیں ۔نظر۔ ناظر اور منظور کا ثلاثہ قائم ہونا لابدی ہے مگر علم عرفان میں صورت یہ ہے کہ توحید نے تثلیث کے لباس میں جلوہ گر ہوکر اپنے حسنِ خود آرا کا مشاہدہ آپ ہی کیا ہے۔ شرک ماسوا درمیان میں نہیں ہے۔ کونین ہر سہ صفات کا جلوہ ہے اور صفات جلوۂ ذات (اودمیاسے ہشتم) اور صفات حجاب ذات (ادمیائے ہفتم) ہے بچشم بصیرت حسن ازل کو بیرون اور اندرون

پردہ جلوہ گر دیکھ رہی ہے۔ یہ دیدار قلبِ مصفّا میں نصیب ہوتا ہے۔ اندرون پردہ حرم اور بیرون دیر ہے۔ یہ کونین نیرنگِ طلسمات ہے جہاں حسنِ ازل صفات کے آئینہ میں جلوہ گر ہو رہا

شعر:- نقشبندِ دہر ہے پھر دونوں عالم سے الگ
رنگ ہے نیرنگِ ہستی سے جداگانہ ترا

کس سرِّ خفی کا اس شعر میں صفات کے ساتھ انکشاف کیا گیا ہے۔ جس اہلِ ذوق نے شریمد بھگوت گیتا کی نوین ادھیا کو بغور پڑھا ہے، وہ اس شعر کو خلاصہ نج سروپ نوین تو عہ سولہویں کلا سمپورن کا تصدیق کر سکتا ہے۔

(ملاحظہ ہو مخزنِ اسرار صفحہ ۳۰ اشلوک ۴ لغایتہ ۱۰) نمبر اشلوک ۱۵ لغایتہ ۱۹)

میں ہوں مخفی طور پر دائم محیطِ کائنات   مجھ سے کل اجسام قائم ہیں نہ ان سے میری ذات
دیکھ میری قدرتِ کامل کہ گو موجود ہے   بود عالم میری ہستی میں مگر نابود ہے
گرچہ میری وجہ سے ہے سارے عالم کا قیام   میں ہوں بے نام و نشاں عالم نہیں میرا مقام
تند چو بائی ہوا جیسے خلا میں ہے مدام   مجھ میں موجودات کا ہے ایسی صورت سے قیام
میری قدرت سے ہے ہر رنگِ عالمِ غیب و شہود   گاہ پیدا گاہ پنہاں گاہ بود و گہہ نبود
قادرِ مطلق ہوں میں لہٰذا اپنی قدرت سے ضرور   بار بار اس عالمِ فانی کو دیتا ہوں ظہور
میں سدا ہوں اپنی قدرت سے بری اور بے اثر   اس لئے پابندیٔ افعال سے ہوں بے خطر
میری قدرت کے لوازم میں ہیں حرکت اور قرار   اس طرح گردش میں ہے یہ عالمِ ناپائیدار
عالمِ اسباب میں ہوں میں ہی از سر تا بپا   ہیچ ہے چشمِ بصیرت کی نظر میں ماسوا

میں ہی کرتو ہیں ہی یگ ہوں میری غلا میری کمی — میں ہی آگ اور میں ہی منتر اور میں ہی آہوتی
میں ہی سب کا والد و مادر بزرگ و پاسباں — میں ہوں تینوں وید رگ سام و یجر کا رازداں
مقصد عالم مقدس اسم اعظم اونکار — منزل مقصود سالک شاہد و پروردگار
میں ہی ملجا اور ماوا اور مربی خلق کا — تخم لافانی کی صورت موجب خلق و فنا

میں تپش ہوں میں ہی بارش جاذبہ اور باردہ
زندگی اور موت ہیں ہے حق و نیکر باطلہ

ذات کا نقش بند دہر ہونا اور پھر کون من یعنی ظہور اور بطون سے علیحدہ ہو کر عین علم ہونا اور ان کا یخ روپ دکھا کر نیرنگ ہستی سے اس کو جدا کہنا جس قابلیت سے اس شعر میں ادا کیا گیا ہے، اس کی داد اہل دل واقف رموز ہی دے سکتے ہیں۔ بے نشان کا نشان میں آنا اور باوجود نشان میں آنے کے بے نشان قائم رہنا وہ مسئلہ ہے جس میں بڑے بڑے فلسفی حیران و پریشان ہیں اور تصدیق اس شعر کے نفس مضمون کی شریمد بھگوت گیتا کے نویں ادھیائے سے ہوتی ہے۔

اگلے اشعار میں لائق مصنف نے اپنے پریم بھاؤ کا اظہار کیا ہے اور نرگن بھگتی سے عشق کی فضیلت اور فنا کی منزلت دکھائی ہے۔

شعر:- سب کی نظروں میں سماتا ہے بقصد شوق دید
چشم نظارہ میں ہے جلوہ جداگانہ ترا

کیا حیرت انگیز صورت کو آشکار کرتا ہے۔ ذات کا صفات میں ظہور بقدر مدارجِ امتزاج ترکیبی اور ذات کا اسم بہاؤ (نظر مساوات) ہونا۔ اور وحدت کا کثرت میں واحد اور کثیر نظر آنا قابلِ تقسیم کا منقسم صورت میں نظر آنا کس خوبی سے کس فصاحت سے بیان ہوئے ہیں۔

شعر
قطرہ قطرہ بن گیا خمخانۂ وحدت۔ اثر
جوشِ مستی میں ذرا چھلکا تھا پیمانہ ترا

کیا غضب کا استعارہ ہے۔ وہ جوتی سر کا مقام۔ وہ کرشن بھگوان کی چرن پا دکا۔ وہ میدانِ جنگ میں کرشن بھگوان کا ارجن کو دم کے دم میں حُسنِ عُریاں کو دکھانا۔ برہم اور ادھیاتم کا یکجا نظارہ دکھانا۔ ادھیاتم میں برہم کی حقیقت کو آشکار کر دکھانا۔ سب اس شعر کے نفظ لفظ سے تراوش کرتا ہے۔ یہ وہ جوشِ مستی ہے جو شریمد بھگوت گیتا کی گیارہویں ادھیا میں منکشف ہوا ہے جس نے دم کے دم میں ارجن کی عقلِ محدود کو عقلِ لاتعین میں منتقل کر دیا۔ اسی نظارہ کی بدولت ارجن نے جزو کو کُل میں دیکھا اور قطرہ کو دریا کا آشنا پایا۔ اسی جلوہ کی برکت سے علمِ ذات پیمانہ سے چھلک کر ایک ایک قطرہ اسکا جہاں جہاں علم الوہیت ہے ایک خمخانۂ وحدت اثر ہو گیا ہے۔ تمام عالم اس امر کو تسلیم کرتا ہے اگلا شعر اس کی تصدیق ہے۔

شعر۔
قطرہ گیستا کا ہے دنیا میں کانِ معرفت
بند ہے کوزہ میں دریا سے روانِ معرفت

اس شعر کے مضمون سے کسی اہلِ علم اہلِ ذوق اور اہلِ دل کو انکار نہیں ہو سکتا جو کچھ بیان ہوا ہے واقعات کا بیان ہوا ہے اور تمام عالم کا اتفاق اس پر ہے کہ گیتا کا فلسفہ نہایت اعلیٰ فلسفہ ہے جس تک کسی دوسرے فلسفہ کی رسائی نہیں ہو سکی ہے اور نہ آئندہ ہونے کی ظاہرا امید ہے۔

چونکہ اختصار مدِنظر ہے اسی قدر کلام کے تبصرہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ باقی ماندہ کلام کی بھی یہی صورت ہے۔ پریم بھاؤ کو ابتدا سے انتہا تک نبھایا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میرے محب منشی مہاراج بہادر صاحب برق کا کلام برقی اثر طبائع میں بھر دیتا ہے۔ یہی پریم بھاؤ ان کے جذبات کو کامیاب بنا دیتا ہے۔ پرماتما ان کے پریم بھاؤ میں دن دونی رات چوگنی ایزادی عطا فرمائے۔

ساحر دہلوی۔ ۶ جولائی ۱۹۲۶ء

۱۱ ستمبر ۱۹۳۲ء کو اربابِ ادب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پنڈت جی کو ہاتھ سے کھو بیٹھے

قطعۂ تاریخ

از نتیجۂ فکر عزیز محمد خاں ناظم با کمال منشی پیارے لال صاحب رونق دہلوی مرحوم (۱)

بیک جلوۂ برق حسنِ خیال
نمایاں شدہ شانِ علم و ادب
پئے سالِ طبع رونق ہم گفت
بجا کرشن درپن چہ منتخب
۱۹۲۶

شاعرِ خوش بیاں جنابِ برق
خوب لکھا کرشن درپن ہے
کہہ رہا ہے ہر لفظ لفظ اس کا
واہ وا کیا کرشن درپن ہے
فکرِ رونق سے ہو عیاں سنِ طبع
تحفہ اچھا کرشن درپن ہے
۱۳۴۵

۱؎ رونق صاحب ۲۳ اپریل ۱۹۳۲ء کو اللہ کو پیارے ہوئے۔

کرشن درپن پر اظہار خیال

حضرتِ برق دہلوی کا کلام
برق تاثیر کرشن درپن نام

سترِ مخفی کا کھولنے والا
بے زباں ہو کے بولنے والا

سطر سطر اسکی ہے خمِ ابرو
فقرہ فقرہ ہے بولتا جادو

اس سے بہتر کلام کیا ہوگا
اور لبریز جام کیا ہوگا

ایک ساغر میں بھر دیا دریا
بند کوزہ میں کر دیا دریا

فطرتِ حق کا پاک راز ہے یہ
اک حقیقت نما مجاز ہے یہ

ایسے بھگتوں کو ہے یہ تحفۂ نَو
جن کی بھگوان سے لگی ہے لَو

فکر مدہوش ہے خرد گم ہے
مئے جذبات کا یہ قلزم ہے

آئینہ ہے دلی عقیدت کا
کرشن بھگوان کی محبت کا

فرض ہے یہ ہر ایک ہندو کا
مول لے گلستاں یہ خوشبو کا

کرشن درپن پہ اور کیا کہیے
برق صاحب کو مرحبا کہیے

فیض سے جن کے زندگی پائی
جسمِ مردہ میں جان سی آئی

کرشن بھگوان کے ہوئے درشن
کرشن درپن ہے حق نما درپن

ملاحظہ۔ یہ منظوم تقریظ سیدالقلم پنڈت یوگراج نظر سوہانوی کے دیوان 'شعلۂ زار' سے ماخوذ ہے
افسوس کہ پنڈت جی موصوف چند سال ہوئے انتقال فرما گئے

مطلعِ انوار

مقدمہ

از

جناب چودھری جگت موہن لال صاحب رواںؔ ایم اے ایل ایل بی

مصنف "روحِ رواں"

جب مجھ سے میرے مکرم دوست برقؔ دہلوی نے اپنی نظموں کے مجموعہ پر مقدمہ لکھنے کے لئے کہا تو میں نے بہت تعجب کیا، تعجب اس لئے کہ انھوں نے اتنی بڑی خدمت سے مجھ ہیچمیرز کو سرفراز کرنا کیونکر مناسب سمجھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ میں اس ذمہ داری سے کیونکر عہدہ برآ ہونگا لیکن چونکہ ایک دوست کی فرمائش تھی اسے اپنے لئے مایۂ ناز سمجھکر اس پر کاربند ہونا ہی اپنا فرض تصور کیا۔ لیکن اسکا مجھے اعتراف ہے کہ ان جواہر پاروں کی داد مجھ سا بے مایہ نہ دے سکتا تھا نہ دے سکا۔[۱]

پہلی نظم آپ کی سب سے پہلی نظم "عمل خیر" کے عنوان سے (جو اس مجموعہ

---

(۱):۔ حضرت رواںؔ نے ۲۶ر ستمبر ۱۹۳۴ء کو داغ جدائی دیا

(۲):۔ تعارف کے عنوان سے استاذی مرحوم کے جن سوانحی و خاندانی حالات کا تذکرہ کیا جا چکا ہے، انھیں یہاں ارادتاً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

میں "کارِ خیر" کی سرخی سے صفحہ ۶۰ پر درج ہے۔ جنوری ۱۹۴۰ء میں رسالہ زبان دہلی میں شائع ہوئی جو بہت پسند کی گئی اور آج تک مقبولِ عام ہے۔ اس نظم کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک صحیح دیباچہ ہے آئندہ کے صفحات زرّیں اور کارنامۂ شاعری کا حسنِ بیاں اور زورِ طبیعت قابلِ داد ہے۔ پوچھنے والا خود اپنے سے یا دوسرے انسان سے سوال کرتا ہے کہ اس دنیا میں آکر تو نے کیا کیا۔ سوال کو بدل بدل کے پوچھا ہے اور اس طرح پر بے حد جدّت کے ساتھ کارِ خیر کے مختلف محمود طریقے دائرۂ بیان میں آ گئے ہیں۔ اکثر اشعار برجستہ اور قابلِ ستائش ہیں لیکن ان سب کا یہاں درج کرنا طوالت سے خالی نہ ہوگا صرف ایک بند ملاحظہ ہو۔ اور بہت سی باتیں پوچھنے پر پوچھتے سوال ہوتا ہے ؎

شریکِ دردِ دل ہو کر کسی کا دکھ بٹایا ہے　　مصیبت میں کسی آفت زدہ کے کام آیا ہے
پرائی آگ میں پڑ کر کبھی دل بھی جلایا ہے　　کسی بیکس کی خاطر جان پر صدمہ اٹھایا ہے
کبھی آنسو بہائے ہیں کسی کی بدنصیبی پر
کبھی دل تیرا بھر آیا ہے مفلس کی غریبی پر

کتنا اچھا معیارِ حیات ہے اور کیسی سچی بات۔ واقعی انسان کا دنیا میں آنا بیکار اور محض بیکار رہے اگر اس نے کمزوروں کی مدد اور بقول جناب برقؔ ؎

"کبھی کچھ چارہ فرمائی" نہ کی زخمی و خستہ کی"

اس کے بعد آپ کو نظم لکھنے سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی دلآویز نظمیں اردو کے بہترین رسائل و جرائد، ادیب، زمانہ العصر، زبان، مخزن وغیرہ میں شائع ہونے لگیں اور آپ کا مشاہیر میں شمار ہونے لگا ایک خاص بات بیان قابلِ ذکر یہ ہے کہ نیچرل نظمیں لکھنے سے آپ کے ذوقِ غزل گوئی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ یہ مذاقِ سخن اپنی جگہ پر جذباتِ حسن و عشق کے اظہار کا ذریعہ رہا۔ چنانچہ غزلوں کا دیوان بھی تقریباً مکمل ہے، جو عنقریب "تجلیاتِ برق" کے نام سے شائع ہوگا۔

اس مجموعہ میں آپ کے سامنے زیادہ تر وہ نظمیں ہیں جنکا تعلق مظاہر فطرت یا اخلاقیات سے ہے۔ یا ان میں مذہبی رنگ کے ساتھ ساتھ عام دلچسپی کا ایسا پہلو نمایاں ہے کہ ہر مذہب و ملت، ہر طبقہ و فرقہ کا آدمی ان میں ذوقِ ادب اور دلکشی کا کافی سامان پائیگا

میں اس مقدمہ میں اس عام کمزوری سے اپنے کو محفوظ رکھنا چاہتا ہوں کہ اساتذہ ماضی یا اور دیگر مقتدر ہستیوں کی منقصت کروں یا جناب برق دہلوی کی نسبت اپنی محبت اور عقیدتمندی کو اس قدر کام میں لاؤں کہ غیر معمولی اور جانبدارانہ ستائش کا مجرم سمجھا جاؤں۔ کوشش کروں گا کہ جناب برق کے کلام کی خصوصیت منصفانہ پیرایہ میں بیان کروں اور بس۔ ان کا پایہ دوسرے شعرائے ماضی و حال سے موازنہ کرنے پر کیا قرار پائیگا اس کی بابت اپنی رائے نہیں ظاہر کرنا چاہتا اسے

ارباب ذوق خود طے کریں گے اور کوئی طے کرے یا نہیں زمانہ خود ہر عمل کا نقاد اور صحیح معنوں میں جوہری ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قدما سے موازنہ کرنے میں بجائے خود ایک بہت بڑا اندیشہ حائل ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ تعظیم ہمارے احساسِ تنقید پر غالب آجاتی ہے اور ہم اپنے پیشروؤں کے لئے ان کی صحیح جگہ انتخاب کرنے سے عموماً قاصر رہتے ہیں۔ ہم کو ان کے محاسن نظر آتے ہیں لیکن معائب ہماری تعظیم میں گم ہو جاتے ہیں۔

غزل گو شعرا یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اردو کی شاعری کا مخزن اور مخرجِ تخیلی اور زبانی برج بھاشا ہے جس پر کثرت سے فارسی کا رنگ غالب ہے کہیں کہیں عربی کی چاشنی بھی ہے لیکن چونکہ عموماً لوگ زبانِ عربی سے صرف روشناس ہوتے ہیں اس کے نکات و محاسن سے صرف چند خوش قسمت ہی واقف ہوتے ہیں اس لئے بالعموم اردو غزل میں ہندی اور فارسی ہی کا اجتماع نظر آتا ہے۔ ذاتی جذبات بھی شاعر کے بقدرِ ظرف و امکان اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔

میر کے جذبات اور بلند تخیل نے اردو زبان میں وہ درجہ حاصل کیا جو اب کسی دوسرے شاعر کو شاید ہی نصیب ہو اس کے کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو وہ لچکدار میٹھی سُریلی زبان ہی مفقود ہوتی جاتی ہے۔ اب شاید حسنِ تحریر و تقریر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بڑے بڑے ثقیل الفاظ عبارت و شعر میں بھر دیئے جائیں خواہ وہ بے محل ہی

کیوں نہ ہوں سے

وہ صحبتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

کیا آجکل کی دشوار اردو میں یہ لطافت کسی طرح بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس سے میرا مفہوم یہ نہیں ہے کہ زبان اسی پُرانے انداز و پیمانے پر بضد قائم رکھی جائے ترمیم و تنسیخ ہی نہ ہو لیکن میں اس نئی موج تجدید کے خلاف ضرور ہوں۔

میرؔ کی زبان اور جذبات کا ذکر زبانِ اردو کی رفعت بیان کرنے کے لئے نامکمل ہوگا اگر اسی سانس میں غالبؔ کے تخیل کا تذکرہ نہ کر دیا جائے چونکہ شعر شاعر کے قلب کا آئینہ بردار ہوتا ہے اور شاعر اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اس لئے تمام دنیا کی تاریخ شاید اشعار کی ارتقائی منزلوں سے باسانی لکھی جا سکتی ہے کیونکہ اپنے محور سے ہٹ کر اور اپنے گرد و پیش کی کیفیتوں سے بلند تر ہو کر شعر کہنا صرف انہی چند ہستیوں کا حصہ ہے جن کا شمار ملکی شاعروں کی صف سے بلند تر ہو کر شعرائے عالم کی ذیل میں آجاتا ہے۔ المختصر غالبؔ نے اپنی تخیل کو آسمان پر پہنچا دیا۔ کچھ تو اس کا کثرتِ مطالعہ اور کچھ اس کی غیور اور بیحد جدت طراز طبیعت اس کی ذمہ دار ہے۔ کبھی کبھی ہم صاف محسوس کرتے ہیں کہ خیالات کا ایک سمندر اس کے دل میں موجیں مار رہا ہے۔ اپنے قلب کے احساسات کو بیان کر دینا چاہتا ہے لیکن غزل کی محدود کائنات اس کے

ارباب ذوق خود طے کریں گے اور کوئی طے کرے یا نہیں زمانہ خود ہر عمل کا نقاد اور صحیح معنوں میں جوہری ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قدما سے موازنہ کرنے میں بجائے خود ایک بہت بڑا اندیشہ حائل ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ تعظیم ہمارے احساسِ تنقید پر غالب آجاتی ہے اور ہم اپنے پیشروؤں کے لئے ان کی صحیح جگہ انتخاب کرنے سے عموماً قاصر رہتے ہیں۔ ہم کو ان کے محاسن نظر آتے ہیں لیکن معائب ہماری تعظیم میں گم ہو جاتے ہیں۔

غزل گو شعرا یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اردو کی شاعری کا مخزن اور مخرجِ تخیلی اور زبانی برج بھاشا ہے جس پر کثرت سے فارسی کا رنگ غالب ہے کہیں کہیں عربی کی چاشنی بھی ہے لیکن چونکہ عموماً لوگ زبانِ عربی سے صرف روشناس ہوتے ہیں اِس کے نکات و محاسن سے صرف چند خوش قسمت ہی واقف ہوتے ہیں اس لئے بالعموم اردو غزل میں ہندی اور فارسی ہی کا اجتماع نظر آتا ہے۔ ذاتی جذبات بھی شاعر کے بقدرِ ظرف و امکان اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔

میر کے جذبات اور بلند تخیل نے اردو زبان میں وہ درجہ حاصل کیا جو اَب کسی دوسرے شاعر کو شاید ہی نصیب ہو اس کے کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو وہ لچکدار میٹھی سُریلی زبان ہی مفقود ہوتی جاتی ہے۔ اب شاید حسنِ تحریر و تقریر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بڑے بڑے ثقیل الفاظ عبارت و شعر میں بھر دیئے جائیں خواہ وہ بے محل ہی

کیوں نہ ہوں ؎

وہ صحبتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

کیا آجکل کی دشوار اردو میں یہ لطافت کسی طرح بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس سے میرا مفہوم یہ نہیں ہے کہ زبان اسی پرانے انداز و پیمانے پر بضد قائم رکھی جائے ترمیم و تنسیخ ہی نہ ہو لیکن میں اس نئی موج تجدید کے خلاف ضرور ہوں۔

میرؔ کی زبان اور جذبات کا ذکر زبانِ اردو کی رفعت بیان کرنے کے لئے نامکمل ہوگا اگر اسی سانس میں غالبؔ کے تخیل کا تذکرہ نہ کر دیا جائے۔ چونکہ شعر شاعر کے قلب کا آئینہ بردار ہوتا ہے اور شاعر اپنے گردوپیش کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اس لئے تمام دنیا کی تاریخ شاید اشعار کی ارتقائی منزلوں سے بآسانی لکھی جا سکتی ہے کیونکہ اپنے محور سے ہٹ کر اور اپنے گردوپیش کی کیفیتوں سے بلند تر ہو کر شعر کہنا صرف انہی چند ہستیوں کا حصہ ہے جن کا شمار ملکی شاعروں کی صف سے بلند تر ہو کر شعرائے عالم کی ذیل میں آجاتا ہے۔ المختصر غالبؔ نے اپنی تخیل کو آسمان پر پہنچا دیا۔ کچھ تو اس کا کثرتِ مطالعہ اور کچھ اس کی غیور اور بیدار جدت طراز طبیعت اس کی ذمہ دار ہے۔ کبھی کبھی ہم صاف محسوس کرتے ہیں کہ خیالات کا ایک سمندر اس کے دل میں موجیں مار رہا ہے۔ اپنے قلب کے احساسات کو بیان کر دینا چاہتا ہے لیکن غزل کی محدود کائنات اس کے

تخیل و جذبات کی حامل بن سکتی ہے، نہ اردو زبان اس کے خیالات کو صحیح اور جامع طور پر ادا کر سکتی ہے۔ دُور کیوں جائیے اس کی پہلی غزل کا پہلا شعر جو دیوانِ مطبوعہ میں ملتا ہے اسی کو لیجئے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

مجھے تو اس شعر میں خود خیال "فریادی" نظر آتا ہے کہ میں پورے طور پر ادا نہیں ہوا۔ اور زبان فریادی نظر آتی ہے کہ میں غالب کے تخیل کی لطرزِ حسن آئینہ برداری نہ کر سکی۔ اب معنی کی ٹھونس ٹھانس دوسری چیز ہے۔ نتیجہ آخرکار یہ ہوا کہ خود غالب کو یہ کمی محسوس ہوئی اور اس نے عین لاچاری کی حالت میں آواز بلند کی:-

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

یا جیسا میں نے ایک غزل کے مقطع میں عرض کیا تھا

ایسے بھی کچھ نالہائے قلبِ مضطر ہیں رواں
جو فضائے آسماں میں حشر تک گونجا کریں

غالب کا نالۂ قلبِ مضطر برابر فضائے آسمان میں گونجتا رہا اس کے بعد اردو شاعری شاہانِ اودھ کے آخری زمانہ میں بیدلستی و بدمذاقی کا شکار ہو گئی اور ہم صاف طور سے دیکھتے ہیں کہ آج تک اس تغزّلِ نبل سے پورے طور پر بحل نہیں سکی۔

نیا اسکول شعر ملکی حالات کا ایک لازمی نتیجہ سمجھیئے یا اردو شاعری کی خوش قسمتی کہ انگریزی زبان کی ترویج کے ساتھ اردو شاعری میں بھی ایک نیا دور شروع ہوا۔ زبان میں نئے خیالات داخل ہونے لگے اور انگریزی ماہران فن کیٹس اور شیلی ۔ ورڈز ورتھ اور ٹنی سن کے معجزاتِ شعر ہمارے سامنے آئے اور فطرتِ انسانی کے تقاضے کے بموجب ہم میں ایک آرزو پیدا ہوئی کہ ہماری زبان کا دامن بھی ان موتیوں سے بھرا جائے۔ خاکے ہمارے سامنے آ گئے تو ہندوستان ایسے ملک میں جہاں غزل میں جذباتِ حسن و عشق سماتے نہ تھے اور فطرت اپنی رنگین چادر ہر طرف پھیلائے ہوئے ہے۔ اشعار کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔ نئے نئے شاعروں نے نئے نئے انداز سے شعر لکھنا شروع کیا اور اُفقِ اردو پر ایک نئے رنگ کی بہار نظر آنے لگی۔ احسان فراموشی ہوگی اگر اس موقع پر جناب برق دہلوی کے پیشروان ماضی و حال میں سے چند کا ذکر اس موقع پر نہ کر دیا جائے۔

مجتہدانِ عصر جدید حالی و آزاد کے بعد نادر کاکوروی اور سرور جہان آبادی کا نام بے ساختہ ہماری زبان پر آجاتا ہے۔ حالی نے اپنی زبان سے قدیم طرز غزل گوئی کی دل کھول کر مذمت کی اور اپنے ہمعصروں پر اسکا اثر قائم کر دیا۔ محض الفاظ کے گورکھ دھندے بنانے کے خلاف اس نے ایک صدائے احتجاج بلند کی اور وہ صدا خدا کا شکر ہے کہ جن کانوں میں پہنچنا چاہیئے تھی اُن میں پہنچے بغیر نہ رہی جب حالی کہتا ہے اور اسی پستی سے کے

زمانے کی شاعری کے متعلق کہتا ہے ؎

حالیؔ اب آؤ پیرویٔ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفیؔ و میرؔ کر چکے

تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ ایک حسّاس دل جل رہا ہے اور ہم اس کے اثر سے بے چین ہو جاتے ہیں۔ غزل سے نفرت یا بے تعلقی تو جب تک مشرقی شاعری زندہ ہے ناممکن ہے اور مناسب بھی نہیں۔ البتہ غزل کے علاوہ دوسری اصناف شعر کی جانب رغبت، اس ترمیم و تجدید کا لازمی نتیجہ ہے اور وہ نادر کاکوروی کی نظموں میں بخوبی ظاہر ہوا بسترہ جہان آبادی۔ اکبر، اقبال و محروم نے کافی دادِ سخن دی۔

آزاد کی رکھی ہوئی بنیاد کو حالی نے کسی قدر بلند کیا اور اگر براہ راست حالی کو مغرب کے اساتذہ کا کلام دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوتا تو مولانا حالی یقیناً بہترین نظم لکھنے پر قادر ہو جاتے، اس پر بھی حالی کی شاعری سے جو گرانقدر اضافہ اردو ادب میں ہوا وہ قابل صد آفرین ہے اور جب کبھی حالی ان بندشوں سے آزاد ہو کر شعر کہتے ہیں تو ان کا صحیح جذبہ جھلک اٹھتا ہے اور ان کی روح خود ان کی ہمت پر وجد کرتی ہے، جیسے ان کی مشہور نظم چُپ کی داد "ہے۔ لیکن ان پیشقدم شعرا میں جنہوں نے پہلے پہل غزل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور نئے دور کا خیر مقدم کیا حالی کا نمبر اول ہے۔

حالی کے پیشرو آزاد نے بھی اس قسم کی محمود کوششیں کیں اور خود بھی اس صنفِ شعر کی ترقی میں بہت کام کیا لیکن وہ نثر لکھنے کے لئے فطرتاً زیادہ موزوں تھے اور ان کی نثر

نظم پر فوقیت رکھتی ہے کہیں کہیں البتہ "مثنوی خواب امن" اور "مثنوی شب قدر" میں ہم آزاد کی شاعری کا سچا جوہر دیکھتے ہیں۔

اب یہ زمانہ آیا کہ محض ذاتی مفاد اور ذہنی ترقیوں کے علاوہ شعرا کی نظر مجموعی حیثیت سے عوام اور ملکی بہبود کی طرف پھری۔ اُدھر مغرب کی شاعری زیادہ داخل مزاج ہونے لگی۔ شعرا کو یہ احساس ہونے لگا کہ ان کے ذاتی۔ قومی۔ ملکی فطری جذبات کے اظہار کے لئے کسی دُور افتادہ عنوان کے بجائے معمولی روزمرہ کے عنوانات پر لکھنے میں زیادہ گنجائش ہے۔ ان کے تخیل میں وسعت پیدا ہوئی اور وہ اپنی شاعرانہ نگاہ معمولی چیزوں پر بھی ہمدردی سے ڈالنے لگے۔

اس کیفیت کا بہترین نظارہ ہم کو سرور جہان آبادی کی نظموں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ سرور کی شاعری بیانیہ ہونے کے علاوہ دلی جذبات کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ملکی بہبود کا احساس انکی نظموں میں بدرجۂ اتم موجود ہے اور اس کے مجموعہ میں ہم کو زیادہ تعداد ایسی نظموں کی ملتی ہے جن میں قومی جذبات کی روشنی ہے "خاکِ وطن" کے عنوان سے جو نظم سرور نے لکھی ہے اس میں شاعر نے اپنا کلیجہ نکال کر کاغذ پر رکھدیا ہے۔ ذرا سنئے:۔

آہ اے خاکِ وطن اے دردمند بیقرار ۔۔۔ آہ اے شوریدہ قسمت اے پریشاں روزگار
اُڑ رہا تھا پرچم شوکت ترا افلاک پر ۔۔۔ سرنگوں ہے تیری عظمت سکنشاں اب خاک پر
جھلملا کر بجھ گئے سب تیرے ایواں کے چراغ ۔۔۔ ہیں جگر کے داغ اب تیرے شبستاں کے چراغ

اُڑ گیا نورِ سحر تاریکیٔ غم چھا گئی　　　نیرِ اقبال ڈوبا شامِ ماتم چھا گئی

اس نیچرل تصویر کشی اور جذبات نگاری حبِ وطن اور آزاد نویسی کے لئے ہم نادر کاکوروی کے احسانمند ہیں۔ مقدس سرزمین۔ مادرِ ہند شعاعِ امید میں ہم انہی جذبات کو نمایاں طریقہ سے عکس پذیر پاتے ہیں۔ شمع و پروانہ نادر کاکوروی کی ایک یادگار نظم ہے (افسوس ہے کہ اس یکتائے عصر کی جیسی کچھ قدر ہونی چاہیئے تھی نہیں ہوئی اور ہم اس کو جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے بھولتے جاتے ہیں) یہاں تک کہ نادر کی ندرت۔ سرور کا حبِ وطن اور منظر نگاری۔ حالی کا جذبۂ قومی۔ آزاد کی اردو پرستی سب آکر ایک شخص واحد میں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور اکبر کا نام اس تمہید سے ہماری زبان پر بے ساختہ آجاتا ہے۔ اکبر نے جو خاص رنگ اپنے جذبات و احساسات کو ظاہر کرنے اور مقبول بنانے کے لئے انتخاب کیا وہ قابلِ صد تحسین ہے۔

اقبال اس دورِ جدید کے بلند پایہ سخنور ہیں۔ اقبال کا انتخاب الفاظ قوتِ نظم۔ سادگی۔ جدت طرازی۔ شدتِ حس اور جذبات نگاری انھیں اپنے پیشروؤں اور معاصرین سے کسی قدر ممتاز کرتی ہے۔ اقبال محروم اور آسکین۔ اختر اور شوق قدوائی۔ شاد حیدر آبادی چکبست لکھنوی اور عزیز لکھنوی سے جو سلک مروارید مرتب ہوتی ہے۔ اُسی کے ایک درخشندہ گوہر جناب برق دہلوی ہیں۔ افسوس کہ اس مختصر مقدمہ میں ان تمام پیشروان و معاصرین برق دہلوی کے

کلام کا وضاحت کے ساتھ تذکرہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جیسا آئندہ ذکر آئے گا۔ جناب برق کی نظر اسی طرح وسیع اور ہمہ گیر، کلام میں وہی زور اور تاثیر ہے۔ وہ کسی ایک موضوع پر نہیں لکھتے بلکہ بھونرے کی طرح مختلف پھولوں کا رس لیتے ہیں۔ کبھی چاند۔ ستارے۔ دریا۔ صبح۔ شام ان کے دل کے جذبات کو متحرک کرتے ہیں اور وہ اپنے صحیح اور سچے جذبات صاف مؤثر اور پاکیزہ زبان میں ادا کرتے ہیں۔ کبھی بے ثباتیٔ دنیا انھیں بے چین کرتی ہے اور وہ اپنے خیالات شاعرانہ پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔ کبھی ہندو مذہب کی عظمت ان سے سادہ اور پُراثر انداز میں خراجِ تحسین وصول کرتی ہے۔ کبھی وہ مغربی تخیّل اور جذبات سے اپنے ادب کے دامن کو مالا مال کرنے کی فکر ترجموں میں کرتے ہیں۔ کبھی دَورِ ماضی کی برکتوں اور خوبیوں کو مقراضِ تجدید سے بچانے کی خواہش میں صدائے درد بلند کرتے ہیں۔ کبھی موجودہ دَور کی برائیوں سے برگشتہ ہو کر تحقیق و ترمیم کی صدائیں اپنے کلام میں دیتے ہیں۔ ان کی نظر بے حد وسیع۔ ان کی طبیعت دردمند اور دل احساسات سے لبریز ہے۔ ان کی مذہبی نظموں میں بھی کہیں تعصب، تنگ خیالی اور کوتاہ نظری کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

اس مجموعہ میں جناب برق نے پانچ طرح کی نظمیں شامل کی ہیں

۱:۔ نیچرل نظمیں جو طبعزاد ہیں

۲:۔ نظمیں جو دوسری زبان سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں۔

۳:۔ مذہبی نظمیں۔

۴:۔ نظمیں جن کا تعلق دورِ ماضی یا تاریخ سے ہے۔

۵:۔ نظمیں جن کا تعلق زمانۂ حال یا کسی اصلاحِ عمل سے ہے۔

نیچرل نظمیں: ان نظموں کی فہرست پھر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اول وہ نظمیں جن میں محض کسی کرشمۂ قدرت پر توجہ کی گئی ہے۔ دوسری وہ نظمیں جن میں شاعر نے اپنے جذبات کا اظہار کسی خاص عنوان سے کیا ہے۔ مثلاً "ہجومِ یاس" "صبحِ امید" "منی کا چراغ" "سبزۂ بیگانہ" "کارِ خیر" "دلِ درد آشنا" "سہرا" "دست" "راضی برضا"۔ صنفِ اول کی نظمیں بہ نسبت صنف دوم کے بہت زیادہ ہیں مثلاً "حسنِ فطرت" "ستارۂ صبح" "جلوۂ سحر" "کرمکِ شب تاب" "شفق" "بہارِ شفق" "بسنت رت" "تارے" "تاروں بھری رات" "ماہِ تاباں" "شبِ ماہتاب" "بہارِ بسنت" "برسات کی شام" "جوشِ بہار" "برسات اور مناظرِ کوہ" "عروسِ کہسار" "سرس کے پھول" "ٹیسو کے پھول" "قوسِ قزح" "چمپے کی کلیاں" وغیرہ۔

ترجمے: اس صنف میں "ادائے شکر" "قلزمِ فطرت" "بوئے خویش" "عروسِ مرگ" "ساعتِ سفر" "شبیہِ جفا" "روحِ فلسفہ" "شامتِ مرگ" "کشتۂ عشق" "مادرِ ناشاد کا خواب" "جنون" وغیرہ شامل ہیں۔

مذہبی نظمیں: اس ذیل میں "گنگا جی" "بانسری" "کرشن بھگوان" "پدمنی کا جوہر" "میرا بائی" "پریم کا تحفہ" "شکتی بان" "دسہرہ" "دیپ مالا" "بن باسیوں کی دلہن"

وطن میں آمد" "گردو نانک" "کرشن سدامان" "فلسفۂ گیتا" وغیرہ ہیں۔

نظمیں جن کا تعلق دورِ ماضی یا تاریخ سے ہے	مثلاً تاج" "ہندوستان جنت نشان" "اہل ہند" "تیغ ہندی" "راجکماری تنہا" "زیب النسا کی قبر" وغیرہ وغیرہ
نظمیں جنکا تعلق دورِ حال یا کسی اصلاحی نقطہ سے ہے	مثلاً "اچھوتوں سے نفرت فضول ہے" "بازارِ بیوہ" "یتیموں کی فریاد" "شاہیر نظم اسعد" وغیرہ

سب سے پہلے ہم نیچرل نظموں کی خصوصیات اور خوبیوں کا مختصر تذکرہ کریں گے۔

نیچرل اور مجموعی طور پر شاعری کو صحیح کسوٹی پر جانچنے لے لئے ہم کو دیکھنا ہوگا کہ آیا نظم میں

۱:۔ صفائی بندش اور انتخاب الفاظ تشبیہات و استعارات کیسا ہے

۲:۔ کیا شاعر نے حقیقت نگاری اور اسرار حیات کی آئینہ برداری کی ہے۔

۳:۔ کیا اسکا اندازِ بیان حشو و زوائد سے پاک ہے

۴:۔ کیا اس کی نظم آسان مترنم اور بے تکلف ہے۔

۵:۔ کیا نظم میں جوش بیان اور جذبات نگاری کی کافی روشنی موجود ہے۔

۶:۔ کیا جو کچھ کہا گیا ہے وہ محسوس بھی کیا گیا ہے اور دل کے احساسات دل کی زبان میں ادا ہوتے ہیں۔

۷:۔ کیا شاعر نے خود اپنے اور خاص اپنے جذبات ادا کئے ہیں یا دوسروں کے

سرمایہ کا رہینِ منت ہے۔ کیا اس کی نظر کافی نکتہ رس ہے۔

۸:۔ کیا مجموعی طور پر شاعر نے دلآویز۔ دلچسپ اور پُر کیف مجموعۂ نظم پیش کیا ہے یا محض الفاظ کا گورکھ دھندا مصنوعی طور پر تیار کیا ہے۔

میں نے جناب برقؔ کی نظموں کو اسی کسوٹی پر جانچا ہے اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کہ میں نے ہمیشہ ان کے کلام کو فصیح، بے تکلف اور پُر کیف پایا ہے۔ رہی زبان تو اسکا کہنا ہی کیا۔ جناب برقؔ کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے اور محاورات ہمیشہ ستھرے اور مکمل انداز سے نظم ہوئے ہیں چستیٔ بندش اور جذبۂ ادائے بیان آپ کا حصہ ہے۔

آخر میں جن ضروریاتِ شعر کا میں نے یہاں ذکر کیا ہے۔ ان کو کچھ عرصہ ہوا ایک نظم کا جامہ پہنایا تھا اور شاید قابلِ معافی ہو گا اگر میں اس نظم کے چند متعلقہ بند یہاں پیش کروں:۔

شعر کیا ہے اک احساسِ قوانینِ وجود　　دل کے جذبات کا اظہار بتائیدِ قیود
ذہن ہے دلِ شاعر بتِ فطرت معبود　　جلوہ پیرائے ازل کا ہے یہاں حسنِ نمود
جب نظر راز کے پردوں سے گزر جاتی ہے
دل کے آئینہ پہ تصویر اُتر آتی ہے

دل ہے شاعر کا اک منزلِ انوارِ جمال　　اور جولانگہِ دل وسعتِ میدانِ خیال
نغمہ زن ہوتا ہے جب مستِ سخن صاحبِ قال　　بزمِ فطرت میں ہر اک چیز کو آجاتا ہے حال

کوہ جھک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے
چشمے رک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے

وغیرہ وغیرہ (ملاحظہ ہو" روحِ رواں" صفحہ ۹۰)

اس کے بعد میں کوشش کروں گا کہ اس دعوے کی تائید جنابِ برق دہلوی کے کلام میں مثالوں کے ذریعہ سے کردں۔

"حسنِ فطرت" کے عنوان سے جو نظم جناب برق نے لکھی ہے اس کو پڑھئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی نظر کی توسیع کے لئے زمین و آسمان دونوں کم پڑتے ہیں۔ زمین کا ذرہ ذرہ آسمان کا ستارہ ستارہ۔ تمام صبح و شام کے مناظر اور ان کے انسان کے دل اور انسان کی روح سے تعلقات یہ سب شاعر کی نگاہوں میں ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کی نظر ان راز کے پردوں سے گزر کر خلاق جزو کل کا عکس لینے کی کوشش کر رہی ہے۔ شدتِ احساس الفاظ سے پھوٹی نکلتی ہے اور الفاظ جذبات کو کافی طور پر ادا کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

اک جلوہ گہ حسن ہے یہ عالم اسباب — نظارہ بداماں ہے یہی مہر جہاں تاب
ہے چادر مہتاب کہ اک نور کا سیلاب — ہر اختر تابندہ ہے رشکِ درِ نایاب

ہے وسعتِ دامانِ خلا حسن سے لبریز
آنکھیں ہوں تو ہیں ارض و سما حسن سے لبریز

معمورِ لطافت سے ہے دنیا سے نباتات ہر گل میں نئی بو ہے نیا رنگ نئی بات
ہر پیکرِ تصویر میں ہیں حسن کے ذرات نیرنگیِ جلوہ ہے اسی شے کی کرامات
ہر نقش دل آویز ہے ندرت کا مرقع
اعجازِ قلمکاریِ قدرت کا مرقع

پوری نظم کی تشریح کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ انہی دو بندوں کو دیکھئے۔ پہلے مصرع میں شاعر نے آئندہ تشریح کی کتنی اچھی تمہید کی ہے۔ عالم اسباب کہہ کر شاعر نے اپنے دائرہ تخیل میں ارض و سما۔ خلائے بالا۔ دامانِ فضا عالم نباتات، ستارے اور ماہتاب غرضکہ ذرہ سے لیکر آفتاب تک سب کچھ لے لیا اور کس قدر نیچرل طریقہ سے پہلے آسمان سے شروع کیا ہے اور آسمان پر بھی سب سے زیادہ منور اور سب سے زیادہ نمایاں ہستی کا ذکر سب سے پہلے کیا ہے۔ اس کے بعد ماہتاب کا ذکر ہے پھر اس کے بعد ستاروں کا۔ ان مستعد ہستیوں کے بعد زمین تک آتے آتے جو "دامانِ خلا" پیشِ نظر ہوتا ہے اس کا تذکرہ ہے اور کس قدر نفیس انداز میں "حسن سے لبریز" جیسے مختصر الفاظ سے اس کی پوری کیفیت بیان کردی گئی ہے۔ ٹیپ کے شعر کے دوسرے مصرع میں پوری قید عائد کردی گئی کہ یہ سب کچھ ہے لیکن اس کے لئے لازم ہے کہ انسان کی نگاہ بینا ہو ورنہ یہ سب ہوتے ہوتے بھی کچھ نہیں ہے۔ اب مختلف مصرعوں کی سجاوٹ ملاحظہ ہو: "جلوہ گہ حسن" کی تشریح میں ساری نظم صرف کی گئی ہے۔ "چادرِ مہتاب" کو نور کا سیلاب کہنا کس درجہ لطیف

تخیل ہے۔ پورے چاند کو اور اس کی روشنی کو عالم پر پھیلا ہوا خیال کیجیے اور پہاڑ اور دریا، کہسار، دنیائے نباتات سب پر چاندنی کو مسلط تصور کیجیے۔ پھر اس مصرع کی لطافت کو ملاحظہ کیجیے۔ ع

"ہے چادرِ مہتاب کہ اک نور کا سیلاب"

اللہ اکبر۔ چاندنی کا وہ محیط تسلط۔ وہ عالم نواز وسعت۔ وہ بہتات وہ صفائی وہ موج در موج روانی سب کچھ ایک مصرع میں۔ سیلاب کی مشابہت، چادرِ نور سے کس قدر پر لطف ہے۔ دیکھی ہوئی چیزوں کی تعریف کرتے کرتے شاعر کے دل نے محسوس کیا کہ جو چیزیں عام نگاہوں کو نظر نہیں آتیں اور جن کے لئے "دیدۂ بینا" کی ضرورت ہے ان کی حسین فطرت کا بیان بھی ضروری ہے۔ اب آسمان اور خلا کا ذکر ہو چکا اب زمین کا ذکر کرتے ہوئے سب سے زیادہ قابلِ دید چیز یقیناً دنیائے نباتات ہے" دنیائے نباتات کہہ کر پھر شاعر نے اپنی آغوشِ تخیل میں پہاڑ، جنگل، باغ، دشت و گلزار سب کچھ لے لیا اور ایک کسی خاص چیز کا ذکر نہیں بلکہ تمام و کمال دنیائے نباتات لطافت سے معمور ہے۔ اس لطافت کے تذکرے میں یہ بات بھی لطف سے خالی نہیں ہے کہ کہیں بھی یکرنگی تکرار یا تخلیقِ فضول کا جرم فطرت پر عائد نہیں کیا جا سکتا۔ علم نباتات کے ماہرین کیا بلکہ مبتدی بھی اس بات کو جانتے ہیں کہ چھوٹی سے چھوٹی پتی کے درخت میں بھی کوئی دو پتیاں ایک شکل و صورت کی نہیں ہوتیں۔

یہ فطرت کی آزاد، متنوع تخلیق کی ایک ادنیٰ کرشمہ کاری ہے۔ یہی بات جو سائنس کے الفاظ میں کسی دوسری طرح ادا ہوتی شاعر کی زبان سے اس طرح ادا ہوتی ہے:۔

ع۔ ہر گل میں نئی بُو ہے۔ نیا رنگ۔ نئی بات

"نئی بات" کے جامع الفاظ کی داد نہیں دی جا سکتی۔ مختلف صورت، مختلف ہیئت، مختلف بناؤ، مختلف ڈیل ڈول۔ ان سب باتوں کو شاعر نے دو لفظوں میں ادا کر دیا۔ یہ معجزۂ شاعری ہے۔

ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے سب کچھ لکھنے کے بعد پھر بھی شاعر محسوس کرتا ہے کہ انسان کی محدود و معذور نگاہ حسنِ قدرت کو نہ اچھی طرح دیکھ سکتی ہے نہ اس کی داد دے سکتی ہے اور بالآخر کہتا ہے کہ ؎

گنجینۂ اسرار ہے، معمورۂ ہستی
اک مطلعِ انوار ہے معمورۂ ہستی

ستارۂ صبح ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے صبح کا جھلملاتا ہوا ستارہ نہ دیکھا ہو اور اس کی کیفیات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ لیکن ان جذبات کو صحیح اور سچے طریقہ پر ادا کرنا جناب برق کا حصہ ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:۔

تپ الم سے ہوئی فق رنگِ روئے رنجیدہ
ہے مانند صورتِ یاقوتِ ناتراشیدہ
سحر کے جلوے میں مشرق میں نیم خوابیدہ
یہ ڈالتا ہے اُنہی پر نگاہِ دزدیدہ
پیام نور کے تڑکے سحر کا لایا ہے
نوید مقدم خورشید دینے آیا ہے

"جلوۂ سحر" کی نظم میں فرماتے ہیں :-

تاروں کی اب کہاں ہیں وہ جلوہ نمائیاں　　گُل ہیں چراغ ۔ مہر منوّر کے سامنے

چُھٹتی ہیں ماہتاب کے رُخ پر ہوائیاں　　کیا رنگ جم سکے شبِ خاور کے سامنے

انگڑائی لے کے سبزۂ خوابیدہ جاگ اٹھا　　اُترا خمار نرگسِ بدمست خواب کا

سورج مکھی کا اختر قسمت چمک گیا　　کھولی ہے آنکھ دیکھ کے منھ آفتاب کا

مصرعوں کا تناسب اور الفاظ کی نشست ملاحظہ طلب ہے۔ پہلے بند کا انداز طعنہ زنی کا ہے اور ہر مصرع میں وہی بجلی دوڑتی پھرتی ہے۔ "اب کہاں ہیں" میں کس قدر تراش ہے اور دوسرے مصرع میں گویا ستاروں کی تیرہ بختی پر مہر لگادی گئی ہے

"گُل ہیں چراغ مہر منوّر کے سامنے"

کسی بڑی اور محیط ہستی کے سامنے چھوٹی اور زود انجام ہستی کا چراغ جل نہیں سکتا۔ اسکو کس قدر پُر تاثیر اور زوردار الفاظ میں ادا کیا ہے کہ داد نہیں دی جاسکتی۔ "گُل ہیں چراغ" اگر یہ کہا جاتا کہ چراغ جل نہیں سکتا تو محاورہ ناکمل رہنے کے علاوہ خیال کو واقعہ کے مطابق نہ کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ رات کو ستارے نکلتے ہیں رات بھر روشن رہتے ہیں اور آفتاب نکلتے نکلتے ان کی روشنی ماند پڑجاتی ہے اور وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اسی خیال کو "گُل ہیں چراغ" سے ادا کیا گیا ہے۔

اس کے بعد "چھٹی ہیں ماہتاب کے رُخ پر ہوائیاں" بھی فصاحت کا ایک نایاب نمونہ ہے۔ تین مصرعوں میں جو کیفیت بیان کی گئی تھی اس کو کس خوشنما انداز سے مکمل کیا گیا ہے اور اس دعوے کے ساتھ گویا اس موضوع پر یہ آخری الفاظ ہیں۔ خوفِ تردید کا تو ذکر ہی کیا۔

"کیا رنگ جم سکے شبِ خاور کے سامنے"

کتنی سچی بات۔ بندش کس قدر چست۔ کتنی مختصر حقیقت سے کس قدر ہمدوش اور فطرت کی کتنی مکمل تصویر ہے۔

کرمکِ شب تاب ابتدا سے اردو میں جگنو شاعروں کا موضوعِ شعر رہ چکا ہے۔ قریب قریب نئے دور کے ہر شاعر نے جگنو پر نظم لکھ کر اپنا زورِ طبیعت دکھایا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال سے لے کر اور چھوٹے سے چھوٹے نیچرل لکھنے والے شاعر نے جگنو پر توجہ کی ہے۔ جنابِ برق نے بھی کرمکِ شب تاب کے عنوان سے اس فطرت کی حسین اور تعجب انگیز کرشمہ سازی پر نظم لکھی ہے۔ یہ نظم خاص طور سے قابلِ داد ہے۔ اس میں آپ الفاظ کے انتخاب میں ایک خاص بات پائیں گے۔ ہر مصرع میں الفاظ روحِ تشبیہ سے دست و بغل ہیں۔ اور تشبیہات کی تلاش میں تو جنابِ برق نے قلم توڑ دیئے ہیں۔ یہ نظم یکم جون ۱۹۱۰ء کو لکھی گئی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنابِ برق کو اس موضوع پر نظم لکھنے میں خاص دقتوں کا سامنا ہوا ہوگا۔ جنابِ برق جیسے کثیر المطالعہ سے یقیناً امید کی جا سکتی ہے کہ دیگر

مشاہیر کی نظمیں ان کی نگاہ سے گزر چکی ہوں گی۔ پھر دوسرے شاعروں کی تشبیہوں سے بچا کر تشبیہات تلاش کرنا ایک دشوار بات تھی۔ لیکن جناب برق کا قلم کس حد تک کامیاب ہوا ہے اس کی داد اہل نظر نظم پڑھ کر ہی دینگے۔ استعارات و تشبیہات کا ایک دریا ہے کہ اُمنڈتا چلا آتا ہے۔ خیالات میں کس قدر پختگی، زبان میں کتنی سلاست اور برجستگی ہے۔ تشبیہات کی لطافت کے ساتھ ساتھ حقیقت سے ہم آغوشی قابلِ داد ہے۔ چند کا تذکرہ کافی ہوگا۔

"خندۂ جامِ بلوریں ہے ہوا میں پرّاں"

جدتِ تشبیہ ملاحظہ ہو۔ جگنو کی چمک تھوڑی دیر رہ کر پھر ماند پڑ جاتی ہے۔ اس عارضی حُسن کو "خندہ" سے تشبیہ دینا کتنی نادر مثال ہے۔ پھر خندہ اگر کسی بد شکل ہستی کا ہو تو اسکا لطیف ہونا لازم نہیں ہے۔ اس لئے خندۂ جام کہا۔ اب خندۂ جام میں مشکل یہ تھی کہ "جام" کے لئے یہ کیا ضرور ہے کہ وہ لورا نگین بھی ہو، اس لئے خندۂ جام بلوریں کہا۔ سبحان اللہ۔ اب خندۂ جام بلوریں کی تشبیہ ناتمام ہوتی اگر ہوا میں پرّاں نہ کہا جاتا کیونکہ جگنو اُڑتا رہتا ہے اور اسی حالت میں زیادہ دلکش ہوتا ہے۔

اس سے بھی مطمئن نہ ہو کر آگے فرماتے ہیں "آتشِ حسن کی اُڑتی ہوئی چنگاری ہے" کتنی خوب بات کہی ہے۔

تجھ میں اے کرمکِ شب تاب جھلک نور کی ہے ٭ چشمکِ برق سے نسبت ہے مگر دُور کی ہے

جلوۂ حسن ترا پردے سے مانوس نہیں ٭ تو ہے وہ شمع جو شرمندۂ فانوس نہیں

ہوا اکثر شمع کو بجھا دیتی ہے لیکن کس لطف سے جناب برق نے اس کے متضاد خیال کو جگنو کی خصوصیت کی طرف اشارہ کرکے ادا کیا ہے :۔

"تو ہے وہ شمع کہ ہے موج ہوا پر روشن"

نسیم صبح ایک دلکش نظم ہے جس میں ایک بیجان چیز کو اکثر مقامات پر شخصیت کا رنگ دے کر بے حد کامیاب بنایا گیا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔ کس قدر پُر لطف۔ کتنا جذبہ آفریں اور معاملاتِ صحن گلشن کی کیسی سچی اور پاکیزہ تصویر ہے۔

تو چمن میں آئی عشق گل کا دم بھرتی ہوئی ؛ چھاؤں میں تاروں کی گن گن کر قدم دھرتی ہوئی

پہلے آہستہ چلی اٹکھیلیاں کرتی ہوئی ؛ پھر وہی برتیں ادائیں روز کی برتی ہوئی

گل کو چھیڑا طرۂ سنبل پریشاں کر دیا

غنچۂ نوخیز کا صد چاک داماں کر دیا

یہ بند محاکات کی بہترین مثال ہے۔ خط کشیدہ مقامات کی سادگی اور نسیم صبح کی چالوں سے ملتی جلتی حرکت قابل داد ہے۔ الفاظ نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں

"چھاؤں میں تاروں کی گن گن کر قدم دھرتی ہوئی"

الفاظ کو ذرا اٹک اٹک کر پڑھئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ڈر ڈر کر پاؤں رکھتا چلا آرہا ہے اور جیسے کوئی عاشق اپنے محبوب کی بارگاہِ ناز میں جاتے ہوئے ذرا جھجکتا ہے اسی لئے چونکہ نسیم صبح عشق گل کا دم بھرتی ہوئی آئی ہے بیباک طریقے سے جلد جلد

نہیں چلی آتی۔ بلکہ آہستہ آہستہ تاروں کی چھاؤں میں آتی ہے۔ جوں جوں صبح کے آثار زیادہ نمایاں ہوتے جاتے ہیں نسیم صبح بھی نسبتاً شوخ ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ بیباکی اور انتہائے شوخی کیا بلکہ دست درازی کی نوبت پہنچ جاتی ہے اور یہ عالم ہوتا ہے کہ

گل کو چھیڑا۔ طرۂ سنبل پریشاں کر دیا

جسکی انتہا بالآخر یہ ہوتی ہے کہ غنچۂ نوخیز کا صد چاک داماں کر دیا۔

صبح کی ہلکی روشنی میں نسیم سحر کا گلشن میں آنا اور اس کا اثر نوجوانان چمن و غنچہ و گل پر اس بند میں انتہائی دلآویز پیرایہ میں بیان ہوا ہے۔

آخری بند میں نسیم سحر کی زبان سے تمام گلشن کو پیام صبح اس طرح سنایا گیا ہے:-

لے چکے انگڑائیاں بس گیسوؤں والو اٹھو

نور کا تڑکا ہوا۔ اے شب کے متوالو! اٹھو

بسنت رت پر جناب برق نے کئی نظمیں لکھی ہیں جو بجائے خود نہایت دلآویز ہیں لیکن جنوری ۱۹۲۶ء کی تاریخ میں جو نظم لکھی ہے وہ بہت ہی خوب ہے۔ اس نظم میں موسم کی خوبیاں، اسکا وقت، دوسرے موسموں کے ساتھ اس موسم کا ربط اور مجموعی طور سے بسنت رت کی شان دلآویزی بیحد دلکش اور مؤثر پیرایہ میں بیان ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سماں پھر سروں سے کھیت کا ہو کہ زعفران گل کھلا ہوا ہو ۔ فضا میں کندنی کہ کا ہو سونا آنکھوں کو جل رہا ہو

کاش ہمارے اُردو شعراء اس قسم کے موضوع پر اپنی توجہ مبذول فرماتے تو ان کو فرہاد کے ساتھ کوہ کنی اور مجنوں کے ساتھ دشت نجد کی خاک چھاننے کی ضرورت نہ باقی رہتی۔ آگے فرماتے ہیں:-

کھلے ہیں ٹیسو کے پھول بن میں ضیا فگن ہے شفق زمیں پر

یا:- کنول کے پھولوں سے ہو رہے ہیں کہیں لبِ جو چراغ روشن

تشبیہ کی خوبی یہ ہے کہ فوراً ذہن نہ صرف موضوعِ مذکور کی جانب منتقل ہو جائے بلکہ وجہ تشبیہ بھی بطرزِ احسن ذہن میں آ جائے۔ کیا اس سے بہتر کوئی مثال مل سکتی ہے؟

تاروں پر لکھتے ہوئے اُن تمام معلوم حالات کا بھی ذکر کرتے ہیں جن کے لئے ہم علمِ نجوم کے رہینِ منت ہیں۔

کوئی ویران ہے کوئی معمور　　کوئی تاریک کوئی بقعۂ نور
زرد رُو کوئی صورتِ رنجور　　کوئی چشمک زنِ تجلّیِ طور
کوئی ثابت ہے کوئی سیّارہ
محوِ حیرت ہے چشمِ نظارہ

دوسری نظم جو "تاروں بھری رات" کے عنوان سے ہے اس میں بھی یہی خیال ظاہر کیا گیا ہے مگر کس قدر دلفریب پیرائے میں۔

تاریک کوئی، ماند کوئی، کوئی درخشاں　　ثابت کوئی، سیارہ کوئی، کوئی ہے رقصاں
سرگشتۂ گردش ہیں یہ دامانِ خلا میں　　لاکھوں کرۂ نور معلق ہیں ہوا میں

آگے چلکر شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

ہمدم یہی عندیدوں کے ہیں رنج و تعب میں
دل ان سے بہل جاتا ہے تنہائی شب میں

گردوں پہ عجب محفلِ انجم کا ہے عالم آتا ہے نظر دور سے اک مجمع برہم

"شمع کشتہ" کے عنوان سے ایک بیحد دلچسپ اور معرکہ آرا نظم ہے اور جناب برق کا کارنامہ شاعری ہے۔ بعض بعض بند تو لاجواب ہیں۔ مثلاً

پڑ گیا پھیکا فروغِ حسنِ لاثانی ترا ملگجا سا ہو گیا ملبوسِ نورانی ترا
چھا گیا محفل میں دودِ سوزِ پنہانی ترا ڈھل گیا سائے کی صورت نورِ پیشانی ترا

دستِ حسرت تیری حالت پر ملے گلگیر نے
رفتہ رفتہ ساتھ چھوڑا حسن کی تنویر نے

شمع کشتہ کو "بیاضِ صبح" پر "اندوہ کی تفسیر" کہنا ایک اچھوتا خیال ہے۔ واقعیت سے سرشار اور حقیقتِ حال سے ہمدوش۔ ع

تو بیاضِ صبح پر اندوہ کی تفسیر ہے

غرضکہ ایک نہیں جملہ نیچرل نظمیں جو اس مجموعہ میں ہیں اپنے دامن میں ایک طرف شاعری کے جواہر پارے لئے ہیں تو دوسری جانب زبان و محاورات کے صحیح کارنامے۔ ایک جانب جذباتِ فطری سے مالا مال ہیں تو دوسری طرف جدت و بلندی تخئیل کا دریا موجیں مار رہا ہے۔ ایک طرف فلسفہ حیات کی تشریح ہے تو دوسری

جانب اسرارِ حقیقت کی توضیح۔ ایک جانب قوتِ تخیل کی بہترین مثالیں ہیں تو دوسری جانب پاکیزہ تشبیہات و نادر استعارات کی عجیب و غریب تمثیلیں۔ کہیں جلوۂ فطرت نور بار ہے کہیں ہنگامۂ قدرت آشکار۔

جہاں تک دورِ جدید کے ارتقاءِ شاعری کا تعلق ہے۔ جناب برق کی نظمیں اردو ادب کا بہترین نمونہ ہیں۔

اب میں دوسری اصنافِ نظم کی طرف ناظرین کی توجہ دلانا چاہتا ہوں یعنی جن میں مصنف نے دیگر زبانوں سے اردو میں ترجمے کئے ہیں۔ ایسی تیرہ نظمیں ہیں جن میں سے بعض انگریزی، بعض ہندی، اور بعض فارسی نظموں کے ترجمے ہیں۔

ان میں سے بعض نظمیں دنیا کے بہترین شاعروں کی صف میں شہ نشین ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی گیتانجلی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے یہ نظمیں ترجمہ کا ترجمہ ہیں مگر پھر بھی آپ دیکھیں گے کہ کس قدر تازگی۔ جدت اور دلآویزی اصل نظموں کی سی قائم رکھی گئی ہے۔ سرور مرحوم اپنی قدرتِ ترجمہ کے لئے خاص شہرت رکھتے تھے لیکن ان نظموں میں جو کیفیت۔ ہم آہنگی اور جدت ہے وہ شاید سرور کے ہاں بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ خصوصاً دوسری نظم "نغمۂ فطرت" کے عنوان سے خاص طور پر قابلِ داد ہے:۔

جنبشِ لب ہی نزاکت سے اگر بار ہے تجھے
دل میں دیتا ہوں جگہ میں تری خاموشی کو

شوق میں تاروں بھری رات مجسم بن کر
ہمہ تن دیدۂ حسرت ہوں ہم آغوشی کو

جلوۂ صبح سے چمکیگا ستارا میرا — تیرگی رات کی جب اُور سی شرمائے گی
تیری آواز بھی پھر مثلِ شعاعِ خورشید — سات پردوں سے ضیا بن کے نکل آئیگی

ایک ایک حرف ترا سازِ ترنم بن کر — غیرتِ نغمۂ مرغانِ خوش الحاں ہوگا
گُل کھلائیگی نئے نغمہ نوازی تیری — غنچۂ خاطرِ ناشاد بھی خنداں ہوگا

پوری نظم پڑھئے کہیں بھی الفاظ کی وہ بے ربطی نظر نہ آئے گی جو ترجموں کا خاص نقص ہے۔ تمام خیالات پورے طور پر ادا ہوئے ہیں اور تمام الفاظ و محاورات اپنی فضاء شعری میں معلوم ہوتے ہیں۔ بندشیں درست اور ترکیبیں بالکل چست یہی ترجمہ کی معراج ہے

مذہبی نظمیں جناب برق دہلوی ہندو ہیں اور ہندو مذہب کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ تمامتر شعر ہے۔ بت و تبخانہ۔ برہمن۔ کرشن۔ گوپی۔ بنسی۔ رام سیتا مہابھارت اور ارجن سب ایک طرف تو جیتی جاگتی باحس ہستیاں معلوم ہوتی ہیں اور دوسری طرف وہ صرف خیالات۔ تصورات۔ نقوشِ فطرت اور ہمہ گیر قدرت کے رموز آشکار و پنہاں کے اشارات اور اسرارِ عالم کے آئینہ بردار ہیں اور نام ہیں محض تخیلی پیرایوں کے۔ مجھے قلق ہے کہ میں اپنے اس خیال کو یہاں اس مختصر سے مقدمہ میں زیادہ تفصیل و وضاحت کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش نہیں کرسکتا صرف اسقدر کہنا چاہتا ہوں کہ جناب برق کی مذہبی نظموں میں اس حسنِ تخیل کی

کما حقہ داد دی گئی ہے۔ اور ان کا قلم ہر مقام پر نہایت قابلِ داد طریقہ پر اس امر پر روشنی ڈالنے میں عہدہ برآ ہوا ہے۔ عصرِ جدید کے انگریزی شعرانے بھی اس بھید دلکش انداز بیان سے بہت کچھ اثر لیا ہے۔ اور اس موضوع پر چند فطرت نگار جادو رقم شعرانے بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے۔ مستشرقین سر ولیم جونس نے اندرا، سورج اندر دیوتا۔ لکشمی، نارائن سرسوتی۔ گنگا کا تذکرہ اپنے خاص پیرایہ میں نظم کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ زندۂ جاوید مہابھارت کی مشہور شخصیتوں پر بھی بہت کچھ زورِ طبیعت نظم میں صرف کیا ہے۔

اسی طرح جان لیڈن صاحب جن کی شہرت دنیائے شعر میں جہاں تک مشرقی معاملات کا تعلق ہے، کسی طرح سر ولیم جونس سے کم نہیں ہے، ایسے ہی موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اسی سلسلہ میں ہم بشپ ہیبر کا نام لئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان مشاہیر کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے چھوٹے شاعروں نے ہندوستان کی مشہور و معروف نظموں، رامائن اور مہابھارت کے اور ہندوستانی تاریخ کے چھوٹے چھوٹے معاملات اور اشخاص پر وقتاً فوقتاً نظمیں لکھی ہیں جیسے ہنری ڈروزیو اور کیپٹن ڈیوڈ لسٹر وغیرہ وغیرہ۔

ڈیوڈ لسٹر نے ہندوستانی "ستی" پر نظم لکھ کر اپنے کو زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

She mounts with dauntless mien, the funeral pile
Where lies her earthly Lord
Or wanders thoughtfully by Ganges shore

While the broad sun upon the slumbering wave
Its last faint flush of golden radiance gave
And tinged with tenderest hue some ruins hoar

اسی طرح Merideth Parker نے ہندوؤں کے مشہور و معروف قصہ کو کہ کس طرح سمندر کو متھنے سے پہلے پہلے امرت نکلا نظم کیا ہے۔

اس کے بعد اڈون ارنالڈ اور رڈیارڈ کپلنگ کا نمبر ایسے شعرا کی صف میں خاص طور پر ممتاز ہے۔ اڈون ارنالڈ نے جس قدر ہندوستانی قصص اور امور سے دلچسپی کا اظہار اپنی نظموں میں کیا ہے اُس کے لئے ہم ہندوستانی جسقدر شکر گذار ہوں کم ہے۔ نل دمینتی کا قصہ جس کو آج سے سو برس پہلے فیضی نے نظم کا جامہ پہنایا تھا اس بے نظیر شاعر اور عالی مرتبت فاضل جدید کی توجہ مبذول کرائے بغیر نہ رہا۔ جے دیو کے گیت گووند اور کالی داس کی بلند پایہ نظم رتو سنگھار پر اڈون ارنالڈ کی شاعری دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ بالمیک اور تلسی انگریزی زبان میں لکھ رہے ہیں۔ اس ذیل میں سر الفرڈ لائل۔ پروفیسر ڈرگو۔ اڈمنڈ گوس کے نام نامی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ جب مغرب کے شاعروں کے دلوں میں

جن کا تعلق ہندوستان سے صرف ضمنی طور پر تھا یا ہے، ہندوؤں کی قدیم کتابوں میں اس قدر دلچسپی کے سامان اور موضوعاتِ شعر مجتمع پائے تو کس قدر تعجب کی بات ہوتی۔ اگر ہندوستان کا ایک سپوت اور ہندو شاعر ہندوستان کے تاریخی اور مذہبی حالات اور واقعات و شخصیات کی جانب اپنی توجہ مبذول نہ کرتا کس قدر قدرتی بات ہے کہ جناب برق دہلوی کے کلام کے مجموعہ میں ہم ان موضوعاتِ سخن پر نظموں کی امید کریں۔ اس مجموعہ میں کرشن بھگوان، بانسری کرشن سداماں وغیرہ معرکہ آرا نظموں میں ہماری یہ آرزو پوری ہوتی ہے۔

ہندو مذہب کی یہ ایک بہت مشہور بات ہے کہ سری رامچندر جی جو تاجدار اودھ تھے اور قوم کے چھتری تھے انھوں نے ایک بھیلنی کے ہاتھ سے بیر کھائے اور اس کے یہاں ایک خاص مدت تک مہمان رہے۔ اس قصہ کو دیکھکر خواہ وہ حقیقت ہو یا خیالی یہ نکتہ عوام پر واضح ہو گیا ہے کہ جہاں دو دل پریم اور محبت سے متصف ہوتے ہیں، امتیازاتِ رسمی مثلاً ذات پات کی بندش یا چھوٹے بڑے کی تفریق کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دوسرا نتیجہ جو اس واقعہ سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ جذبِ صادق خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی ہستی میں کیوں نہ ہو اپنا اثر ایک نہ ایک دن ضرور دکھاتا ہے اور بڑے سے بڑے کو اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ اسی بات کو جناب برق کس قدر مؤثر اور جذبہ آفریں پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔

بھگوان نے اخلاص و مدارات کو دیکھا
وارفتۂ دیدار کے جذبات کو دیکھا

کچھ ذات کو دیکھا نہ کچھ اوقات کو دیکھا　　دیکھا تو فقط پریم کی سوغات کو دیکھا
ڈوبے ہوئے تھے بیر محبت کے جوش میں
خود پریم کے ساگر بھی ہوئے پریم کے بس میں

اسی طرح بن باسیوں کی وطن میں آمد- دسہرہ- بھرت ملاپ وغیرہ نظمیں ہیں- بھرت ملاپ کی نظم میں چند شعر پر بے اختیار واہ وا منھ سے نکلتی ہے ؎

حیاتِ تازہ ملی سُن کے مژدہ جاں بخش　　بھرت کی جان میں جان آگئی جو رام آئے
گلے لگانے کو یوں آئیں تینوں مائیں　　کہ جیسے پیاس بجھانے کو تشنہ کام آئے
نہ نکلی بات بھی پوری برائے پرسش حال　　لبوں تک آئے تو کچھ لفظِ ناتمام آئے

گرو نانک پر نظم لکھتے ہوئے کیا خوب کہا ہے ؎

جلوہ حُسنِ ازل سے دل ترا معمور تھا　　زنگِ نقشِ ماسوا اس آئینہ سے دور تھا
شاہدِ یکتائے عالم کا نظر میں نور تھا　　سر بسر کیفِ مئے توحید سے مخمور تھا
چشمِ عرفاں میں تری تھے کافر و دیندار ایک
جلوہ گر دیر و حرم میں تھا جمالِ یار ایک

فلسفہ گیتا اور کرشن سداماں وہ لاجواب نظمیں ہیں جن کا مختصر تذکرہ کر کے ان کی خوبی کم نہ کروں گا اہلِ ذوق کو دعوتِ نظر دیتا ہوں اور بس۔

اس کے بعد اُن نظموں کا نمبر آتا ہے جنکا تعلق دَورِ ماضی، تاریخ یا حُبِّ وطن سے ہے ایسی نظمیں نسبتاً کم ہیں اور افسوس کہ کم ہیں عظمتِ ماضی بڑی چیز ہے۔

قصۂ عظمتِ ماضی کو نہ مہمل سمجھو
قومیں جاگ اٹھتی ہیں اکثر انہی افسانوں سے

اس ذیل میں "ہندوستان جنت نشان" "اہل ہند" "تیغ ہندی" وغیرہ نظمیں قابلِ ملاحظہ ہیں جن میں حبِ وطن کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ "مہارانا پرتاب کی تلوار" کے عنوان سے ایک بے نظیر نظم لکھی ہے۔ عموماً قاعدہ ہے کہ جب کوئی تیغ چلانے والا کئی وار کرتا ہے تو کچھ تو ایک وار کرنے کے بعد مجروح کی کیفیتِ جسمانی سے قلبِ انسانی متاثر ہوتا ہے کچھ خود تلوار چلانے والے کی طاقت ہر وار پر کسی قدر کم ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلا وار جس قدر شاندار اور کاری پڑتا ہے آئندہ وار اس قدر اچھے نہیں ہوتے لیکن مہارانا پرتاب کو یہ فخر حاصل تھا کہ اگر سو مرتبہ ایک ہی ساتھ تیغ چلائیں تو پورے سو وار برابر کاٹ کرتے تھے۔ یہ بات اس نظم میں وضاحت کے ساتھ ایک دلچسپ قصہ کے پیرائے میں بیان کی گئی ہے جس سے واقعہ کی دلکشی میں قابلِ قدر اضافہ ہو گیا ہے۔

پوری نظم کی روانی اور برجستگی قابلِ داد ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

تھا دامنِ دشت خون سے تر
لاشیں نظر آئیں تین بے سر

ہیبت سے زمیں میں گڑ گئے پاؤں
سکتہ سا ہوا جکڑ گئے پاؤں

گم ہوش ہوئے یہ دم زدن میں
کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

پہرے پہ کھڑے تھے ہر طرف بھیل   شہ زور سیاہ رو۔ گراں ڈیل

گزری ہوئی واردات پوچھی   جس کی تھی کھٹک وہ بات پوچھی

غرضکہ تمام نظم ایسے ہی برجستہ اشعار کا مجموعہ ہے۔

کوئی ہندو ایسا نہیں جس کی آرزو یہ نہ ہو کہ آخر کار جب اِس دنیائے فانی سے روح کو نجات ابدی حاصل ہو تو اس کی مٹی گنگا کی نذر ہو۔

گنگا جی کے عنوان سے جناب برقؔ نے ایک بے عدیل اور آبدار نظم لکھی ہے جس میں رنگینیِ بیان اور ندرتِ تشبیہات کے علاوہ صحیح اور سچے ہندو جذبات کی ایک ہندو کی زبان سے ترجمانی کی گئی ہے اور آخر کار اپنی بہترین اور آخری آرزو کا پیش از وقت یوں اظہار فرماتے ہیں :-

لہروں میں تیری ملکر ہستی ہو پاک میری
اے کاش۔ یوں ٹھکانے لگجائے خاک میری

پانچواں اور اخیر حصہ ان نظموں کا ہے جن میں کچھ اصلاحی نقطۂ پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

کوئی انسان ایسا نہیں جسکو صحیح معنوں میں زندہ کہہ سکیں۔ اگر وہ اپنی قوم اور ملک کی بہبود کا دل سے طالب نہ ہو۔ چنانچہ جناب برقؔ کا دل بھی ایسے ہی جذباتِ ترمیم و اصلاح سے مالامال ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ موجودہ دَور کی ہندو

سوسائٹی کی سب سے زیادہ مہلک اور زہریلی دو خرابیاں ہیں۔ اول اچھوت ذاتوں کی ہستی اچھوت کی حیثیت سے۔ دوسرے بیوہ کی شادی نہ ہونا۔

حال میں ہندی کی ایک بے مثل اور قابلِ دید کتاب "ابلاؤں کا انصاف" کے نام سے چاند دیپ مالا سے شائع ہوئی ہے جس میں ہندو بیواؤں کی شادی نہ ہونے کے باعث ہندو دھرم اور سوسائٹی کی جو دلفگار حالت ہے اس کی صحیح اور مکمل تصویر بے حد دلچسپ پیرائے میں کھینچی گئی ہے۔ اس کتاب کو دیکھکر اپنی سوسائٹی پر کوئی ہندو بغیر درد و غم کے آنسو بہائے نہیں رہ سکتا۔ جناب برق بھی اسی جذبۂ دل آزار سے متاثر ہوئے اور "نالۂ بیوہ" کے عنوان سے ایک بے نظیر نظم لکھی ہے۔ ہائے کس قدر سچی پُرتاثیر اور کتنی دلکش بات ہے۔

ہجر میں ہوتا ہے تکیہ آرزوئے دید پر
صبر آئے مجھ سی بے قسمت کو کس امید پر

آگے چلکر کس درد انگیز انداز میں لکھتے ہیں:۔

شرم دامنگیر ہے دل بھر کے رو سکتی نہیں
آنسوؤں سے اپنے دل کے داغ دھو سکتی نہیں
بیکس و بے دست و پا ہوں جان کھو سکتی نہیں
باعثِ تسکیں کوئی تدبیر ہو سکتی نہیں
صدمۂ دردِ فراق و رنج سہنے کے لئے
میں کہاں سے لاؤں دل ناشاد رہنے کیلئے

"یتیموں کی فریاد" کی نظم میں ایک درد انگیز شعر ملاحظہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔

کنول سے ایک تیر نکلا ہے جو دل کے پار ہوا جاتا ہے ؎

غربت نصیب ہیں ہم خود اپنے ہی وطن میں
جل جائیں شاخ پر جو وہ پھول ہیں چمن میں

جی چاہتا ہے اور دل بے چین ہے کہ اس شعر کی داد دل کھول کر دوں اور اس کے مطالب معانی اور شعری خوبیاں دکھلاؤں لیکن مقدمہ پہلے ہی سے اسقدر طولانی ہوگیا ہے کہ اب آیندہ کچھ لکھنے کی ہمت نہیں پڑتی مجبوراً اپنی زبان پر مہر لگاتا ہوں اور اپنے رہوار قلم کو روکتا ہوں۔

"اچھوتوں سے نفرت فضول ہے" اس نظم میں جناب برق نے نہایت ہی مُدلّل طریقہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کے باشندے اور یہاں کی مٹی سے مخلوق سب ایک سے ہیں اور حد درجہ خود غرضی ہے کہ کوئی ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو اچھوت خیال کرے۔ واقعی ہندوستان کی بدبختی اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ یہاں خود ایک ہندوستانی دوسرے ہندوستانی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے۔ جب ہم خود اپنے بھائیوں سے ایسا برتاؤ کرتے ہیں تو غیر اقوام کے خلاف ایسی حرکتوں کے لیے کیا کہہ سکتے ہیں اور کس منہ سے کہہ سکتے ہیں۔ جناب برق نے کیا خوب کہا ہے :-

اس خاک کے ہیں پتلے بھارت سپوت ہیں سب
گر یہ اچھوت ہیں تو ہم بھی اچھوت ہیں سب

میں نے دانستہ گنتی کی چند نظموں پر تبصرہ کیا ہے تاکہ ناظرین کی تشنگیٔ ذوق مطالعہ کم نہ ہو جائے۔

رسم تنقید کے بموجب ضروری تھا کہ میں اس مقدمہ میں جناب برقؔ کے کلام کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کا بھی ذکر کرتا لیکن شاعر کے عیوب کے متعلق میرے خیالات میں معمولی تخیل کی بہ نسبت ترمیم ہے میں سمجھتا ہوں کہ اگر شعر دل پر اثر کرتا ہے اور صحیح معنوں میں شعر کہے جانے کا مستحق ہے تو چند سطحی خامیاں اگر ان میں ہوئیں بھی تو ان کو نظر انداز کرنا چاہیئے۔ اور مجھے یہ بات کہنے میں کوئی پس و پیش نہیں کہ میں نے نقد و نظر کے اسی اصول کے مطابق جناب برقؔ کے کلام کو مجموعی حیثیت سے جانچا ہے۔ البتہ میں یہ کہنے کے لئے تیار ہوں اور نہایت خلوص قلب اور کشادہ پیشانی سے تیار ہوں کہ جناب برقؔ انسان ہیں اور جب تک انسان انسان ہے اس سے خطائیں سرزد ہونا لازم ہیں۔ اس لئے اشعار کے اس بیش بہا خزانہ میں کھرے سکوں کے ساتھ اگر چند ملت سکے بھی نکل آئیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ +

دیباچہ

از

جناب منشی اصغر حسین صاحب[۱] اصغر گونڈوی (مصنف نشاطِ روح)

اُردو کے مشہور ادبی رسائل میں جنابِ برقؔ دہلوی کی نظمیں اکثر نظر سے گزرتی رہی ہیں۔ اس لئے ان کے شاعرانہ کمال و محاسن کا ایک مجمل نقشہ مدت سے ذہن میں محفوظ چلا آرہا ہے۔ کیا معلوم تھا کہ کسی دن اس پر باقاعدہ اظہارِ خیال کی ضرورت پیش آئے گی اور وہ بھی اس عجلت و غیر مطمئن حالت میں۔

کسی کتاب پر دیباچہ، مقدمہ، یا تبصرے کے نام سے کچھ بندھے ٹکے الفاظ کو چند اوراق میں پھیلا کر شعر و شاعر کی خوش آئند طور پر توضیح کردینا شاعروں کی روایتی واہ وا سے کم نہیں لیکن خیر سے اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ان بے کیف رسمیات کا کوئی درجہ ہو اور ہم پایۂ عنصری و خاقانی "یا رشکِ طالب و کلیم" ایسے فضولیات کے کچھ معنی سمجھے جائیں۔ اب تو وہ شاعر ہو یا متشاعر اُس کے کلام پر نقد و تبصرہ کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے کارناموں کی سائنٹفک تحلیل کر کے یہ بتایا جائے کہ اُس کی

ع۱:- آپ بھی ۱۹۳۶ء میں راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔

استعداد ذہنیت اور اس کے افکار و تخیل کی ترکیب نفسی کیا ہے۔

حالت یہ ہے کہ جناب برقؔ کی نظمیں طبع ہو چکی ہیں بلکہ اس کے اجزاء اس وقت میرے سامنے موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس عجلت میں اپنی معمولی مصروفیتوں کے ساتھ اس پر ایسی خاطر خواہ بحث جس کا یہ مجموعہ حقیقی طور پر مستحق ہے، ممکن نہیں۔ ان بے ربط سطروں اور اس تشنہ و نامکمل بیان کا ذمہ دار ایک دوست کا پاسِ خاطر ہے۔ اسی کے ساتھ میری بے بضاعتی کو بھی شامل کر لیجئے تو شاید میرے عذرات کی پذیرائی زیادہ آسان ہو جائے۔ بہر صورت جو کچھ عرض ہے اس کی حیثیت ایک سرسری مجمل و مبہم "جنبشِ لب" سے زیادہ نہیں

طرزِ جدید کی نظمیں | اُردو کی جدید نظمیں آزاد اور مولانا حالی کی مجتہدانہ کاوشوں کی رہینِ منت کہی جاتی ہیں لیکن یہ بزرگ مغربی علوم و فنون سے ذاتی طور پر باخبر نہ تھے۔ ان کی دُور رس نگاہوں نے صرف مستقبل اور آئندہ امکانات کا ایک خاکہ تیار کیا تھا جس میں اصل رنگ بھرنے کا شرف ان لوگوں کو حاصل ہوا جو خود مشرقی و مغربی شعر و ادب کے ماہر تھے۔ چنانچہ یہ کام مختلف عنوانوں سے انجام دیا گیا۔ کہیں تو کھلا کھلا ترجمہ تھا، کہیں مغربی خاکے میں مشرقی رنگ اور کبھی مغربی رنگ کو مشرقی خاکے میں بھرنے کی کوشش کی گئی۔

صاف صاف ترجمے کی مثالیں نادرؔ کاکوروی کے مجموعۂ نظم میں بکثرت مل سکتی ہیں مثلاً ٹامس مور کی نظم Oft in the stilly night کا ترجمہ

"اکثر شب تنہائی میں" Curfew will not ring to-night ترجمہ "گھنٹہ نہیں بجے گا" کے عنوان سے کیا گیا۔ اسی طرح ٹامس مور کی نظم The last rose of summer کا ترجمہ سرور جہان آبادی نے "موسم گرما کا آخری گلاب" اور مولوی ظفر علی خاں نے ٹینیسن کے The Brook کا ترجمہ "ندی" کے عنوان سے کیا۔ مولوی طباطبائی کی نظم "شام غریباں" گرے کے Elegy written in a Country Church yard کا کھلا ہوا ترجمہ ہے۔ شیکسپیر کے Mercy کا ترجمہ منشی تلوک چند محروم نے "رحم" اور بائرن کے The Ocean کا ترجمہ مولوی وحید الدین سلیم نے "سمندر" کے عنوان سے کیا۔ اس طرح اُردو نظم کا دامن طرح طرح کے گل بوٹوں سے مزین ہونے لگا۔ اکبر و اقبال کے یہاں اگرچہ صاف صاف ترجمے کی مثالیں بہت کم دستیاب ہو سکتی ہیں لیکن اُردو نظم کو مغربی تخیل اور مغربی انداز بیان سے مالامال بنانے کی سعی بیک نظر معلوم ہو سکتی ہے۔ اکبر مرحوم کی نظم آپ لڈ ورسا ؤدی کی نظم کا چربہ ہے۔ اقبال کا مصرع

ع جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور۔

گرے کے The path of glory leads but to the grave

اور ع تو بھی رولے خاک دل داغ کو روتا ہوں میں شیلی کے Wake melonchaly mother wake and weep کا بدلا ہوا قالب ہے۔ اسی طرح پھر

نوحۂ داغ میں لکھتے ہیں ؎ اقبال

بُلبل دلّی نے باندھا اُس چمن میں آشیاں
ہمنوا ہیں سب عنادل باغ ہستی کے جہاں

یہ شیلے کے For he is gone where all things wise and fair des-cend .... کا خوبصورت پرتوِ خیال ہے۔

یہی وہ مساعیٔ جمیلہ ہیں جن سے اُردو نظموں کے قدیم فرسودہ قالب میں ایک تازہ جان پیدا ہوئی اور شاعری کا دامن تنوعات کے اعتبار سے وسیع تر ہونے لگا لیکن بعض قدیم خیال کے بزرگ جن کے دماغوں میں بیلے چنبیلی کی خوشبو بسی ہوئی ہے اور وہ انگلش ردز اور لونڈر کے نام ہی سے جس طرح سرکہ جبیں ہو جاتے ہیں، اسی طرح یہ جدید قسم کی نظمیں بھی فرسودہ مذاق شعراء کے حلقوں میں ناپسندگی گئیں۔ خیر ایسے لوگوں کا تو ذکر ہی فضول ہے جن کے نزدیک رشکؔ و ناسخؔ کا مصیبت انگیز کلام اُردو شاعری پر آخری لفظ ہے۔ ہمارے نہایت سنجیدہ اور خوش مذاق طبقے کو بھی یہ اندیشہ ہو چلا کہ شعر و ادب پر بھی اگر مغرب کا اسی طرح غلبہ و تسلط رہا تو کسی دن مشرق کی تمام خصوصیات یکسر کالعدم و نسیاً منسیا ہو جائیں گی اس میں شک نہیں کہ یہ مسئلہ ایک سنجیدہ غور و بحث کا محتاج ہے۔ ایک طرف فطرت کا یہ زبردست قانون ہے کہ ہر شعبۂ حیات میں متمدن و ترقی یافتہ اقوام کے آثار و پرتو کو قبول کیا جائے انتہا یہ کہ جب ہم مغرب کی مخالفت میں بھی آواز

بلند کرتے ہیں تو ہمارے عتاب و برافروختگی کی لے بھی مغرب ہی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نکلتی ہے۔ دوسری طرف جس طرح یہ امر ناگزیر ہے، اسی طرح کپلنگ کا یہ مقولہ بھی مقتضائے فطرت ہے کہ "مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق اور دونوں کے سر رشتے باہم نہیں مل سکتے"۔ ان متضاد حالات کا قدرتی تقاضہ یہ ہے کہ مشرق مغرب کا مزاج آشنا ہو کر اپنی خصوصیات کو قائم رکھے۔ تعلق دہم رنگی کے معنی ایک دوسرے میں محو و مدغم ہونے کے نہیں ہیں بلکہ اسکا مفہوم فراخ دلی و رواداری ہے۔ تہذیب و تمدن کی طرح شعر و ادب بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ مشرقی و مغربی شعر و ادب کی مخالطتِ باہمی کا مطلب بھی وسعتِ مذاق تازگیِ خیال اور شانِ ہمہ گیری ہے۔ جسکی ابتدا اگرچہ تمام تر ترجمے اور اخذ و اقتباس کی رہینِ منت ہوتی ہے لیکن اس عمل کا یہ ارتقائی نتیجہ ہے کہ ملکی و قومی خصوصیات کے ساتھ شعر و ادب میں بھی نئی نئی کیفیت رونما ہو جائیں۔

انسانی دماغ کو خواہ نفسیاتی حیثیت سے تحلیل کیجئے یا نفسِ خیال کی تشریح و تنقید، نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے۔ جناب برق کی تصویر کے نیچے یہ شعر درج ہے ؎

کھل کے مرجھا بھی گیا آنکھ کسی کی نہ پڑی
میں چمن زارِ جہاں میں گلِ صحرائی تھا

اس شعر میں بظاہر کوئی ایسی بات نہیں نظر آتی جو مشرقی نہ ہو اور جو ہمارے یہاں کے شعرا کی دسترس سے باہر ہو پھر بھی اس کی دلآویزی و جدت نہایت حیرت انگیز ہے

Full many afl ower is born to blush unseen, — کے گرے سے کے

And waste its sweetness in the desert air

کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ معلوم ہوگا کہ جناب برقؔ کا دماغ اس سے ناآشنائے محض نہیں ہے مگر ان کا شعر اس کی پوری پوری آواز بازگشت بھی نہیں جس طرح آفتاب کی ہلکی اور تیز شعاعیں باغ و چمن کو طرح طرح سے رنگین کرتی رہتی ہیں اسی طرح وسعتِ مذاق شاعر کے دماغی تخیل کو نیم شعوری حالت میں گوناگوں کیفیتوں سے لبریز کرتی رہتی ہے۔ مغربی تخیل کا انعکاس مذکورہ شعر پر اس درجہ ہلکا اور لطیف ہے کہ تبصرہ نگار تو ایک طرف شاید خود شاعر کو اس کا احساس دشوار ہوگیا ہو

جناب برقؔ کی نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ جس طرح انکے عنوانات بظاہر مشرقی اور ہندوستانی نظر آتے ہیں اسی طرح ان کی روح بھی خالصاً مشرقی و ہندوستانی ہے۔ مغربی شعر و ادب کی واقفیت سے صرف اسمیں وسعتِ مذاق کا اضافہ ہوا ہے، یہ نہیں کہ ان کی اصلیت و ماہیت تبدیل ہوکر مغربیت کی بسیط فضا میں گم ہوگئی ہو اور شاید یہی وہ کامیابی ہے جو کسی بڑے سے بڑے جدید تعلیم یافتہ شاعر کو نصیب ہوسکتی ہے۔

نیچرل اور تخلیقی شاعری

جدید نظموں کی وہ ایک امتیازی خصوصیت جو مغرب سے مستعار لی گئی ہے، وہ مناظرِ قدرت کی مصوّری ہے۔ اسے عام طور پر نیچرل شاعری اور زیادہ شائستہ لوگ منظریہ

شاعری کہنے لگے۔ اس میں مناظر و مظاہر کی ہیئت و صورت کی عکاسی و مصوری ضرور کی گئی لیکن اکثر اس کی اصلی روح سے بے پروائی و غفلت برتی گئی۔ حالانکہ شاعر صرف مصور اور تصویر کش نہیں ہے بلکہ وہ صورت گر اور خالق بھی ہے۔ اسکے یہاں بظاہر تصویریں نظر آتی ہیں مگر وہ تصویریں نہیں ہیں بلکہ اس کی جاندار مخلوق ہیں وہ جسم و پیکر کا بیجان مجسمہ نہیں بلکہ وہ زندہ ہستیاں ہیں جو لفظ و بیان کے لباس میں مسلسل اعیان و مظاہر اور ہزارہا صورت و معنی کے نقشے ذہن کے سامنے پیش کرتی رہتی ہیں۔

جناب برقؔ کی وہ نظمیں جن میں مناظر کے یہ نقشے پیش کئے گئے ہیں وہ "حسن فطرت"، "جوشِ بہار"، "جلوۂ بسنت"، "نسیم صبح" اور "مٹی کا چراغ" وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ان نظموں کو غائر نظر سے دیکھئے تو "نیچرل شاعری" اور "تخلیقی شاعری" کا یہ نازک اور باریک فرق صاف صاف نمایاں ہو جائے گا۔ مثلاً "حسن فطرت" کے عنوان سے جو نظم ہے اس میں ذیل کے مصرعوں پر نظر فرمائیے:-

ع:- ہے چادرِ مہتاب کہ اک نور کا سیلاب

ع:- معمور لطافت سے ہے دنیائے نباتات

ع:- ہر پیکرِ تصویر میں ہیں حسن کے ذرات

ع:- دامانِ فضا حسن کے جلووں سے ہے معمور

ان مصرعوں میں صرف مناظر کی شکل ہی نہیں بلکہ ان کی روح بھی موجود ہے اس

ہیں صرف مظاہر و مناظر کے چھاپے پر گل بوٹے نہیں بنائے گئے ہیں بلکہ صحیح آرٹسٹ کی طرح ایک زندہ اور جاندار ہستی تیار کر کے تخلیقی شان کی بھی نمائش کی گئی ہے۔

جناب برق کی ان نظموں میں فنی (آرٹسٹک) حیثیت سے آثارِ زندگی اور لطافتِ خیال کے علاوہ ایک بلند حکیمانہ نظر کی جھلک بھی صاف صاف نمایاں ہے۔ مثلاً :-

جو شعلۂ بیتاب میں سامانِ تپش ہے
روئے گلِ خنداں میں وہی جذب کشش ہے

لیکن صحیح شاعری کے زاویہ نگاہ سے حکمت و فلسفہ کے کتنے ہی گہرے اور غامض مسائل کیوں نہوں جب تک ان میں درد و نیاز، سوز و تپش کی برقی حرارت بھی کارفرما نہ ہو اس کی حیثیت ایک جسدِ بے روح سے زیادہ نہیں۔

مشرق کی عظیم الشان روایات اس کی شاہد ہیں کہ اس نے ہوائی جہازوں کی تشکیل کے مقابلہ میں انسانیت کی تکمیل و تہذیب پر زیادہ زور دیا جوش و خروش تپش و نیاز صرف شعر و ادب ہی کی جان نہیں بلکہ خود انسانیت کی جان اور اسکا اصلی غازۂ جمال ہیں۔ مشرق نے اسکی حصولیابی کے لئے اعلیٰ اور مقدس ہستیوں کو آئیڈیل قرار دیا اور انسانی روح کو انھی

آئیڈیل کی جانب گرمِ عناں کرکے اسے جوشِ تپش سے لبریز کردیا۔ اسی جوشِ تپش کا نام اس کی زبان میں "مذہبیت" ہے۔

جناب برق کی نظم "بن باسیوں کی وطن میں آمد" اگرچہ بظاہر واقعہ نگاری و منظریہ شاعری کا نمونہ ہے مگر اس کے پردے میں اسی دردو نیاز کی ہلکی ہلکی کیفیت کام کررہی ہے۔

"میراں بائی" کی نظم میں یہ کیفیت اور زیادہ متلاطم ہوکر سوز و درد، جوش و خروش، بھگتی اور نیازمندی کا آتش کدہ بن گئی ہے۔

مختصر یہ کہ جناب برق کی شاعری اس طرح کے حریفانہ اور بازاری جذبہ کا نتیجہ نہیں ہے جس سے بعض حلقوں میں زبان و محاورے کی کج بحثیوں اور فن داستاوانہ فن کی بلند آہنگیوں کے ساتھ ایک مردہ دبیکار سرمایۂ پندار و تجزیہ تیار ہوگیا ہے اور جو ہماری شاعری کے لئے یکسر ادبار و مصیبت کی چیز ہے، بلکہ ان کی فطرت کی رسائی حقیقی شعریت کی اس فضائے لطیف تک معلوم ہوتی ہے جو کیف و سرور اور جوش و انبساط کی معنوی لذتوں سے معمور و لبریز ہے۔

"یادش بخیر" دلی نے اپنے عہد ماضی میں کیا کیا بلند مرتبت ہستیاں نثار کی تھیں۔ آج ایک مدت کے بعد اس کی خاک سے پھر ایک شرارہ بلند ہوکر ستارے کی طرح اُفق شاعری پر نمودار ہوا ہے۔ امید ہے

کہ اربابِ ذوق اس کا کافی و مناسب جوش و خروش سے خیر مقدم کریں گے ؎

کسے کہ محرمِ بادِ صبا است می داند
کہ باوجودِ خزاں بوئے یاسمن باقی ست

اصغرؔ (مصنف نشاطِ روح)
الہ آباد، ۲۴ مئی سنہ ۱۹۲۹ء

حرفِ ناتمام

اُستاد کے آنسو

شاعرِ فطرت، طبعزادِ تخیل کے بہترین قلم کار یعنی عزیزی منشی مہاراج بہادر برقؔ جنھیں افتخار الشعرا بھی پکارا جاتا ہے، افسوس! آج ہم میں نہیں۔ آج اُن کا یومِ یادگار منایا جارہا ہے۔ کاش میری صحت مجھے اجازت دیتی کہ میں بھی آپ سب حضرات کے ساتھ اس یادگاری جلسے میں شریک ہوسکتا۔

موت نے اردو ادب سے ایک مخلص، سرگرم اور سچّی محبّت کرنے والا شیدائی چھین لیا، جسکی تلافی تقریباً ناممکن ہے۔

صاحبِ فراش

آغا شاعر قزلباش عفی عنہ

مورخہ ۱۲ فروری سنہ ۱۹۴۱ء

برقؔ مرحوم کا مرتبۂ سخن

حضرت علاّمہ کیفیؔ دہلوی کی نظر میں

وہ ایک دُنیا تھی، بدلی ہوئی۔ وہ ایک فضا تھی انقلاب کے چکّر میں، وہ ایک ہوا تھی مخالفت پر تُلی ہوئی۔ نہ وہ لال قلعہ، لال قلعہ تھا، نہ وہ دلّی دلّی۔ ایک عبوری دَور تھا جو ختم ہو کر ایک انقلابِ عظیم کو جگہ دینے کو تھا، رُت بدل گئی تھی اور باغ کی ہوا پلٹ گئی تھی۔ کچھ پژمردگی پذیر پھول آندھیاں اِدھر اُدھر لے اُڑی تھیں جن سے باغ کا نام چل رہا تھا۔

یہ حال تھا جب برقؔ اس جہان میں آئے جس گھر میں اُنھوں نے آنکھیں کھولیں، خاص ادبی مذاق رکھتا تھا۔ اگرچہ وہ لوگ پرانے دلّی والے نہ تھے لیکن کئی پشتوں سے دلّی میں آئے ہوئے تھے اور ہر اعتبار سے دلّی والے بن گئے تھے۔

برقؔ کی تعلیم کچھ گھر پر اور کچھ نئے طرز کے مدرسوں میں ہوئی۔ وہ فطرت سے طبع دقّاد لے کر آئے تھے، اُردو اور فارسی سے خاص ذوق تھا، مگر انگریزی سے

بے پروا تھے۔ چنانچہ فارسی کا اعلیٰ ترین امتحان منشی فاضل، اور بی، اے کی سندیں حاصل کیں۔ ان کی ملازمت اگرچہ ایک شعریت سے بالکل بیگانہ محکمہ (یعنی حسابات) میں ہوئی اور آخردم تک رہی، مگر مطالعہ اور سخن سنجی ہمیشہ ان کے دم کے ساتھی رہے۔

حالی کبھی کی غزل چھوڑ چکے تھے۔ داغ برسوں سے وطن سے دُور تھے شہر میں رہے سہے ادیب، راسخ، ارشد، بیخود، سائل، شیدا، ساحر، مائل اور لالہ سری رام جیسی چند ہستیاں رہ گئی تھیں جو اس کی ادبی حیثیت کو سنبھالے ہوئے تھیں مولوی سیف الحق ادیب اور مرزا ارشد اگرچہ آزاد کی نئی تحریک کے زیر اثر کبھی کبھی نظمیں لکھ لیتے تھے۔ حالی کی سخن سرائی، علی گڑھ کی تحریک میں محدود ہوگئی تھی، شہر میں مشاعرے کبھی بند نہیں ہوئے لیکن عام پسند صنفِ شعر صرف غزل جیسی پہلے تھی ویسی ہی رہی۔ چنانچہ برق کی شاعری بھی غزل سے شروع ہوئی اور جب غزل کے سوا ان کے دوسرے کلام پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی نظموں اور منظری کلام میں بھی غزل کا رنگ اور اسلوب غالب پایا جاتا ہے۔ اور اس میں ان کے فن کا کمال مضمر ہے۔ وہ ہر موضوعِ سخن میں رنگینی ادا بھر دیتے ہیں۔ تخیل بلند ہے مگر باد رہوا نہیں۔ ان کے تخیل کے پاؤں زمین پر رہتے ہیں، اکھڑتے نہیں۔ ان کا قلم اور جذبات دونوں نظم اور انضباط کے ہم آہنگ ہیں۔

برقؔ کے کلام میں ہر قسم کے موضوع ملتے ہیں داخلی بھی اور خارجی بھی۔ وہ تخیل پردازی اور منظر نگاری دونوں میں برق تھے۔ ان کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان تھی۔ شروع میں وہ آغا شاعر مرحوم سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ لیکن یہ تعلق بہت دیر تک قائم نہ رہا کیونکہ اُستاد اور شاگرد کی طبیعتوں کی افتاد مختلف واقع ہوئی تھی۔ پھر بھی برقؔ ہمیشہ اُستاد کی خدمت اور ادب کرتے رہے، یہ بات اس زمانے میں کم دیکھی جاتی ہے۔

برقؔ نے افسوس کہ اچھی عمر نہ پائی۔ مکروہات دنیا کا بھی شکار رہے مگر ادب میں ان کو جو دلچسپی تھی برابر قائم رہی۔ اس تھوڑی عمر میں انھوں نے بہت کچھ کہا۔ ایک ضخیم دیوان غزلوں کا اور ایک نظموں کا ابھی تک طباعت کی روشنی کا منتظر ہے۔ ایک مجموعہ نظموں کا "مطلع انوار" کے نام سے ۱۹۲۹ء میں ان کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا۔ اور ایک چھوٹا مجموعہ "کرشن درپن" بھی وہ خود ہی شائع کر گئے تھے، باقی سب کلام ان کے وارثوں کی کفالت میں ہے۔

طالبؔ صاحب سب کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بڑی تلاش اور کاوش سے یہ مجموعہ فراہم کیا۔ جو اس وقت ہمارے سامنے ہے، اس مجموعہ کی اکثر نظمیں خالص ہندوانی موضوعوں پر ہیں۔ ان میں فنیت کا یہ کمال ہے کہ فضا کہیں اوپری نہیں، ہر کہیں پس منظر سے ہم آہنگ ہے۔

اُردو زبان کے لوچ اور جاذبیت کا راز برق پر کھلا تھا۔ اور انھوں نے اس سے خوب استفادہ کیا۔ قومی اور وطنی روایات کی بھی ان کے ہاں بہتات ہے۔ اور لُطف یہ ہے کہ زبان میں کہیں بے ربطی یا انوکھا پن نہیں آنے پاتا جو کچھ انھوں نے شاعر کی شان میں کہا خود اُن پر عائد کیا جاسکتا ہے۔

پردہ بردارِ رخِ شاہدِ فطرت ہے یہی
مظہرِ جلوۂ انوارِ حقیقت ہے یہی
رہبرِ منزلِ عرفان و طریقت ہے یہی
ساقیِ کیف فروشِ مئے وحدت ہے یہی

اس کے وجد آفریں نغموں سے جہاں وجد میں ہے
رقص میں قلب تپاں، روح رواں وجد میں ہے

حسنِ معنی کا پرستار یہ مستانہ ہے
ہوش کی بات جو کہتا ہے وہ دیوانہ ہے
قیدِ تفریق و تعین سے یہ بیگانہ ہے
دَیر بھی اس کی نگاہوں میں صنم خانہ ہے

رندِ مشرب ہے ہمہ اوست کے مےخانے کا
جرعہ کش ہے یہ مئے نور کے پیمانے کا

مجھے ان کے ابتدائی زمانے سے ان کے دیکھنے کا موقع ملا۔ صلاحیت مگر طراری کے ساتھ، ذوقِ سخن کلاسیکل مگر نو آئینی کے ساتھ۔ بڑوں کا ادب مگر خودداری کے ساتھ۔ یہ ان کے مزاج کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ طبیعت بعض باتوں میں حساس تھی۔ اسی وجہ سے مکروہاتِ حیات کا اثر ان پر بہت ہوتا تھا اور آخری زمانے میں محزونیت کا دُھندلا رنگ ان کے کلام میں نمایاں ہوگیا تھا دیکھیے :۔

نہ اب وہ خندۂ بیسم نہ اب وہ دل، نہ دماغ
نہ اشتیاقِ مسرت نہ ذوقِ دَورِ ایاغ
تفکرات سے دم بھر نہیں نصیب فراغ
دیئے ہیں گردشِ دوراں نے برقؔ داغ پہ داغ

بسنت پر بہت شگفتہ اور جوشیلی نظم ہے۔ مگر مقطع میں سچا داخلی رنگ پھوٹ نکلا ہے۔

برقؔ اور فصلِ گل میں بھڑکتے ہیں داغِ دل
میرے لئے تو باعثِ حرماں بسنت ہے

اس عہد کے کلام سے قطع نظر ان کے ہاں ولولے اور بشاشت کی کمی نہیں۔ اس کے نمونے زیادہ تر "مطلع انوار" میں ملتے ہیں اور اسے ہی برقؔ کا شاہکار سمجھنا چاہیئے۔ شہر میں نظم گوئی کا چرچا انہیں کے دم سے تازہ ہوا اور عام لوگوں کے مذاق نے غزل کے سوا اور اصنافِ سخن خاصکر قومی اور وطنی رنگ کی نظموں کا اثر لینا شروع کیا۔

برقؔ مرحوم سے ہم کو بڑی امیدیں تھیں۔ ان کی شاعری کا درخت ابھی پھولا تھا۔ اس کے پھولوں کی خوشبو دماغوں کو تازگی بخشنے لگی تھی۔ اس کے پھلنے کا انتظار تھا کہ موت کی بجلی نے اسے ختم کر دیا۔ اس کا افسوس اور غم تمام ادبی دنیا کو ہے اور مدتوں رہے گا۔

منشی مہاراج بہادر برق کا کلام

(از رشحۂ قلم ساغر مئے وحدت، جامع علوم وفنون، عالیجناب
خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی، خواہر زادہ حضرت سلطان
نظام الدین اولیا محبوب الٰہی)

دہلی کے قدیمی رہنے والے منشی مہاراج بہادر برق میرے ملنے والوں میں تھے میانہ قد، گورا رنگ، کتابی چہرہ، سنجیدہ بات چیت، آنکھوں میں موہنی، وہ فطری شاعر تھے، اور خاص درجہ شاعری میں رکھتے تھے۔ شروع شروع میں انکی نظمیں رسالوں میں چھپیں تو دہلی کے حلقۂ شعرا میں چرچا ہوا اور نظریں انکی طرف اُٹھنے لگیں۔ برق صاحب مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کے ہاں بھی ان کے احباب کی مجلس میں جایا کرتے تھے۔ ڈاک خانہ کے حسابی محکمے میں ملازم تھے لیکن اس نوکری کے باوجود وہ ہر موقعہ کو پہچان لیتے اور نظم میں اسکی نسبت خیالات ظاہر کر دیتے تھے۔ ان کو اپنے شہر سے بہت محبت تھی اور ان کے کلام میں بھی، اور بات چیت میں بھی اس محبت کا اثر پایا جاتا تھا۔

برق صاحب ڈھلتے ہوئے شباب کے عالم میں دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ ایک بجلی تھی چمکی اور چھپ گئی۔ ان کے کلام کی خوبیاں تو وہی لوگ سمجھ سکتے

ہیں جو شاعر ہیں یا شعر کو سمجھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ میں ان دونوں نعمتوں سے محروم ہوں، مجھے تو برق صاحب سے اور اُن کے کلام سے اس لئے تعلق تھا کہ وہ میرے دلّی شہر کے ہیں اور ان کے کلام میں بہت اونچے خیالات ہوتے ہیں۔

اب مجھے یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ برق صاحب کے کلام کا دوسرا مجموعہ شائع ہونے والا ہے۔ اس کو دیکھکر ہر شخص اندازہ کرسکے گا کہ برق کتنے اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات کے شاعر تھے اور انھوں نے اپنی شاعری سے اور شاعری کی شستہ اور برگزیدہ اُردو زبان سے اس شہرت کو غلط ثابت کردیا تھا کہ دہلی کے ہندو اُردو زبان کو اپنی زبان نہیں سمجھتے

اگرچہ برق صاحب آج ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کا یہ کلام ہمیشہ ان کی ہستی کو ہم میں قائم و برقرار رکھے گا۔

تحریر مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۷۱ء

برقِ جہندہ

(از قلم حقیقت نگار ڈاکٹر موہن سنگھ صاحب دیوانہ۔ ایم اے پی۔ ایچ ڈی۔ ڈی لٹ
(پنجاب یونیورسٹی)

برق سے میری ملاقات شمبھوناتھ چوپڑہ مستؔ نے کرائی تھی۔ برق مجھے اپنے دولت کدے پہ لے گئے۔ کرشن درپن عنایت فرمایا۔ بڑے تپاک اور خلوص سے گھنٹے بھر سے زیادہ گفت گو کرتے رہے۔ ذکی الحس ہندو ادیبوں میں ایک ہی موضوع گفتگو ہوا کرتا ہے اپنوں اور غیروں کی ناقدر شناسی کا گلہ۔ میں ان دنوں اپنے مقالہ جدید اردو شاعری کی فکر میں تھا۔ برق سے مجھے دوسرے معاصرین کے رتبۂ ادب سے متعلق کافی معلومات بہم ہوئیں۔ خود برق کی شخصیت اور طرزِ ادب کے مطالعہ کا کافی مواد ملا۔ بڑا منکسار نوجوان تھا۔ عالی ہمت، روشن دماغ اور دادرس۔ کچھ دن بعد مجھے مطلعِ انوار ملا۔ اس مجموعے سے میرے دل پر برق کی عظمت کا سکہ جم گیا۔ مگر افسوس کہ جو کام میں نے اپنے ذمے لیا تھا وہ ان کی حیات میں پورا نہ کرسکا۔ اعتبارِ زمان و مکاں سے تو ان کی تصنیف نہایت قابلِ قدر محسوس ہوئی مگر میرے اس وقت کے زاویۂ نگاہ سے ان کی مستقل شاعرانہ حیثیت مجھے کچھ زیادہ نہیں جچی۔ اس لئے میں اپنے مقالہ میں ان کا شمار Major Poets میں نہ کرپایا۔ بعد میں میری رائے

تبدیل ہوگئی اور پورا ئے میں نے برق کی میراں بائی پڑھ کر جو کبھی قائم کی تھی۔ لوٹ پھر کر اسی پر آ گیا اور اب میں نہ صرف ان کی معاصرانہ خدماتِ ادب کا قائل ہوں بلکہ اُن کی مستقل نمائندگی تہذیب ہنود کا بے حد مداح ہوں۔ خالص شعریت کے اعتبار سے اُن کو ایک کامیاب ترین صناعِ الفاظ سمجھتا ہوں۔ دُنیا مرنے کے بعد داد دیا کرتی ہے۔ جب مرنے والا داد دینے والے داد کا مستحق ہو جاتا ہے۔

اس مجموعہ کی تمام نظمیں نئی ہیں یعنی کرشن درپن اور مطلع انوار میں شامل نہیں طالب صاحب نے اپنے اُستاد کا حقِ نعمت ادا کر دیا ہے اور اسلوب کے شائقینِ فن اور کاملینِ تصوّف اور محبانِ وطن ان سے لُطف اندوز ہو کر طالب صاحب کی برخورداری کی داد دیں گے۔

ہندوؤں میں کائستھ خدمتِ ادبِ اُردو اور تفسیرِ تہذیبِ ہنود میں پیش پیش رہے ہیں۔ کشمیری پنڈتوں نے بہ استثنیٰ چند دادِ سخن تو دی ہے مگر اپنے مذہب کی خصوصیات سے یا تو دامن چرایا ہے یا انھیں اسلامی رنگ میں ڈبو کر رکھا ہے۔ میں اس ملاقات کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ جو مسٹر سچدانند نے مجھے مسٹر عبداللہ یوسف علی کی معیت میں عطا فرمائی۔ سنہا صاحب نے ایک نہایت جوشیلے مگر متانت آمیز انداز میں چکبست کے "رامائن کا ایک سین" کے متعلق یہ بنیادی اعتراض فرمایا کہ وہ ہندو رسوم و آئین کی مکمل تکذیب کرتی ہے۔

"رخصت ہوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام"

یہ کسی ہندو اوتار کے متعلق ہے یا کسی شیعہ مسلمان کے بارے میں۔

بات یوں ہے کہ چکبست دوسرے قوم پرستوں اور تھیوسی فسٹوں کی طرح حُبِ وطن کے سیل میں بہہ رہا تھا۔ وہ استغراقِ دینی پر وطن پرستی کو ترجیح دیتا تھا۔ اور آج کل کے پڑھے لکھوں کے مانند ہندو مذہب کی اکثر روایات کو بیشتر ترقی و تمدن میں حارج اور مخل سمجھتا تھا۔ ہندو مسلمانوں کے یک طرفہ اتحاد کا قائل تھا۔ زبان کے بارے میں کشن پرشاد کول کی سی ہندی بندشوں کا خواہ وہ کسقدر زندہ، درست اور موزوں کیوں نہ ہوں، خواب تک نہ دیکھ سکتا تھا۔ یہی حال کیفی کا ہے۔ وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ جب کوئی ہندو اُردو کو قبول فرمائے اتحادِ ملی کی خاطر، تو وہ نظم و نثر میں اپنے ہندو پن کو ظاہر کرنے سے باز رہے۔ ایسے الفاظ، تراکیب، استعارے، کنائے، تلمیحات اور تواریخی واقعات جو ہند تہذیب و تمدن سے وابستہ ہیں اُن سے زبان کے دامن پر داغ نہ آنے دے۔ برق اور ان کے پیشرو اور ہم عصر اُردو کو محض آلۂ کار تصور کرتے رہے اور اس کے دامن کو ہندو ادب و تاریخ و فلسفہ کے جواہر پاروں سے مالا مال کرنا چاہتے تھے وہ اُردو کو یوں دونوں قوموں یا گروہوں یا مذہبوں کا مشترکہ آئینہ دار بنانے میں تعمیر اتحاد کی تکمیل سمجھتے تھے۔ اُردو کے خزانے کو دونوں بھریں مگر اپنی ملی، دماغی، تواریخی خصوصیات کے ساتھ۔

اس روش پر چل کر جن ہندوؤں نے اُردو کی خدمت کی ہے وہ ہمیشہ زندہ رہینگے اور اُردو داں ہندوان کی راہ میں آنکھیں بچھاتے رہیں گے اور ان کے کارناموں کو سراہتے رہیں گے مگر جو ہندو ادیب صرف نقالی ہی کو اپناتے رہے ہیں انھیں نقال ہی کی پیروی عطا کی جائے گی۔ نظر، چکبست، جگر، فراق، محروم، کیفی کی یاد ماضی دوست ہندوؤں کے دلوں سے مٹ جائے گی مگر فرحت، افق، مہر، سرکہ برق، منور، سحر، کنہن لال منشر، گجپت سرن داس بھٹناگر ایسے دین پرستوں کو شبلی، حالی، اقبال کا ہم پلہ قرار دیا جائے گا اور ان کی تصنیف کے روزانہ مطالعہ سے ہندو اپنی عاقبت کو سنوارتے رہیں گے۔

ایک ہندو کی روزانہ زندگی میں صرف چار چیزوں کو دخل ہے۔ قومی ویروں سے متعلق قومی تہواروں کا منانا، اِشٹ دیو کی پوجا "چلنا پھرنا" اور خود شناسی کے اصول کو واضح کرنے والی کتابوں کا پاٹھ۔ اور وطن پرستی کے جذبہ کی صدرنگ تکمیل رامائن، مہابھارت، بھاگوت، پران، گیتا وغیرہ مقدس کتابیں اور سنتوں کی بانی وہ روحانی غذا ہے جس پر چل کرنہ صرف ہندو اکتساب فلسفہ انجام دیتا ہے بلکہ اپنے ذوقِ ادب کی تربیت کرتا ہے اور اپنے مجموعۂ الفاظ کو بڑھاتا ہے۔ تہواروں کے متعلق سال میں کئی مرتبہ وہ گیت گا کر اور کتھائیں سن کر اپنے وطن کے ہر دریا، پہاڑ، درخت، پھل، موسم، فرقے، گروہ اور ہیرو سے پیار کرنا سیکھتا ہے پوجا ارچنا سے وہ نہ صرف اپنے پرماتما بلکہ اپنی آتما اور دوسری جیو آتماؤں کے قریب

ہتا ہے اور اہنسا اور آتم گیان کے ذریعہ وہ کل بنی نوع انسان کی اور اپنی انفرادی بہتری کی عمارتوں کو شاندار بناتا ہے اور مستقبلِ پُرامن کی ضمانت مہیا کرتا ہے، حکومت، شہوت، وحشت کے جذبات کو ان دو اصولوں کے کلہاڑے سے بیکار کر دیتا ہے۔

شاعر سماج کا ایک Unit ہے۔ اسے اسی ماحول میں اپنی ذات، اپنے صوبے، اپنے ملک میں رہ کر پرماتما کو پانا۔ اپنی آتما کا ساکشاتکار کرنا اور اپنے ہم وطنوں کی ترقی کا بار اٹھانا ہے۔ پرانے ہندو شاعروں کو دیکھئے۔ رب کے سب شبھی تو ننانوے فیصدی ویدک شعرا سے لے کر کالی داس تک اور بھوبھوتی سے میرا تک اور واؔدو سے ٹیگور تک سنت ہوئے ہیں۔ فنِ شعر کو وہ ایک مقدس فن سمجھتے تھے اور دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح اسے وطن کے پیار، پرماتما کی تحمید اور سماج کی بہتری کے ارپن کر دیا کرتے تھے۔ انفرادی ضروریات انفرادی حادثات۔ انفرادی جذبات کو وہ کبھی شعر کے ذریعے سے عوام کے سامنے لا کر اپنی تذلیل یا توقیر کا سامان بہم نہیں کرتے تھے۔ تمام دیگر مہذب اقوام کے شعرا نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ سماج انھیں شعرا کو اپناتا ہے اور انہی کی عزت کرتا ہے جو سماج کو اپنائیں اور اپنی تہذیب کے اجزائے اعظم اور خصوصیات بہترین کے گیت گائیں۔ اقبال نے مسلمانوں کو جگایا۔ غالب نے ابتذال سے پہلو بچایا اور شاعری کو انفرادی تہذیبِ نفس کا ذریعہ بنایا۔ انیس اور دبیر نے شیعہ لوگوں کو

تواریخ کے دردناک مناظر دکھا کر رُلایا۔ یہی چار مسلمان شاعر ہیں جو زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ ہر پڑھے لکھے مسلمان کی میز پر ان کا کلام ایسے ہی زینت دیتا ہے جیسے سنسکرت ہندی سے نابلد اُردو داں ہندو، سکھ کے میز پر اُفق کی رامائن۔ طوطارام شایاں کی مہابھارت، شعلہ کی بزم بندرابن اور اُفق کی سوانح عمری گرد گوبند سنگھ منظوم۔

الغرض شاعر سماج کا قرضہ اُتارتا ہے اور سماج شاعر کی شہرت کو اُبھارتا ہے برق مرحوم نے وہی کچھ کیا جو ایک قادر الکلام نبض شناس ماضی اور حال سے باخبر شاعر کو کرنا چاہیئے۔ طول طویل قصوں اور تراجم کے پڑھنے کی فرصت کم تھی۔ لوگ متفرق جھانکیوں کے لئے بے تاب تھے۔ سو اُس نے ہندو فلسفہ، ہندو روایات، ہندو سماج ہندو ویروں، ہندو وطن پرستی کی مختصر سی جھانکیاں تیار کر دیں۔ اس تیاری میں اس نے جدت بھی دکھائی اور پڑی لکیر کو بھی اپنایا۔ کلام میں زور اور تاثیر پیدا کرنے کے لئے اس وقت کے مرغوب الفاظ اور عروضی صورتوں کو لیا۔ اس وقت میرے سامنے اس مجموعہ کے ۲۱۱ صفحات ہیں۔

۱۔ خود شناسی، رازِ آفرینش، رازِ سربستہ۔ ان میں حقائق و معارف سے بحث ہے۔

۲۔ کرشن اوتار، جنگل جوڑی، تلا دان، اشوک بن میں۔ راس لیلا۔ سری کرشن بھگوان۔ پنچ وٹی کا ایک سین، دروپدی کا چیر۔ راجہ آج کا ولاپ۔ گرد

گوبند سنگھ کی شان میں، اشٹ دیویوں کی تحمید و توصیف ہے مگر اس پیرایہ سے کہ تاریخ۔ فلسفہ، جذباتِ عقیدت۔ تصویر کشی کا ایک نہایت دلآویز مرقع آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

۳۔ مغربی شاعری کی تقلید میں اور معاصرین کی ہم روشی کے تقاضا سے شاعر، ستارے، عالمِ شباب کی یاد۔ گورِ غریباں۔ بچپن کی یاد۔ کہکشاں گرمی کی شدت۔ زلزلے کی تباہ کاریاں بھی گئیں۔

۴۔ اپنے وطن کے تیوہار۔ پھول، خادم۔ لیڈر کیونکر محرک شعر ہوتے سورج مکھی لبسنت۔ پرتاپ۔ ہیم چندر۔ سنگرھانند۔ اسی زمرے میں آتی ہیں۔

۵۔ کچھ غزلیں اور متفرق اشعار ہیں جو قدما کی پیروی ہے۔

میں نے شاعری کو چھ اقسام میں منقسم کیا ہے۔ فلسفیانہ اور اخلاقی، تاریخی اور قومی۔ ناٹکی یا ڈرامائی۔ جذباتی یا تغزلی۔ تصوراتی۔ طنزیہ اور تضحیکی۔ معمولی شاعر خودشناسی سے محروم، ہر ایک رنگ میں کچھ نہ کچھ کہتا ہے مگر اس انداز سے کہ کوئی خاص انداز پیدا نہیں کر پاتا۔ ہر شاعرِ اعظم یا کوئی خاص نئے تراشتا ہے، کوئی خاص انداز وضع کرتا ہے یا کسی خاص موضوع پر روشنی ڈالتا ہے، یا کسی واقعہ کی تصویر کشی کرتا ہے۔ کوئی خاص پیغام دیتا ہے کسی خاص مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے۔ کسی نئے زاویۂ نگاہ سے اشیاء و واقعات کی صورت دکھاتا ہے یا ایک نئی منزلِ مقصود کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یا پامال اور فرسودہ مضامین کو نئی تان کر

گاتاہے اور یہ سب کچھ وہ ایک بڑی مقدار میں کرتاہے کوئی مہاکاویہ
Magnum Opus لکھ کر بار بار اسی منزل کی طرف اشارہ کرکے، اس کی شخصیت
کی مُہر صاف عیاں ہوجاتی ہے اور اس کا نام دیکھے بغیر انسان کہہ اٹھتاہے
کہ یہ کسی بڑے شاعر نے کہا ہوگا، غالباً فلاں نے جو کچھ وہ کہتاہے اس پر
اس کے انفرادی تجربہ، مطالعہ، سیاحت کی چھاپ لگی ہوتی ہے۔ وہ اس
قدر ڈوب کر، اس قدر بلند ہوکر، اس وسیع النظری سے فرماتاہے کہ انسان
خود کو ایک اچھے خاصے مفکر، مصلح، صوفی، سنت کے بالمقابل پاتاہے۔ برعکس
اس کے معمولی شاعر خواہ وہ کتنا ہی کامیاب اور شہرت یافتہ اور کامل فن ہی
کیوں نہ ہو۔ اپنی شخصیت کی مُہر لگانے سے معذور رہتاہے اور کوئی دیرپا اثر
نہیں ڈال سکتا۔ نہایت معمولی شاعر کے کلام سے بھی گاہے گاہے انسان
متاثر ہوتا دیکھا گیاہے۔ پھر ایک گھٹیا شاعر بھی بعض اوقات ایسا شعر
کہہ جاتا ہے کہ بے اختیار داد دینی پڑتی ہے اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا
جاتا۔ مگر جو چیز ایک بڑے Great شاعر کو ایک معمولی مگر کامیاب Good
شاعر سے تمیز کراتی ہے وہ ہے مقدارِ صالح۔ بڑے شاعر کا کلام فنونِ لطیفہ
علوم ظاہر و باطن۔ تجربہ و تصور کا ایک نہایت دلکش مرقع ہوتاہے۔ ٹیگور ہی کو
دیکھو، کس قدر علم و فن پر اسے قدرت حاصل تھی۔ اور الفاظ، موضوع، محاکات
تفہیم کے باب میں کس قدر اثر پذیر، فراخ دل، بلند مرتبہ اور بےتعصب

واقع ہوا تھا۔ اثر اندازی بقدر اثر پذیری ہو سکتی ہے۔ جاہل شاعر، بدکار شاعر، بے ہنر شاعر، کثیف شاعر اپنے جہل۔ اپنی بدکاری، اپنی بے ہنری اور اپنی کثافت کو چھپا نہیں سکتا۔ وہ بصد طور ظاہر ہو کر رہتی ہے

برقؔ میں ایک بڑے شاعر کی اکثر خوبیاں جمع تھیں مگر افسوس کہ وہ ان کو خاطر خواہ اور کماحقہ استعمال نہ کر سکے۔ نہ کسی طویل چیز کو ہاتھ میں لیا نہ چھوٹی چیزوں کے بنانے میں سنجم یا ضبط سے کام لیا۔ اسی لئے ان کے جوہر پوری طرح کھلنے نہ پائے مگر اس میں شک نہیں کہ فرط آمد، شدت جذبہ۔ جدت تخیل اور پرواز تصور میں وہ بلند رتبہ تھے اگر پرواز کو وہ منضبط اور دیرپا رکھ سکتے اور تصور کو صاف، تو ان کے لئے کلاسیکل Classical ہندو شعراء کو جا لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ پھر بھی وہ سرور، اقبالؔ، شبلی، چکبست سے کچھ باتوں میں آگے اور بہت باتوں میں ان کے ہم قدم تھے۔ کرشن اور کرشن بھگوان کو تو انھوں نے خاص طور پر شعلہ حصاری کے بعد دھیان کا مرکز بنایا۔ واللہ کرشن کی شخصیت صد ہزار پہلو رکھتی ہے اور ہر پہلو صد رنگ ہے۔ کرشن بھومی کی یاترا سے میں ابھی کل ہی تو لوٹا ہوں۔ وہاں کے ہر ذرے میں لطافت ہے۔ وہاں کے ہر قطرے میں موسیقیت۔ ہر پتے میں پیغام۔ اور ہر پرندے میں برشِ صمصام۔

برقؔ لیے کرشن بھگتوں سے کرشن کی امامت اور رسالت اور گوپیوں کی

صداقت و محبت زندہ ہے سے ۵ دیوانہ

عقیدت چاہے جس پتھر کو زیب بتکدہ کر دے
بتوں کی شان قائم ہے، سلامت بتکدے والے

راس لیلا کو شعلہ نے اردو نظم میں خوب چیترا ہے۔ یا ان سے پہلے فارسی نظم میں ہفت جام کے مصنف نے جو واقعی مئے ہفت رنگ ہے اور گردش ہفت فلک، ہاں یاد ش بخیر میرے پنجابی بھائی کشن گوپال شیدا وزیر آبادی نے بھی اپنے "نمائی چاند" اور "مدھو سودن کرشن" سے ہزاروں خشک دماغوں اور بد دلوں کو بنسی والے کا گرویدہ بنا ڈالا تھا۔ دلی کے ایک نوجوان راج بہادر شرر بھی کرشن کے خاص نام لیواؤں میں ہیں۔ میاں انسان بھٹی کرے تو کنس کو بدھ کرنے والے کرشن کی، گوپیوں کا من ہرنے والے کرشن کی گیتا مرت شبد کنڈ بھرنے والے کرشن کی، اس کرشن کا پیغام کیا تھا؟ بہ الفاظ برقؔ

بحر ہستی سے تو کنارا کر ساحل و موج کا نظارا کر

حق رسی مدعا شناسی ہے خود شناسی خدا شناسی ہے

راس لیلا میں بازیچۂ ہستی اور رقص موجودات کا سر نہاں صاف عیاں ہے، مجھ پر عظمت برق، جہندگی برق، تابندگی برق۔ .... کا سکہ

بجھانے والی یا برق کی میراں بانی تھی۔ یا راس لیلا، دیکھئے فرماتے ہیں

راس لیلا کا بھی دلکش ہی نظارا کیا　　　رنگ ہر جلوہ گہہ ناز کا پیارا کیا
برج کی خاک کا چمکا ہے ستارا کیا

جسکے ہونٹوں سے اشارے پہ جہاں رقص میں ہی　　　آپ وہ جانِ جہاں جلوہ کناں رقص میں ہی
حلقۂ رقص میں نٹ راج بھی خود شامل ہی　　　یا یہ جھرمٹ میں ستاروں کو مہ کامل ہی
سچے دل سے ہیں پرستار، عقیدت ہی شعار　　　بانسری والے سے ہیں ظاہر و باطن دو چار
ہر طرف کرشن کی تنویر نظر آتی ہے　　　وہی من موہنی تصویر نظر آتی ہے
ٹیر ہنسی کی کئے دیتی ہے دل کو تسخیر　　　کشش حسن سے بھی بڑھکے ہی اسمیں تاثیر
انکے ہر بول سے وا ہوتے ہیں راز ہستی　　　انکی آواز سے معمور ہے سازِ ہستی
درس آموز ہیں کھیل اسکے زمانے کے لئے　　　نئے منظر ہیں یہ ہستی کے فسانے کیلئے
راس لیلا بھی ہے بھگوان کی مایا کا ظہور

ہیبرٹ جرنل Hibbert Journal میں ایکبار مسٹر ایڈمنڈ ہولمز Edmund Holmes کا مضمون دنیا لیلا کے طور پر World as Lila دیکھا تھا۔ ہولمز نے نہایت موثر طریقہ سے ثابت کیا تھا کہ مسئلہ ہستی کا اگر کوئی حل ممکن ہے تو اسی صورت میں کہ موت و ہستی سے بالاتر ہستی کا کھیل سمجھا جائے۔ جو نکات، کھیل، لیلا، راس سے ہویدا ہوتے ہیں وہ کسی اور دلیلِ فلسفہ سے آشکار نہیں کئے جا سکتے۔ اس کا

کھیل اور ہمارا اختتام کرم ایک ہی سطح پر ہیں۔ سزا و جزا، نیک و بد، دُکھ سُکھ کی آلائش سے پرے کوئی جنگ آزما جب موت کو کھیل سمجھتا ہے تو وہ دُنیا کا سب سے بڑا دلاور بن جاتا ہے۔ کوئی محبت کیش جب زندگی کو بازی یا لیلا سمجھتا ہے تو وہ میدانِ حُسن کا سب سے کامیاب فاتح ٹھہرتا ہے۔ بھگتی اس کے لئے ہے جو راس لیلا کے راز کو سمجھ کر ہر گوپی کے لئے ایک کرشن، ہر ارجن کے لئے ایک رتھبان ہر کنس کے لئے ایک کنس ہدھک، ہر گائے کے لئے ایک گوپال متصور کرتا ہوا اپنا معین کھیل کھیلتا چلا جائے۔

دلّی میں کرشن بھگتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ سب سے افضل خدمتِ ادب انہی کے ذریعے سے ہوئی ہے۔ معجز صاحب نے گیتا کا ترجمہ کیا۔ منوّر لکھنوی کو بھی دلّی آکر یہی بات سوجھی۔ ارمان دہلوی، چندی پرشاد شیدا دہلوی چندر بھان کیفی دہلوی۔ رونق دہلوی نے بھی کرشن کی اکثر رہس میں لیلاؤں کو نظم فرمایا ہے اور بہت عمدہ طریقے سے، ہندو شعرا کی سجدہ گاہ کرشن نہ ہو تو کون ہو؟ جس نے گیتا ایسا گیت میدانِ جنگ میں گایا، گیتا کی ادبی لطافتوں کی نقاب کشائی کا یہ موقعہ نہیں ورنہ بہت کچھ عرض کرتا۔ سولہ کلا سمپورن کرشن سو پورن تر آدرش ممکن ہی نہیں۔ دلّی اور نواح تو خود کرشن کی لوازی ہوئی بھومی ہے کرشن بھومی کی برج بھاشا نے اُردو کو اُردو بنایا۔ ہندی کو تیاما دلآویز ترین حصہ کرشن بھگتی کے گیت ہیں۔ رام بھگتی کے مزے کم شیریں، وضعدار اور ہمہ گیر نہیں

والمیک کی رامائن سے شاعری شروع ہوئی اور تلسی کی رامائن پر ختم ہو گئی شاعری یعنی مہا کاویہ۔ برق کی رام بھگتی کی جھانکیاں بھی کم دماغ بخش نہیں۔

برق کے درج ذیل سرمایۂ اُردو سے ہیں۔

پریم مودت کو نہیں مال و مدارات کی قدر   ہے مگر پریم میں ڈوبے ہوئے جذبات کی قدر

جسے کہتے ہیں "انہد شبد" یہ وہ نغمۂ نے ہے
جو اذکارِ دو عالم کو بھلا دیتی ہے وہ نے ہے

ہوا و حرص سے نغمۂ گیتا نے، پاک کیا   بلند رتبۂ آسودگانِ خاک کیا

وشو روپ میں ارجن کو جب دیئے درشن   کیا حجاب خودی دور چشم حیراں سے

مل گئی دروپدی کو غیب سے فریاد کی داد
دی سری کرشن نے حسرت بھری رُوداد کی داد

تعجب کی بات ہے کہ برق ایسے نکتہ شناس نے تاریخ دہلی کے مواد حاصل

---

* مصنف کا تمام اُستادی مرحوم سائل کا نہیں ہے۔ لیکن بڑا بہت کے رضا کی کفالت میں اس طرح کا کلام محفوظ ہو۔

جس میں سرزمین دہلی، اس کی روایات اور تاریخ کو بعض منظومات میں نظر نا گیا ہو۔ طالب دہلوی بی اے

نہیں کیا۔ میں دلّی میں آج سے بیس برس پہلے ملازمت کے سلسلے میں کئی ماہ رہ چکا ہوں۔ مگر دلّی کے کھنڈرات کو میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اب جو دیکھا تو رگِ حمیّت پھڑک اُٹھی اور روحِ شاعری کو تحریک ہوئی۔ اس قدر کہ بیسیوں خیالات، پلاٹ اور استعارے دماغ میں منڈلانے لگے۔ مگر دلّی والوں کی شاعری آنکھیں بند کئے اتنی صدیوں سے دلّی میں رہتی پھولتی پھلتی چلی آئی ہے۔ میں یہ امر اس لئے معرضِ بحث میں لایا ہوں کہ شاید اس تحریر سے کسی طالب ایسے صاحبِ القا کے خامہ کو جُنبش ہو۔ قطب الدین۔ بابا فرید۔ رضیہ سلطانہ پر شاید ہی کسی مسلمان نے کچھ کہا ہو۔ پھر مسلمان بادشاہوں کی تعمیر پسندی پر نظم میں کچھ نہیں لکھا گیا۔ ہندوؤں کو آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے پانڈوں کا قلعہ۔ گوردوارہ سیس گنج۔ پرتھوی راج چوہان۔ دجے ستمبھ۔ چندر گپت کی کیل نہانے کا تالاب۔ Diving Well یوگ مایا کا مندر۔ ایسے مقامات اشخاص اور واقعات پر وردآمیز، درس آموز۔ رقت خیز "طوفانی نظمیں" کہنا چاہیئے تھیں۔ کورو کشیتر[1] کے میدان سے کوئی مخاطب نہیں ہوا۔ کسی نے لاٹ کے حُسنِ تعمیر پر۔ تغلقی عمارات کے نقش و نگار پر۔ بختیار کاکی اور فرید کی شدّتِ زُہد و ریاضت پر سرمد کے رموزِ معرفت اور اس کی القاب انگیز

---

[1] کورو کشیتر کے عنوان پر کرشن وہپن میں استاذی مرحوم حضرت برق دہلوی کی نظم موجود ہے، آپ حق مطالعہ فرما سکتے ہیں ——— طالب دہلوی، بی۔ اے

شہادت پر رکھ کر اپنی فطرت پرستی، دین پناہی، اکابر شناسی کا ثبوت نہیں دیا۔ دلّی کا چپّہ چپّہ خالص شاعری کا محرک ہو سکتا ہے۔ آزاد دہلوی اور آزاد (ابوالکلام) نے نثر میں (اور شاید آشوب نے بھی) جو رونا رویا ہے اور جو رنگین بیانی دکھائی ہے وہ اگرچہ شعریت سے معمور ہے پھر بھی منزلِ مقصود سے بہت دور ہے بسلمان اردو بازار۔ مینا بازار۔ جامع مسجد وغیرہ پر اس درد شان اور نقاشی سے طبع آزمائی کر سکتے تھے کہ دنیا حیرت میں آجاتی مگر بدبختی سے ہیں اپنے وطن کی خاک سے وہ لگاؤ ہی نہیں جو چاہیئے۔ وطن کے اینٹ پتھر، وطن کے نقش و نگار، وطن کے افسانے۔ وطن کے ستارے۔ وطن کا آسمان ہماری توجہ کا مرکز کم رہے ہیں۔ برقؔ اگر پرتھوی راج کے حالات نظم کرتے تو رہتی دنیا تک ان کی یاد بنی رہتی۔ خیر طالب صاحب نے یہی کیا کم احسان ہم پر کیا ہے کہ ایسا اچھا انتخاب ہمارے سامنے رکھا ہے۔ میں ان کے سلیقہ اور انتخاب کی تعریف کرتا ہوں۔

برقؔ کی غزل ان کے احساس کے عمق پر شاہد ہے۔ خوب شعر نکالے ہیں۔ دلّی والوں کا امتیاز درد و اثر و لذت اور تغزل سے ہے۔ حسرت موہانی نے دلّی اور لکھنؤ کی امتیازی خصوصیات خوب وضاحت سے بیان فرمائی ہیں۔ میں یہاں کیا لکھوں۔ مگر گذشتہ چالیس برس سے دلّی میں وہ چیز نظر نہیں آرہی۔ فارسی دیوان کی پامال ترکیبیں اب لائی جارہی ہیں۔ میٹھی اور

پیاری زبان غائب۔ پاکیزہ خیالات کم۔ متبذل معاملہ بندی پر زور۔ داغ نے دلّی کی شعریت کی نمائندگی نہیں کی۔ دلّی کے رنگ کو جو میر۔ غالب۔ درد مومن کی چیدہ خوبیوں کی پسندیدہ آمیزش سے عبارت ہے۔ حسرت چھین کر کانپور لے گئے مگر انھوں نے بھی اسے لکھنوی Abstractions ملاوٹ سے بے اثر کر ڈالا۔ اثر۔ طالب۔ غافل اور اختر کے کلام میں کبھی کبھی وہ سادگی اور گہرائی نظر پڑتی ہے۔ برق۔ رونق، امن، منور وغیرہ نے البتہ اتنی مقدار میں کہا ہے اور عموماً ایک ایسی سطح پر کہ ان کو غالب، مومن، درد، میر کا جانشین کہا جاسکتا ہے۔ مثالاً برق کے چند شعر پیش کرتا ہوں جو دلّی کے خاص رنگ کو لئے ہوئے ہیں۔ اس دلّی کے رنگ کو جس کا کلیجہ پے درپے نیرنگیوں نے چیر ڈالا تھا۔ جس کی روح کو انقلابات کے متواتر صدموں نے "بے ہوش" کر رکھا ہے۔ جو نئی دلّی کے بھیس میں بھی اپنی بربادی اور درویشی کو چھپا نہیں سکتی۔ سچ مچ دلّی آبادی اور بربادی، ہمت اور بے بسی کا ایک یکتا تاریخی نمونہ ہے۔ دیوانہ

دلّی مرے دل کی ہے تواریخ میں مشہور ۔۔۔ اُجڑی ہے کئی بار کئی بار بسی ہے

کچھ متفرق اشعار اپنی یادداشت سے اور بقیہ مجموعہ سے انتخاب کئے جاتے ہیں۔ برق فرماتے ہیں۔

دل تری زد پہ نگاہِ فتنہ ساز آہی گیا ۔۔۔ بچتے بچتے بھی تہِ شمشیرِ ناز آہی گیا

ہوتے ہوتے ہو گئی آخر حقیقت میں نظر
آتے آتے راہ پر عشق مجاز آ ہی گیا

اسمیں تو خوشبو نہیں، اسمیں کرم کی خو نہیں
دل ہے بے فیض آدمی کا شمع کے گل کا جواب

دل کی مراد پہلے ہی منزل میں ہو حصول
کعبہ کے راستے میں صنم خانہ چاہیئے

جب سے میں کنج قناعت میں ہوا ہوں گوشہ گیر
ہے بساطِ خاک اورنگِ سلیمانی مجھے

جب آنکھیں پھیر لیتے ہو تو کوئی رخ نہیں کرتا
گراتے ہو نظر سے تم جسے مشکل سے اٹھتا ہے

نہ ہو نازاں نشاطِ دم زدن پر دہر میں غافل
چراغِ صبح کا ہنسنا ہے تیرا شادماں ہونا

اشک ریزی اس کی فطرت ہے بدل سکتی نہیں
قبرِ بیکس پر جلے یا شمع محفل میں رہے

کیوں نہ رُوداد محبت ہو سراپا رنگیں؟ خونِ امید اگر سُرخیٔ افسانہ بنے

خستہ حالوں کی خوشی بھی نہیں غم سے خالی خون روئیگا لبِ زخم جو خنداں ہوگا

ہوائے مرگ کی زد میں چراغِ زندگانی ہے
مجھے آغاز میں انجام آتا ہے نظر اپنا

مسافر ہوں عدم کی راہ میں فکرِ اقامت کیا
وہیں منزل ہے جس جا ختم ہو جائے سفر اپنا

بہارِ خندۂ گُل دیدنی ہے باغِ عالم میں تماشا ہو گیا غنچہ کا شیرازہ بکھر جانا

دل کے شیرازہ کا بکھر جانا ایک تماشا ہے۔ مگر کیسا تماشا؟ وہ تماشا شاعری کی آنکھ سے نہیں دیکھا گیا۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ پھر بھی اس امر سے تسلی ہے کہ برق ایسا کوئی نہ کوئی کرونا رس کی کوتا کرنے والا پیدا ہوہی جاتا ہے۔ برق کے بعد میری امیدوں کا مرکز منور ہے اور طالب۔ ابھی دونوں نوجوان ہیں۔ امن صاحب کو مصروفیتیں کھا گئیں۔ شرر دفتر اور

نوٹ:۔ (۱)۔ جذباتی یا تغزلی (۲) شاعری

گھر کی خاکستر میں دبے ہوئے ہیں۔ سائل پیری کی لپیٹ میں آ گئے۔ ساحر غم و نشاط کی منزلوں سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ معرفت نے انھیں دونوں سے بے نیاز کر دیا۔ حسن نظامی شعر نہیں کہتے۔ ہائے کیسی دولت سے ہمیں محروم کر رکھا ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ اگلے جنم میں دلّی ہی میں شاعر بن کر آئیں۔ آزاد ستیا کے گرفتار رہیں۔ اور کسی کو میں جانتا نہیں۔

میں شعرِ برق سے انصاف نہیں کر پایا۔ اسکا مجھے احساس ہے۔ مگر یہ بھی غلط کہ برق "گُلِ صحرائی" تھے اور ان پر کسی کی آنکھ نہیں پڑی سے برق

کھل کے مرجھا بھی گیا آنکھ کسی کی نہ پڑی
میں چمن زار جہاں میں گُلِ صحرائی تھا

مجھ ایسے ہزاروں کی نظر اُس پر پڑی اور اس کے جلوہ سے سیراب ہوئی اُدھوگی۔

تحریر ۱۷ اگست ۱۹۷۱ء

برق کی شاعری

(از رشحۂ قلم محبّ وطن مسٹر آصف علی بیرسٹر ایٹ لا، ایم۔ ایل۔ اے نیشنل)

کلام برقؔ کا یہ تازہ خرمن مرحوم کے عزیز اور شاگرد طالب دہلوی کی کوشش اور محنت کا ثمر ہے۔ شاعری میں برق اور خرمن متضاد ہیں۔ مگر جب شاعر خود برق ہو تو خیالات کے خرمن انبار در انبار جمع ہو جاتے ہیں۔ "مطلع انوار" "کرشن درپن" ارباب ذوق تک پہلے پہنچ چکے ہیں اور اب یہ ایک تازہ مجموعہ اور پیش کیا جا رہا ہے۔

ہزار افسوس کہ مہاراج بہادر مرحوم کی عمر نے وفا نہ کی، ورنہ نہ معلوم اور کتنا خزانہ اس معدن سخن سے نکلتا اور اُردو کو مالا مال کرتا۔ دہلی اور دہلی والے ہی نہیں، اُردو کے حامی مرحوم کے کلام پر جتنا ناز کریں بجا ہے۔ مہاراج بہادر دلّی کی وہ ستھری زبان لکھتے تھے جو سند مانی جاتی تھی۔ آج تو یہ کہنا دشوار ہے کہ کسی جگہ کی مخصوص زبان بھی سند مانی جا سکتی ہے۔ کیونکہ جس رفتار سے زبان ترقی کر رہی ہے۔ شہر شہر گاؤں گاؤں اور گھر گھر سند کے پشتارے موجود ہیں اور بظاہر ہر شخص کا دعویٰ صحیح ہے، کیونکہ جو زبان وہ بولتا یا لکھتا ہے اس کے لئے تو سند

دی ہے۔ اگر زبان کا کام یہ ہے کہ وہ خیالات جو ایک دماغ میں آتے ہیں دوسرے دل تک پہنچ جائیں تو سند تو صرف اتنی ہی درکار ہے کہ مفہوم سمجھ لینے میں دشواری نہ ہو اور کچھ کے کچھ معنی نہ سمجھ لئے جائیں۔ باقی تو محض خاص خاص حلقوں اور طبقوں کی اپنی اپنی حد بندیاں ہیں۔

ایک وقت ایسا بھی تھا کہ دلی کی ایک خاص زبان مستند سمجھی جاتی تھی اور برق کا کلام اس ہی زبان میں ہے۔

برق پیدائشی اور خاندانی شاعر تھے۔ طبعیت کی موزونی ان کا ورثہ تھا۔ اور ذوق سخن کی بجلی ان کے رگ و پے میں دوڑتی تھی۔ حالات کے ناموافق ہونے کے باوجود ان کی فطرت نے اپنے ورثہ اور امانت کو اوجھل نہ ہونے دیا اور آخر ان کی شاعری کی بجلی چمک کر رہی۔

موزوں طبیعتوں کا دنیا میں کال نہیں اور شعر موزوں کر لینے والوں کی بھی کمی نہیں۔ مگر وہ طبیعتیں جن کی بے بس طغیانی کا نام شاعری ہے عموماً کم ہوتی ہیں برق اس آخری زمرہ کے شعرا میں سے تھے۔ ان کا دائرہ صنائع و بدائع کسی خاص صنف شاعری تک محدود نہ تھا۔ طبعیت میں جودت تھی، روانی تھی، ہمہ گیری تھی، اور سخن میں شیرینی اور خیال میں پرواز۔ ان کے احساس کا دامن وسیع تھا۔ اور ان کے فکر کی دنیا وسیع تر۔

برق کے رباب خیال کو قدرت نے اس طرح موزوں کیا تھا کہ اس پر

ہلکی ٹھیس کا بھی اثر ہوتا تھا اور زخمۂ کائنات کی ہر ضرب سے نغمہ پیدا ہوتا تھا۔ مطلع انوار کی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مناظر قدرت سے لے کر محسوسات اور وارداتِ قلب کی ظاہر اور باطن دنیاؤں کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جو برق کی نگاہ سے چھوٹ گیا ہو۔

اس مجموعہ میں جو اب پیش کیا جارہا ہے مختلف قسم کی نظمیں ہیں جو گہرے غور و خوض اور عارفانہ فکر کا نتیجہ ہیں اور وہ جو عارضی موقعوں اور وقتی اثرات کو پیش نظر رکھکر شاید فرمائشی طور پر لکھی گئی تھیں۔ فرمائشی نظمیں کہنا عموماً شاعر پر ظلم ہوتا ہے اور بامروت شعراء تقاضائے خوش خلقی سے معذور ہوتے ہیں۔ مگر ایسی نظموں کو ان کا معیاری کلام نہیں کہا جا سکتا۔ وہ نظمیں جو برق کی پختہ خیالی کا مرقع ہیں۔ اس امر کی شاہد ہیں کہ مرحوم آخر زمانہ میں عارفانہ رنگ کی طرف بہت زیادہ مائل ہو چکے تھے اور یہ بات لازمی ہے۔ عالم شباب بہار کا موسم ہوتا ہے اور جب عمر کھنچنے لگتی ہے تو پھل جمع کرنے کا وقت آجاتا ہے۔ کہتے تو یہ ہیں کہ جوں جوں شاعر بڈھا ہوتا جاتا ہے کلام جوان ہوتا جاتا ہے مگر یہ واقعہ نہیں ہے شاعر اور مفکر دونوں کا کلام عمر کی پختگی کے ساتھ پختہ ہوتا ہے۔ عموماً جوانی میں صنائع و بدائع اور بڑھاپے یا ادھیڑ عمر میں نغز سخن شاعر کے فکر کا خاصہ ہوتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض طبیعتوں میں شباب میں اور بعض میں عمر کی پختگی پر روانی اور آمد بڑھتی ہے۔ مہاراج بہادر کی طبیعت میں پہاڑی چشمہ کا سا بہاؤ تھا کہ جس سے ہمیشہ

صاف اور نتھرا ہوا پانی اُبلتا رہتا ہے۔ ان کے کلام میں اول سے آخر تک موتی کی سی آب پائی جاتی ہے۔ اگر انھوں نے پھولوں کی دنیا سے صفحۂ قرطاس کو سجایا تو اس طرح کہ پھولوں کے رنگ و بو اور پھولوں کی پتیوں کی نزاہت قائم رہی اور اگر جگنوؤں کی دھوپ چھاؤں پر نظر ڈالی تو بجلی کے ٹھنڈے شرر قائم رکھے۔ قدرت کے مناظر کی تصویریں کھینچیں تو ایسے پُراسرار تو تازہ سے رنگ بھرے کہ سبزہ لہلہاتا، پھول کھلکھلاتے، گھٹائیں اُمنڈتیں، شبنم شعاؤں کے پروں پہ اُڑتی اور مرغانِ چمن بزمِ طرب آراستہ کرتے نظر آتے تھے۔

بایں ہمہ ان کا دل نوا ہائے راز کا متلاشی تھا جن کی نسبت ہر حقیقی شاعر بلا ضرر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کائنات کا ہر حجاب حقیقت شناس طبائع کے لئے ساز کا وہ پردہ ہے جو نوائے راز کے نغموں سے لبریز ہے۔

عارفانہ تجسس ہندو مفکرّوں اور شاعروں کے خمیر میں ہے۔ مہاراج بہادر مرحوم کا دامنِ خیال اس دولت سے مالا مال تھا۔ اس مجموعہ کی پہلی ہی نظم اس حقیقت کی شاہد ہے " خود شناسی " کے عنوان سے چھ بند لکھے ہیں اور دریا کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ ان چھٔ بندوں میں جو کچھ شاعر نے کہہ دیا ہے وہ ہندو مفکرّین کے فلسفہ کا خلاصہ نہیں بلکہ مذاہبِ صوفیہ کے فکر کا بھی حاصل ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

مائلِ جلوۂ مجاز نہ ہو   غافلِ چشمِ امتیاز نہ ہو

حسنِ معنی سے بے نیاز نہ ہو　　　ناشناسِ نوائے راز نہ ہو
حق رسی مدعا شناسی ہے
خود شناسی، خدا شناسی ہے

ان کے آخر زمانہ کے کلام کی کنجی اس بند میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ "ہمہ اوست" کے جرعے سے کیف اندوز ہو چکے ہیں۔ چنانچہ دوسری ہی نظم میں جو "شاعر" کے عنوان سے لکھی ہے۔ شاعر کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ

جرعہ کش ہے بیسے نور کے پیمانے کا　　　رند مشرب ہی ہمہ اوست کے میخانے کا

اور اس نظم میں مرحوم نے شاعر کی وسیع النظری، کشادہ دلی اور ہمہ گیری کا ایک اور نقشہ کھینچا ہے جو قابلِ غور ہے۔

مرتبہ دانِ الم، نبض شناسِ فطرت　　　ہمہ تن درد ہے خوگردۂ رنج و راحت
ذرہ ذرہ سے اسے ملتا ہے درسِ عبرت　　　چشمِ بینا سے ہو یہ ناظرِ بزمِ قدرت
سبق آموزِ حقیقت ہے زمانے کے لئے
خضرِ منزل ہے رہِ راست دکھانے کیلئے

ظاہر ہے کہ یہ تعریف صرف شاعر کی نہیں بلکہ ہر غور و فکر کرنے والے پر صادق آسکتی ہے مگر برق کی نگاہ میں شاعر کے دل و دماغ میں اتنی گنجائش ضروری ہے اور خود ان کا کلام اس پر کھرا کس دیتا ہے۔

اس مجموعہ کی تیسری نظم کا عنوان "رازِ آفرینش" ہے جس میں وہ ایک سوال

مرتب کرکے اس کا جواب دیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

ہوا کرتا ہے پیدا سب کے دل میں یہ سوال اکثر
نمودِ بے وجودِ عالمِ امکاں ہوئی کیونکر؟

یہ صحیح ہے کہ ہر غور و خوض کرنے والے دماغ کو اس سوال سے کسی نہ کسی صورت میں واسطہ پڑتا ہے اور عموماً نتیجہ اس سے آگے نہیں بڑھتا کہ

کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمہ را

گو جواب بہت سے دئے جاتے ہیں۔ اس سوال کو شاعر نے اور پھیلایا ہے

یہ ہست و بود کا دورِ تسلسل کب سے جاری ہے؟
یہ گلزارِ جہاں کس کا رہینِ آبیاری ہے؟
یہ خود پیدا ہوا ہے یا کوئی خلّاقِ فطرت ہے؟
کوئی جیتی شکتی ہے؟ کوئی زندہ حقیقت ہے؟

اور اس کے بعد جواب جمع کئے ہیں اور آخر میں گیتا کی تعلیم پر ٹھہرے ہیں۔

وہی ذاتِ احد روحِ رواں ہے ہر دو عالم کی
ضیا ہے ذرہ ذرہ میں اسی نورِ مجسم کی

وہی ناظر وہی منظور ہے وہ خود نظارا ہے
وہی جلوہ، وہی جلوہ نگر ہے، جلوہ آرا ہے

ہمہ اوست کا خلاصہ یہی ہے۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گِلِ کوزہ، خود رندِ سبو کش
خود بر سرِ آں کوزہ خریدار بیامد بشکست و رواں شد

پھر اسی سلسلۂ سوال وجواب اور تحیّر کے گرداب میں غوطہ زن ہوتے ہیں، اور ایک نظم "رازِ سربستہ" کے عنوان سے لکھی ہے، ایک شعر اس نظم میں خوب ہی کہہ دیا ہے۔

کارواں در کارواں آتے ہیں مہمانِ وجود
قافلہ در قافلہ جاتے ہیں ہو کر بے نمود

کونہ کونہ گوشہ گوشہ پر نگاہ ڈال کر آخر میں یہ کہتے ہیں۔

نقش بندِ بزمِ امکاں ذاتِ برحق ہے کوئی
برتر از وہم و گماں ہستیٔ مطلق ہے کوئی

خیر یہ تو مرحوم کی طبیعت کی اُفتاد تھی اور جو دماغی سفر اُنھوں نے جادۂ شاعری پر اختیار کیا تھا اس کی منزل یہی تھی۔ مگر ان کے کلام میں تنوع تھا اور اس مجموعہ میں بھی کہکشاں، بسنت، سورج مکھی، دیوالی، بچپن کی یاد وغیرہ مختلف موضوع نظموں کے موجود ہیں۔

رہیں وہ نظمیں جس میں مرحوم نے اپنے دوسرے مذہبی معتقدات باندھے ہیں وہ ایک دوسری صنف ہے۔ یہ نظمیں غالب بعض خاص خاص موقعوں اور مذہبی تیوہاروں پر فرمائش لکھی گئی ہوں گی۔ گو یہ نظمیں ہندوؤں کے لئے تو خاص

دلچسپی کا باعث ہیں مگر ہندوؤں کے علاوہ بھی سخن سنج طبائع ان نظموں سے خاص ہندو معتقدات سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

اسی مجموعہ میں مرحوم کے چیدہ چیدہ اشعار اور غزلیں بھی شریک ہیں۔ غالباً ان میں سے بعض غیر مطبوعہ ہیں ۔ اس حصہ کے لئے "باغ و بہار" عنوان تجویز کیا گیا ہے مگر شاید شاعر کے ایک شعر سے ہی عنوان تجویز کیا جاتا تو بہتر ہوتا ان کا ایک مصرعہ ہے

کہ یہ آنسو نہیں تفسیر ہے جذباتِ پنہاں کی

اس حصہ میں بیشتر اشعار اسی قسم کی تفسیر ہیں اور اس خیال سے "جذبات پنہاں" شاید زیادہ موزوں عنوان ہوتا ۔

طالب نے اس مجموعہ کی شیرازہ بندی کر کے برق کے مداحوں اور اُردو کے حامیوں پر خاص احسان کیا ہے ۔

تحریر ۲۲ ستمبر ۱۹۱۸ء

حضرتِ برقؔ اور اُردو

(از جناب خواجہ محمد شفیع صاحب بی اے، دہلوی)

خدا معلوم ہماری عقلوں پر کیوں پتھر پڑ گئے ہیں؟ ہم کیوں تخریب کے درپے بنی ہوئی عمارت ڈھانے پر کمر بستہ ہیں؟ بڑوں نے جو محل تیار کئے تھے اُن کی اینٹ سے اینٹ بجانے پر تلے بیٹھے ہیں۔

کاخِ اُردو ہندو مسلمانوں نے مل کر تیار کیا تھا۔ سرشارؔ و نسیمؔ نے غالبؔ کے دوش بدوش کام کیا۔ داغؔ نے نئی داغ بیل ڈالی تو برقؔ نے عمارت کو جگمگا دیا۔ ہمارے بڑوں نے خون پسینہ بہا کر یہ محل کھڑے کئے تھے۔ ہم ان پر پھاوڑے لئے کھڑے ہیں۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔

موجودہ فضا میں جب ہم اُردو کے ماضی پر نگاہ ڈالتے ہیں اور حضرتِ برقؔ جیسی ہستیاں نظر آتی ہیں تو ڈھارس بندھتی ہے کہ شاید مستقبل بھی روشن ہو اور یہ فضائے افتراق دور ہو جائے۔

راقم الحروف کا حضرت برقؔ کی بابت کچھ کہنا اس کے مرادف ہے کہ شرارہ برقؔ کا تعارف کرائے۔

دیوانِ قضا نے صحیفۂ حیات اس درجہ غیر منظّم رکھا کہ نظم کی نوبت ہی نہ آئی۔

حوادثِ روزگار بقضائے یکدگر کچھ ایسے مسلسل آئے کہ ردیفِ غم مرادفِ حیات ہوکر رہ گئی مطلعِ زندگی گریباں دریدہ اور مقطعِ حیات غروب نفوس پر خونچکاں نظر آیا۔

نہ شعر کا شعور رکھتا ہوں۔ نہ شعر گوئی میرا شعار۔ شاعرِ ازل کا ایک مصرعہ ہوں وہ بھی وزن سے گرا ہوا۔

ربعِ مسکون نے سکون نہ دیا کہ رباعیِ حیات تکمیل پاتی جرعہ ریزیِ فلک نے ترجیع بند کی توفیق نہ دی۔

قصیدہ کے قصد سے سدا گریز رہا۔ دست بدعا ہوں کہ برق کا آئینہ دار بنوں اور بن سکوں۔

آتشِ گل کا قرب قطرۂ شبنم کو رنگِ شرر بخشتا ہے۔ شاید اس درخشندہ ہستی سے انتساب اس ذرۂ بے بنیاد کو تابندہ کردے۔

عرصۂ ادب میں شاید ہی کوئی میدان ایسا ہو جو اس برق رفتار کی جولانگاہ نہ رہا ہو، یہ جہاں گیا اپنی چمک دمک دکھاتا نظروں کو خیرہ کرتا دلوں اور دماغوں پر رنگ جماتا چلا گیا۔

یہ الفاظ و معانی کا معمار نہ صرف صفحۂ قرطاس پر عمارتیں بناتا تھا بلکہ عالمِ تقریر میں بھی اپنے لئے ایک مقام عالی چھوڑ گیا ہے۔ آج بھی سری چتر گیت سبھا کو اس چتر کار کے کارنامے یاد ہیں۔

محروم بھی اخلاق حمیدہ سے محروم نہ رہے۔ اعترافاً کہتے ہیں۔

برنگِ کاہ کھچ کر برق کی جانب گئے دہلی — مگر ان کو جذبِ الفت میں شامل کہربا دیکھا

دلِ محروم نازاں ہے کہ جن سے راہ تھی اس کو

انہیں سرتا قدم مجموعۂ صدق و صفا دیکھا

وسعتِ اخلاق اور کثرتِ احباب کے باوجود دامانِ برق پر نہ کسی کا ہاتھ پڑ سکتا تھا نہ چھینٹا۔

حیف کہ حیاتِ برق مثلِ شرر ایک جھلک دکھا، عالم کو جگمگا پھر تیرہ و تار کر گئی۔

کیا اعتبارِ زندگیٔ مستعار کا

یہ آنی جانی ہے۔ دو روزہ زندگانی ہے۔ یہاں کی ہر چیز فانی ہے جو آیا ہے اسے جانا ہے۔ جو پیدا ہوا اسے مرنا ہے۔ مرگ و زلیست لازم و ملزوم ہیں برقِ حیات و ابرِ مرگ اصل میں توام ہیں۔ مبارک ہے وہ ہستی جو مثلِ برق مسکراتی گذر گئی اور عالم کو مثلِ سحاب اشک افشاں چھوڑ گئی۔

اہلِ نام و نشاں نہیں رہتے۔ نام رہجاتا ہے۔ انسان نہیں رہتا، کام رہ جاتا ہے

نوشتہ باند سیہ بر سپید — نویسندہ را نیست فردا امید

برق بھی اپنی تجلیات چھوڑ مرا جو آج تک اس خاکدان کو روشن کر رہی ہیں۔

باخبر اہل الرائے سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ برق میدانِ غزل میں بھی ابتذال سے داماں کشیدہ جاتا ہے۔

کیفیت یہ ہے کہ اکثر غزل گو شعرا اپنے اشعار کو نثر کر کے اپنی ماں بہنوں میں پڑھنے کی جرأت نہیں کر سکیں گے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ جب بہ شکلِ نثر وہ مضمون مبتذل سمجھا جاتے تو بشکلِ نظم اسے کس طرح جائز رکھا اور سراہا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی قوم کی شاعری کو اچانک اس ڈھنگ پر لایا جائے تو دماغ نفرت کریں گے اور برداشت کرنے سے انکار۔ لیکن ہمارے ادب میں یہ زہر آہستہ آہستہ داخل کیا گیا۔ حتیٰ کہ دماغ اس کے عادی ہو گئے اور قوم کے احساسات کند۔ رفتہ رفتہ بجائے نفرت کے رغبت پیدا ہو گئی۔ ادب ملک و قوم کی آبیاری کرتا ہے۔ زمین اور تخم اپنا کام کرتے ہیں۔ لیکن پانی زمین تک کی خاصیت بدل دیتا ہے۔

ہمارے ادب میں ابتذال آیا، طبیعتیں رکاکت پسند ہوتی چلی گئیں۔ غنیمت ہیں وہ ہستیاں اور مغتنم ہیں وہ لوگ جو اس گمراہ کن ڈگر سے بچ کر صراطِ مستقیم پر گامزن ہوئے۔

برقؔ کے ہاں ہم اکثر و بیشتر تصوف کا رنگ پاتے ہیں، اس قبیل کے شعرا میں چند کلیم ہیں اور اکثر کو صرف شرفِ نظارہ حاصل ہے۔ مدعا یہ کہ تصوف نگار شعرا میں خدا نظر تو سب کو آتا ہے لیکن بعض سے کچھ کہہ کر بھی جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر خدا مجھے ہر وقت نظر آتا رہے اور راہ نہ بتائے تو

میری ناچیز رائے میں اس کا نظر آنا اور نہ آنا یکساں ہے۔ جیسے کنتھا دیس رہے ویسے ہی رہے بدیس۔ معشوق جو بات نہ کرے وہ تصویر کے مرادف ہے جس کو کچھ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

ملک و ملت کو زیادہ تر ان تصوف گو شعراء کی ضرورت ہے جو کلیم بھی ہوں جو ہم تک کوئی پیغام پہنچائیں کچھ راہ بتائیں۔

تحریر۔ ۹ فروری ۱۹۴۱ء

باب دوم

پیش لفظ

"حرفِ ناتمام" پر روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات کے علاوہ مختلف ادبی رسائل و جرائد میں جس قدر تبصرے نظر سے گزرے، وہ سب کے سب اس باب میں شامل ہیں۔ ان کے مطالعے سے اُستاذی مرحوم کے مرتبۂ شعری اور ان کی ادبی عظمت کا صحیح احساس و اندازہ ہو جاتا ہے۔

اس ضمن میں ان مخلص احباب کا سپاس گزار ہوں جنہوں نے میری کوششوں کو قابلِ اعتنا سمجھا اور اپنے موقر پرچوں میں اظہارِ رائے کی زحمت گوارا فرمائی۔

گرشن دہن کا سال اشاعت اور میری شعر گوئی کی ابتدا کا سال ایک ہی ہے، یعنی ۱۹۲۷ء۔ مطلع انوار ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا جب ہی مجھے اس

روز بہ کی خبر تھی اور نہ ہی اس وقت اتنی تمیز کہ ان شاندار اور قابلِ قدر تبصرات کو جمع کرتا جو ان مذکورہ بیش بہا ، گرانقدر تصانیف کے سلسلے میں جا بجا شائع ہوئے ۔ آج ان سب کا اکٹھا کرنا گویا جوئے شیر لانا ہے ۔ لہٰذا اب جو کچھ ہے اور جیسا کچھ ہے بلا کم و کاست نذرِ اربابِ ادب ہے ۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

طالب ۔ دہلوی

اتالیق۔ لاہور۔ ماہ فروری ۱۹۴۲ء

افتخار الشعرا سورگیہ منشی مہاراج بہادر برق دہلوی ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ گو وہ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں اور انہیں ہم سے بچھڑے کئی سال گذر چکے ہیں لیکن بطور ایک شاعر کے وہ آج بھی زندہ ہیں۔ ایک معیاری غزل گو ہونے کے علاوہ آپ کی خاص خوبی یہ تھی کہ آپ دہلی کی ٹکسالی زبان میں بہترین نظمیں کہتے تھے۔ ان کے فن کا کمال اس حقیقت میں مضمر تھا کہ وہ جس موضوعِ سخن پر قلم اٹھاتے تھے، اسی میں رنگینی بھر دیتے تھے۔ ادبی حلقوں اور اپنے ہمعصر شعرا میں وہ بے حد ہر دلعزیز تھے جس کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں جب آپ عین عالم شباب میں اس جہان فانی کو چھوڑ کر چل بسے تو تمام بلند پایہ شعراء نے ان کے مرثیے لکھے۔

آپ کے کلام کا ایک مجموعہ ان کی زندگی میں 'مطلع انوار' کے نام سے شائع ہوا جسے انہوں نے خود مرتب کیا تھا 'کرشن درپن' میں مختصر نظمیں ہیں جو اُن کی حیات میں شائع ہوئیں لیکن اُن کا باقی بہت سا کلام غیر مطبوعہ تھا یا مختلف اخباروں میں چھپا تھا اور آج تک کتابی صورت میں نہیں آیا تھا۔ اُن کے شاگرد رشید حضرت ستیش چندر طالب دہلوی نے اُن کے کلام کا ایک اور مجموعہ 'حرفِ ناتمام' کے نام سے شائع کر کے اُردو ادب پر بھاری احسان

کیا ہے۔ اس میں برق صاحب کی بہت سی نظمیں اور چند غزلیات شامل ہیں، نیز ان کی وفات حسرت آیات پر مختلف شعراکی جانب سے لکھے گئے۔ تقریباً تمام مرثیے اور تاریخیں بھی درج ہیں۔ شروع میں برق صاحب اور اُن کے کلام کے متعلق حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی، علامہ کیفی دہلوی، حضرت خواجہ حسن نظامی ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، مسٹر آصف علی بیرسٹر ایٹ لا ایل اے وغیرہ کے نہایت ہی مدلل مقالے بھی درج ہیں۔ برق صاحب کی نظموں میں ہندوانہ رنگ نمایاں ہے اور وہ ملک کے تہواروں اور دیگر ملکی تقاریب پر موزوں کی گئی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ خوب ہے۔ لکھائی، چھپائی اعلیٰ۔ کاغذ بڑھیا۔ ضخامت ۲۵۴ صفحہ برق صاحب کا فوٹو بلاک بھی ہے۔ ٹائیٹل اور جلد بھی خوبصورت ہے۔

اُدیب۔ دہلی۔ ماہ جنوری ۱۹۳۲ء

"حرفِ ناتمام" منشی مہاراج بہادر برق دہلوی مرحوم کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے جسے مسٹر شیش چندر کسینہ طالب۔ بی اے دہلوی نے حال ہی میں شائع کیا ہے سائز ۲۰×۲۲/۱۶ صفحات ۲۵۴ قیمت عہ۔ علاوہ محصول ڈاک۔

اس کتاب کے شروع میں پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی اور خواجہ حسن نظامی صاحب کے ریویو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پنڈت جی ریویو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "اُن کی شاعری بھی غزل سے شروع ہوئی اور انکی نظموں

اور منظریہ کلام میں بھی غزل کا رنگ اور اسلوب غالب پایا جاتا ہے اور اس میں ان کے فن کا کمال مضمر ہے۔ وہ ہر موضوع سخن میں رنگینیٔ ادا بھر دیتے ہیں۔ تخیل بلند ہے مگر با در ہوا نہیں۔ اُن کے تخیل کے پاؤں زمین پر رہتے ہیں، اکھڑتے نہیں۔ اُن کا قلم اور جذبات دونوں نظم اور انضباط کے ہم آہنگ ہیں۔

"آزاد" کانپور۔ مورخہ ۳ جنوری ۱۹۴۲ء

"حرفِ ناتمام" منشی مہاراج بہادر صاحب برق دہلوی کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے جسے مسٹر شیش چندر طالب بی۔ اے نے اس نام سے شائع کیا ہے برق صاحب ایک قادر الکلام اور پرگو شاعر تھے۔ ان کی ہر نظم میں بندش کی چستی، تخیل کی بلندی، زبان کی پاکیزگی اور بیان کی ندرت موجود ہے۔ ہندو دیوتاؤں اور مشاہیر کے متعلق انھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں، وہ خاص طور پر زوردار اور قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کے کلام کا پہلا مجموعہ "مطلع انوار" مقبولِ عام ہو چکا ہے اسی پایہ کی نظمیں اس مجموعہ میں شامل ہیں جو اب تک ملک کے مختلف رسالوں میں پھیلی پڑی تھیں۔ ہمیں مسٹر طالب کا شکر گذار ہونا چاہیے جنھوں نے کاغذ کی ناقابلِ بیان گرانی کے باوجود انھیں یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔

کتاب کے شروع میں پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، حضرت خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی۔ لٹ۔ مسٹر

آصف علی بیرسٹر ایم۔ ایل اے، خواجہ محمد شفیع دہلوی کے دیباچے ہیں۔ شروع میں "معروضات" کے عنوان سے طالب صاحب نے خود بھی ایک پُر مغز مقالہ لکھا ہے۔

الہام دہلی۔ ۲۲ر فروری سنہ ۱۹۴۲ء

"حرفِ ناتمام" میں چھیالیس نظمیں مختلف موضوعات پر ہیں جن میں بیشتر مذہبی اور چند قومی و ادبی ہیں۔ غزلیات کا انتخاب بھی کافی مندرج ہے۔ برقؔ آنجہانی کی تصویر کے ساتھ آپ کے خط کا نمونہ بھی زیبِ مجموعہ ہے۔

علامہ کیفی دتاتریہ۔ آغا شاعر دہلوی۔ مسٹر آصف علی اور خواجہ محمد شفیع کے مقدمے، دیباچے اور تصانیف حضرتِ برقؔ کی پاکیزہ شاعری اور مضبوط کیرکیٹر پر قابلِ اعتنا روشنی ڈالتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ برقؔ فطرتِ شاعرانہ اور ذہانت و وکاوت میں کسی سے کم تھے۔ مضامین کی تازگی، بیان کی شگفتگی زبان کی پاکیزگی اور کلام کی پختگی غرض یہ تمام خوبیاں مہاراج بہادر برقؔ کو معیاری شاعر اور صحیح منصب کا مستحق قرار دیتی ہیں۔

"برقِ جہندہ" کے زیرِ عنوان ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم اے۔ پی۔ ایچ ڈی پنجاب یونیورسٹی نے حرفِ ناتمام کے صفحہ ۱۴ پر ایک مقالہ حوالۂ قلم کیا ہے، تعجب ہے کہ طالب صاحب نے اس قدر تعصب سے لبریز اور مذہبی انانیت کے رنگ پر

رنگا ہوا مضمون کیوں اس خالص ادبی مجموعہ میں شامل کر دیا۔ طالب صاحب اس مضمون کو شیریں آموز تلخ گوئی کہہ کر عہدہ برآ نہیں ہو سکتے جبکہ ملک میں چند دیوانے اپنے ذاتی مقاصد اور مصلحت وقت کے تحت اُردو کے خلاف زہر اُگل اُگل کر ہندو مسلم نزاع چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کو شاید ابھی تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ زندۂ جاوید اور سب سے بڑا شاعر وہ ہے جو مذہب و ملت کی تعصبی فضا سے بہت بلند ہو کر شعر کہے اور وہ شعر جو بنی نوع انسان کی فطرت کا ترجمان اور اس کے حصولِ مقاصد کا پیغام ہو۔ مذہبی شاعری بترکاً و تیمناً ہوتی ہے نہ کہ اسرارِ فطرت اور مناظرِ قدرت کی آئینہ دار۔ جن لوگوں کے دلوں میں جناب برقؔ کی وقعت اور ادبی عظمت کا احساس ہے، وہ اس بے سر و پا مضمون کو پڑھ کر کیا سبق لیں گے۔

مجموعہ ہذا صوری و معنوی تمام خوبیوں سے مملو ہے۔ شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے قارئینِ الہام کو چاہیے کہ اسکا مطالعہ ضرور کریں، اور مستفید ہوں۔ شہابؔ دہلوی۔

'پارس' لاہور۔ مورخہ ۷ / جنوری ۱۹۴۲ء

افتخار الشعرا مرحوم منشی مہاراج بہادر برقؔ دہلوی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ایک معیاری غزل گو ہونے کے علاوہ آپ دہلی کی ٹکسالی زبان میں

بہترین نظمیں کہنے کے لیے خاص شہرت رکھتے تھے اور اُن کے کلام کو آج تک ادب نواز حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اُن کے فن کا کمال یہ تھا کہ وہ ہر موضوعِ سخن میں رنگینی بھر دیتے تھے۔ اُن کے کلام کی اہمیت اور ہر دلعزیزی کا اسی چیز سے بہتر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں جب آپ نے انتقال فرمایا تو ملک کے تمام بلند پایہ شعراء نے ان کے ماتم میں نظمیں لکھیں۔

اُن کے کلام کا ایک مجموعہ اُن کی زندگی میں مطلع انوار کے نام سے شائع ہوا نیز اُن کی چند نظمیں "کرشن درپن" بھی اشاعت پذیر ہوئیں لیکن ان کا باقی کلام آج تک کتابی صورت میں نہیں آیا تھا۔ یہ امر موجبِ مسرت ہے کہ اُن کے شاگردِ رشید حضرت ششی چندر طالب بی اے دہلوی نے ایک اور مجموعہ حرفِ ناتمام کے نام سے شائع کیا ہے جس میں برق صاحب کی بہت سی نظموں کے علاوہ چند غزلیات بھی شامل ہیں۔ ان نظموں میں ہندوانہ رنگ نمایاں ہے اور وہ مختلف تہواروں اور موقعوں پر موزوں کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ برق صاحب کی وفات حسرت آیات پر مختلف شعرا نے جو مرثیے لکھے ہیں وہ بھی اس مجموعہ میں درج ہیں شروع میں برق صاحب اور ان کے کلام کے متعلق حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی، علامہ عصر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، مصورِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، مسٹر آصف علی ایم ایل اے وغیرہ کے مقالات بھی دیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ہر ادب نواز شخص کی میز پر ہونی چاہیے۔ کتابت، طباعت،

نہایت اعلیٰ ہے کاغذ سفید عمدہ ۔ ۲۰۵ صفحات ۔ اس کے علاوہ برقؔ صاحب کی ایک عکسی تحریر بھی دی گئی ہے۔

روزانہ "تیج" دہلی ۔ مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۴۱ء

افتخار الشعرا منشی مہاراج بہادر برقؔ مرحوم کا ایک مجموعہ کلام "مطلع انوار" کے نام سے اُن کی زندگی میں شائع ہو کر دنیائے ادب میں بہت مقبول ہوا۔ دوسرا مجموعہ وہ اپنی زندگی میں شائع نہ کر سکے۔ ان کا انتقال ایسے غیر متوقع وقت پر ہوا کہ خدمتِ ادب کی بہت سی آرزوئیں اُن کے دل ہی دل میں رہ گئیں۔ اگرچہ اس کی صلاحیت ان میں بدرجۂ اتم تھی۔ ہمیں خوشی ہے کہ برقؔ مرحوم کے عزیز اور تلمذ جناب ستیش چندر صاحب طالبؔ دہلوی نے بڑی محنت سے اُن کا بقیہ کلام جمع کر کے شائع کیا ہے اور اسکا نام "حرفِ ناتمام" رکھا ہے۔ حرفِ ناتمام پر بڑے اعلیٰ پایہ ادیبوں کے لکھے ہوئے دیباچے ہیں۔ علامہ عصر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفیؔ، محبِ وطن مسٹر آصف علی ممبر مرکزی اسمبلی، خواجہ حسن نظامی صاحب، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اور خواجہ محمد شفیع دہلوی سے اپنے اپنے انداز میں خوب لکھا ہے۔ اگرچہ ہمیں خواجہ حسن نظامی صاحب کے بعض جملوں اور ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کے بعض نظریوں سے اختلاف ہے۔ معروضات کے عنوان سے جناب طالبؔ کی بھی ایک تحریر ہے۔ جہاں تک برقؔ کے کلام کا تعلق ہے

ادبِ اُردو سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ وہ صفِ اول کے شاعروں میں تھے۔ نظم اور غزل کہنے میں یکساں قادر الکلام تھے۔ بندش کی چستی، تشبیہات کی نُدرت، جدتِ ادا، کلام کی دلاویزی، زبان کی روانی، محاوروں کی سلاست، تخیل کا اعجاز، محاکات کا کمال، سب کچھ ان کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ نثر کی عبارت کے علاوہ موجودہ مجموعہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ آخر میں جناب برقؔ کے چند مرثیے درج ہیں۔

کتابت کی لکھائی، چھپائی دیدہ زیب، کاغذ سفید اور بہتر ہے۔ جناب برقؔ کی ایک عکسی تحریر اور ایک فوٹو بھی ہے۔ کتابت میں جو کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں ان کا صحت نامہ آخر میں دے دیا گیا ہے۔

"تیج ویکلی" دہلی۔ مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۴۱ء

افتخار الشعراء منشی مہاراج بہادر برقؔ مرحوم کا ایک مجموعہ کلام "مطلع انوار" کے نام سے اُن کی زندگی میں شائع ہو کر دُنیائے ادب میں بہت مقبول ہوا۔ دوسرا مجموعہ وہ اپنی زندگی میں شائع نہ کرا سکے اور خدمتِ ادب کی بہت سی آرزوئیں اُن کے دل ہی دل میں رہ گئیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ برقؔ مرحوم کے عزیز اور تلمیذ جناب شیش چندر صاحب طالبؔ دہلوی نے بڑی محنت سے اُن کا بقیہ کلام جمع کر کے شائع کیا ہے اور اس کا نام "حرفِ ناتمام" رکھا ہے۔ "حرفِ ناتمام" بڑے اعلیٰ پایہ کے

ادیبوں کے لکھے ہوئے دیباچے ہیں۔ علامۂ عصر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی محبّ وطن مسٹر آصف علی ممبر مرکزی اسمبلی، خواجہ حسن نظامی صاحب، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اور خواجہ محمد شفیع دہلوی نے اپنے اپنے انداز میں خوب لکھا ہے بمعروضات کے عنوان سے جناب طالب کی بھی ایک تحریر ہے جہاں تک برق کے کلام کا تعلق ہے ادب اُردو سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص جانتاہے کہ وہ صف اول کے شاعروں میں سے تھے۔ نظم اور غزل کہنے میں یکساں قادر الکلام سے تھے۔ بندش کی چستی، تشبیہات کی ندرت، جدّت ادا۔ کلام کی دلآویزی، زبان کی روانی، محاوروں کی سلاست، تخیل کا اعجاز، محاکات کا کمال سب کچھ ان کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ نثر کی عبارت کے علاوہ موجودہ مجموعہ ۰۰ ۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ آخر میں جناب برق کے چند مرثیے درج ہیں۔

کتاب کی لکھائی، چھپائی دیدہ زیب کاغذ سفید دبیز ہے۔ جناب برق کی ایک عکسی تحریر اور ایک فوٹو بھی ہے

ہماری زبان، دہلی۔ مورخہ یکم اپریل سنہ ۱۹۴۲ء

حرفِ ناتمام، منشی مہاراج بہادر برق دہلوی کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے غزل کے سوا مختلف موضوعوں پر بھی بہت اچھی نظمیں ہیں۔ برق پختہ اور شگفتہ شاعر تھے

شروع میں جناب کیفی، خواجہ حسن نظامی، مسٹر آصف علی اور خواجہ محمد شفیع کے دیباچہ ہیں اور آخر میں ایک حصہ بزم ماتم ہے جس میں برق کے قدردان شعرا نے ان کے مرثیے لکھے ہیں۔ یہ کلام ششی چندر سکسینہ طالب دہلوی نے مرتب کیا ہے۔

ہمایوں۔ لاہور۔ جون ۱۹۴۲ء

حرفِ ناتمام منشی مہاراج بہادر برق دہلوی مرحوم کا مجموعہ کلام ہے۔ برق کے کلام میں بقول علامہ کیفی ہر قسم کے موضوع ملتے ہیں۔ داخلی بھی اور خارجی بھی۔ وہ تخیل پردازی اور منظر نگاری دونوں میں برق تھے ان کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان تھی۔ ہندو تہذیب اور ہندو تاریخ سے متعلق برق نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ حرفِ ناتمام کے شروع میں علامہ کیفی، خواجہ حسن نظامی، مسٹر آصف علی، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اور خواجہ محمد شفیع دہلوی کے دیباچے شامل ہیں۔

رہنمائے تعلیم۔ لاہور۔ جون ۱۹۴۱ء

(ایڈیٹر ابوالفصاحت جناب پنڈت لبھو رام صاحب جوش ملسیانی کے قلم معجز رقم کا رہینِ منت ہے)

منشی مہاراج بہادر برق دہلوی مرحوم کی

مشہور تصنیف 'مطلع انوار' تو ان کی
زندگی میں ہی اشاعت پذیر ہو کر دنیائے ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی
تھی۔ اُن کی وفات کے بعد یہ دوسرا مجموعۂ کلامِ برقؔ مرحوم کے عقیدت مند
شاگرد شیش چندر سکسینہ طالبؔ بی اے دہلوی نے شائع کیا ہے۔ ضخامت ۲۰۸
صفحات کی اور قیمت ۸ہے۔ برقؔ صاحب کو اپنی ناگہانی اور بے وقت
وفات کی وجہ سے یہ موقع ہی نہ مل سکا تھا کہ وہ اپنے منتشر کلام کو ایک
جگہ جمع کر سکتے۔ اس مجموعہ کو جو ابھی مکمل نہیں کہا جا سکتا چھ سال کے بعد
شائع کرنے کے قابل ہونا اُن مشکلات کا تصور دلاتا ہے جو اس منتشر کلام
جمع کرنے کی دوڑ دھوپ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ طالبؔ صاحب
نے حرفِ ناتمام کی اشاعت سے اپنی عقیدت مندی اور اخلاص و ارادت کا
حق ادا کر دیا ہے۔

پہلے حصہ میں ۸۲ صفحہ تک مختلف عنوانوں کے ماتحت نہایت فصیح و
بلیغ نظمیں ہیں۔ بعض عنوان بالکل نئے ہیں۔ مثلاً مہارانا پرتاپ اور بادفاجیک
راجہ امج کا ولاپ، تلا دان وغیرہ۔ بعض نظمیں ہنگامی تاثرات پر مبنی ہیں۔ مثلاً
زلزلے کی تباہ کاریاں، گرمی کی شدت۔ بعض عنوان مناظر سے تعلق
رکھتے ہیں۔ مثلاً بسنت، کہکشاں، نورانی کلیاں یا ستارے۔ الغرض
اس حصہ میں تنوع کا عالم پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ہر نظم کے

اخیر میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ یہ نظم کہاں سے دستیاب ہوئی اور کب شائع ہوئی۔ دوسرے حصہ میں جس کا نام "باغ و بہار" ہے، غزلیات ہیں۔ کوئی غزل سالم ہے، کسی کے دو شعر ہیں۔ کسی کے تین اور کسی کے چار یعنی اپنی یا کسی اور صاحب ذوق کی یادداشت سے جو کچھ ملا ہے، اُسے طالب صاحب نے دامن نیاز میں جگہ دی ہے۔ لطف زبان اور حسن بیان کے لحاظ سے یہ حصہ بھی بہت قابل قدر ہے بعض اشعار ملاحظہ ہوں:-

رہیگا کس کا حصہ بیشتر میرے مٹانے میں
یہ باہم فیصلہ پہلے زمین و آسماں کرلیں

محبت میں ہتھیلی پر جو رکھ کر سر نکلتے ہیں
وہی جانباز راہِ عشق میں کچھ کر نکلتے ہیں
چلو پھر رتؔق میخانے چلیں پھر توڑ لیں توبہ
ابھی تو اپنے ہی کچھ دام ساقی پر نکلتے ہیں

آئے ہیں وہ کھینچکر مقتل میں تیغ آبدار
سر اونچا اب نظر آنے لگا پانی مجھے

نگاہوں ہی نگاہوں میں ہوا عہد وفا باہم
ہوا طے مرحلہ دل کا اشاروں ہی اشاروں میں

اہلِ ذوق اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ اشعار کس پایہ کے ہیں اور ان کا مصنف میدانِ غزل کا کیسا شہسوار ہے۔ چونکہ اس مجموعۂ کلام کا بہت سا حصّہ زبانی یادداشت سے حاصل کیا گیا ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ بعض اشعار میں کسی کے حافظے نے بے وفائی کی ہو۔ صفحہ ۸۳ پر ایک مصرع اسی قسم کی فروگزاشتوں کی ایک مثال ہے۔ ع

دم بخود آشیاں برباد رہا کرتے ہیں

لفظ "آشیاں" کی تخفیف کا الزام برقؔ صاحب پر عائد کرنا فاضل مصنف اور ان کے عقیدت مند شاگرد سے بے انصافی کرنے کے مترادف ہے۔ قیاس غالب یہی ہے کہ برقؔ صاحب نے یہ مصرع اس صورت میں ہرگز نہ کہا ہوگا۔ اسی قسم کی بعض مثالیں اور بھی ہیں مگر ان کی تعداد بہت قلیل ہے۔

تیسرا حصہ بزمِ ماتم کے نام سے صفحہ ۱۳۱ سے شروع ہوتا ہے۔ اس حصہ میں وہ قطعاتِ تاریخ اور ماتمی نظمیں ہیں، جو مختلف شعرا نے برقؔ صاحب کی بے وقت موت پر لکھیں۔

چوتھے اور آخری حصے کا نام باب نو ہے۔ اس حصے میں بھی مختلف عنوانوں پر نظمیں ہیں۔ مثلاً "تباہی کا سیلاب"، "جشنِ چراغاں"، "بسنت رت"، "تنوع کا عالم"۔ اس حصہ میں بھی وہی ہے جو پہلے حصہ میں تھا۔ دلکش بیانی کے لحاظ سے یہ نظمیں بھی کامیاب ہیں۔

مختصر یہ کہ حرفِ ناتمام حُسنِ ظاہر و حُسنِ باطن کے اوصاف کی وجہ سے بہت قابلِ قدر ہے۔ مصنف کا نام نامی اس مجموعۂ کلام کے جاذبِ توجہ ہونے کی کافی ضمانت ہے۔ امید ہے کہ اربابِ ذوق حرفِ ناتمام کی قدر شناسی کی صورت میں طالبؔ صاحب کی محنتِ شاقہ کی داد دیں گے۔

"زمانہ" کانپور۔ اپریل ۱۹۴۲ء

"حرفِ ناتمام" اردو کے نامور شاعر منشی مہاراج بہادر برقؔ دہلوی کی نظموں اور غزلوں کا تیسرا مجموعہ ہے جسے مسٹر ستیش چندر طالب دہلوی نے فراہم کر کے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔ کلامِ برقؔ کے دو مجموعے "مطلعِ انوار" اور "کرشن درپن" اس سے قبل شائع ہو کر مقبولِ عام ہو چکے ہیں۔ برقؔ صاحب کی شخصیت یا ان کی شاعری کسی تعریف و تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کا شمار زمانۂ حال کے نغز گو اور سحر طراز شعرائے اردو میں ہے۔ ذوقِ سخن انھیں ورثہ میں ملا تھا وہ ایک کہنہ مشق سخنور اور پُر گو شاعر تھے ان کا قلم ہر صنفِ سخن پر حاوی تھا۔ خصوصاً قومی، ملکی اور مذہبی شاعری میں تو آپ کی شاعری درجۂ کمال کو پہنچ گئی تھی۔ آپ کی نظموں کی زبان فصیح اور ٹکسالی ہوتی ہے۔ الفاظ سلیس، ترکیبیں چُست اور تخیل بلند ہے۔ شاعرانہ حیثیت سے وہ ادراک اور احساس دونوں قوتوں سے کام لیتے ہیں

جب محسوسات کی آئینہ بندی پر اترتے ہیں تو مناظر کی چلتی پھرتی تصویریں کھینچ کر نظروں کے سامنے لے آتے ہیں۔ مثلاً کہکشاں کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

کہکشاں ہے یا فلک پر جادۂ زریں ہے یہ
بحرِ اخضر میں کوئی یا موجِ نورآگیں ہے یہ
یا لباطِ آسماں پر جدولِ سیمیں ہے یہ
شکل بستہ یا فروغِ جلوۂ سیمیں ہے یہ
پارہ ہائے نور کا یا آتشیں گلزار ہے
جو فرازِ چرخِ گرداں سی تجلی بار ہے

دوسرے بند کی ٹیپ ملاحظہ ہو۔

بجلیاں سی کوندتی ہیں خرمنِ سیماب میں
یا چراغاں سا ہے عالم نور کے سیلاب میں

منظر نگاری کا مزید کمال دیکھنا منظور ہو تو ان کی نظمیں "سورج مکھی کا پھول" "بسنت"، "دیوالی"، "نورانی کلیاں یا ستارے"، "جشنِ چراغاں"۔ ملاحظہ فرمائیے جو اس کتاب میں موجود ہیں۔ اس مجموعے میں برق صاحب کی کئی قومی اور مذہبی نظمیں بھی ہیں۔ مثلاً "کرشن اوتار"۔ "مہارانا پرتاپ" اور "وفا چیتک بھارت ویر سپھدار ہیم چند"۔ "دروپدی کا چیر"۔ "پنج وٹی کا بلیدان"۔ "راجہ آج کا ولاپ"، "اشوک بن میں"، "گورو گوبند سنگھ" وغیرہ جنہیں پڑھ کر زندگی کی روح رگ و ریشہ میں جاری و ساری ہو جاتی ہے۔

حضرت برقؔ نے شاعر کے عنوان سے ایک نہایت پُر لطف نظم لکھی ہے جو تعریف و توصیف سے قطعی مستغنی ہے۔"رازِ آفرینش" کے عنوان سے جو نظم اس مجموعہ میں درج ہے، وہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ان نظموں کے علاوہ اس مجموعہ میں حضرت برقؔ کی کچھ غزلیں اور قطعات بھی ہیں۔ شروع میں متعدد اہلِ قلم نے مقدمے لکھکر حضرتِ برقؔ کے سوانح حیات اور ان کے کلام پر روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں برقؔ مرحوم کی نا وقت وفات پر مختلف حضرات کے قطعاتِ تاریخ، نوحے اور مرثیے ہیں۔ شروع میں حضرتِ برقؔ کا فوٹو بھی دیا گیا ہے۔ غرض ہر حیثیت سے یہ مجموعہ جو چھوٹی تقطیع کے ۲۵۴ صفحات پر چھپا ہے قابلِ قدر ہے۔

"کرم ویر" لاہور مورخہ ۱۲ر جنوری ۱۹۴۲ء

افتخار الشعراء منشی مہاراج بہادر برقؔ بی۔اے دہلوی مرحوم کا نام نامی ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ "کرم ویر" سے انھیں خاص عقیدت رہی اور اُن کا کلام بلاغت نظام اکثر ہمارے خاص نمبروں کی زینت رہا۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں اور انھیں ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑے کئی برس گذر چکے لیکن اُن کی زندہ جاوید شاعری اُن کی یاد کو

ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رکھے گی۔

آپ کی شاعری کا آغاز غزل سے ہوا لیکن جلد ہی اُنھوں نے اپنی توجہ نظم کی جانب کی۔ اُن کی زبان دہلی کی خالص ٹکسالی زبان ہے جو اپنے خاص انداز بیان اور شگفتگی کے باعث بے حد پسند کی جاتی ہے۔ آپ کی شاعری کی دو نمایاں خوبیاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے تھے اس میں رنگینی بھر دیتے تھے اور اسے اس کمال سے نبھاتے تھے کہ سُننے والے کے منہ سے بے ساختہ کلمۂ تحسین نکل جاتا تھا۔ دوسرا یہ کہ ان کی تمام شاعری ہندوانہ رنگ لئے ہوئے تھی۔ تمام اہم ہندو تہواروں اور تقاریب کے علاوہ ہندو بزرگوں، اوتاروں اور بہادروں کی شان میں اور ان کی زندگی سے متعلق جو نظمیں کہی ہیں ان میں اگرچہ سنسکرت اور ہندی کے دقیق الفاظ استعمال نہیں کئے گئے ہیں۔ تاہم یہ خوبی بھی بدرجۂ اتم قائم ہے کہ وہ ہندو تہذیب تمدن اور ہندو سوشل لائف کی صحیح ترجمانی کر رہی ہیں۔ ان کی نظمیں پڑھنے سے وہی سرور، وہی لطف حاصل ہوتا ہے جو ہندی کوتیا(۱) پڑھنے میں آتا ہے۔ پھر ان کی زبان خالص اُردو ہے۔ اس حیثیت سے اُن کے کلام میں پختگی کے علاوہ پائیداری بھی غضب کی ہے۔ اور جب تک ہندو

---

(۱) کوتیا۔ شاعری

تہذیب و تمدن زندہ ہے۔ اُن کی شاعری کو بھی عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا رہے گا۔

شاعروں کے حلقہ میں اُنھیں کسی قدر ادب اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اسکا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُن کی وفات حسرتِ آیات پر تقریباً تمام ہمعصر بلند پایہ شعراء نے مرثیے لکھے اور ملک کی ادبی دنیا میں صفِ ماتم بچھ گئی، اور ایسا محسوس کیا گیا کہ اُن کی اچانک وفات نے مشاعروں کی دنیا میں جو جگہ خالی کردی ہے وہ بڑی مشکل سے پُر ہوگی۔

برقؔ صاحب کا ایک مجموعۂ کلام 'مطلعِ انوار' کے نام سے اُن کی زندگی میں شائع ہوچکا ہے۔ نیز 'کرشن درپن' کے نام سے بھی ایک مختصر مجموعۂ کلام شائع ہوا۔ لیکن قضا نے اپنا باقی کلام کتابی صورت میں شائع کرنے کا موقعہ نہیں دیا۔ یہ امر موجبِ مسرت ہے کہ اُن کے شاگردِ رشید حضرت شیش چندر سکسینہ طالبؔ بی اے دہلوی نے نہایت محنت و کاوش سے ان کا باقی کلام 'حرفِ ناتمام' کے نام سے شائع کرکے علم و ادب پر ایک بھاری احسان کیا ہے اس میں برقؔ صاحب کی بیشمار نظمیں، چند غزلیں مختلف شعرا کے قلم سے اُن کی وفات پر لکھے گئے مرثیے نیز آپ کی شاعری کے متعلق افسرالشعراء آغا شاعر قزلباش دھلوی

علامۂ عصر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی۔ مصوّر فطرت خواجہ حسن نظامی دہلوی، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ آف پنجاب یونیورسٹی مسٹر آصف علی بار ایٹ لا۔ ایم۔ ایل اے وغیرہ مشہور ہستیوں کے تبصرے بھی دیئے گئے ہیں جو انھوں نے خاص طور پر اس مجموعہ کے ساتھ شائع ہونے کے لئے لکھے تھے۔ الغرض حرفِ ناتمام برقؔ صاحب کے کلام کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو ہر ہندو گھر، لائبریری اور ہر ادب نواز حضرت کی میز کی زینت ہونا چاہیئے۔ کتابت، طباعت نہایت عمدہ اور کاغذ سفید استعمال کیا گیا ہے۔

"نگار" لکھنؤ۔ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء

حرفِ ناتمام، منشی مہاراج بہادر برقؔ دہلوی کی غزلوں اور نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ برقؔ مرحوم دہلی کے نہایت خوش گو شعراء میں سے تھے اور نظم و غزل دونوں خوب کہتے تھے۔ اس مجموعہ میں ۳۰ نظمیں اور تقریباً ۵۰ صفحات انتخاب غزلیات کے ہیں لیکن کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذوق غزل گوئی زیادہ پاکیزہ تھا۔ ان کی غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے تھے بہت سوچ سمجھ کر کہتے تھے اور فارسی ترکیبوں کو بہت سلیقہ کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ بعض

اشعار ملاحظہ ہوں :۔

بہارِ خندۂ گُل دیدنی ہے باغ عالم میں
تماشا ہو گیا غنچہ کا شیرازہ بکھر جانا

ہمہ تن گوش ہوں سننے کو نوا ہائے دروں ٭ کونسا نغمہ ہے جو تارِ رگِ جاں میں نہیں

رہے گا کس کا حصہ بیشتر میرے مٹانے میں
یہ باہم فیصلہ پہلے زمین و آسماں کر لیں

ایک خط

محترم و مکرم بندہ۔ نمستے

حرفِ ناتمام کی ایک جلد بذریعہ رجسٹری موصول ہوئی۔ برقؔ مرحوم کی یادگارِ عزیز کو دیکھ کر دل تڑپ گیا اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ آہ! انسان کسقدر مجبور و بے بس ہے۔

آپ کی یہ محنت لائق ہزار تحسین و ستائش ہے۔ اس زمانے میں خلوص و محبت جیسے جی تک ہے اور وہ بھی کہیں کہیں۔ آپ نے لافانی اخلاص کا جو ثبوت دیا ہے اس سے انسانی نہیں ملکوتی صفات کی جھلک نظر آتی ہے ایشور آپ کو اجرِ عظیم دے۔

اس عنایت اور یاد آوری کا بہت شکریہ۔ افسوس کہ برقؔ صاحب سے

صرف تین بار مل سکا۔ دو دفعہ لاہور میں ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء میں اور ایک بار دہلی میں کرسمس ۱۹۱۶ء تھا۔ ہر بار ان کو تندرست اور تنومند دیکھا۔ تصویر میں وہ کمزور نظر آتے ہیں۔ غالباً بہت بعد کی ہے جب اُن کی صحت گر چکی تھی۔ برسوں اُن سے خط و کتابت رہی۔ اس دارِ فانی میں کسی چیز کا کیا بھروسہ۔

بندہ

تلوک چند محروم

ایک اقتباس

تاریخ وفات

از جناب منشی شنکر سروپ صاحب مفتوںؔ سکندرابادی (بلندشہر)

چل بسے دنیا سے برقِ دہلوی — شاعرِ بے مثل و شعر آگاہ آہ!

سر پٹکتے ہیں الم میں قدرداں — ہے جنوں زا صدمۂ جانکاہ آہ!

ہائے وہ اخلاق وہ لطف و کرم — ہائے وہ سیرت وہ رسم وراہ آہ!

بے بقا ہے دارِ فانی میں حیات — کیا کرے کوئی کسی کی چاہ آہ!

سالِ ہجری کی ہمیں تشویش ہے

کہہ دو مفتوںؔ تم "غمِ برق آہ آہ"

تصویرِ برق

حضرت کوکب شادانی

شرافت، حسنِ سیرت، جذبۂ ایثار، خوش خلقی — محبت، دلنشینی، پاک نفسی، خوئے لاثانی
عقیدت برہمن کی، ظاہر و باطن فرشتوں کا — وفا، اخلاص، نیکی، حبِ قومی، جوشِ ایمانی
زبانِ نغز گو، ذہنِ رسا، فکرِ فلک پیما — حقیقت روح کی، نورِ یقیں، توقیرِ انسانی
کمالِ عجز، تکمیلِ ہنر، ذوقِ ادب، جرأت — صداقت، چارہ سازی، دلدہی، وصفِ جہانبانی
سخن فہمی، سخن سنجی، تکلم کی دل آویزی — صفائی قلب کی، جوشِ حمیت کی فراوانی

یہ سب ہوں مل کے جنابِ برق کی تصویر بنتی ہے

(۲)

کوئی کہتا ہے ادائے نگہِ یار تھے برق — کوئی کہتا ہے ضیائے رخِ دلدار تھے برق
کوئی کہتا ہے کہ تھے فنِ سخن میں ماہر — کوئی کہتا ہے کہ ہاں ابرِ گہربار تھے برق
کوئی کہتا ہے کہ تھے شرم و حیا کے پتلے — کوئی کہتا ہے یقیناً گُلِ بے خار تھے برق
کوئی کہتا ہے کہ تھے مخزنِ الطاف و کرم — کوئی کہتا ہے کہ ہاں مطلعِ انوار تھے برق
کوئی کہتا ہے کہ تھے خلق و وفا کی تصویر — کوئی کہتا ہے کہ ہاں مرجعِ ابرار تھے برق
ستائش کسی انسان کی ہو سکتی ہے — یہ حقیقت ہے کہ اس سب کے سزاوار تھے برق
میرے نزدیک مگر باعثِ عزت ہے یہی — اہلِ دل، جانِ وفا، جلوۂ ایثار تھے برق

The Hindustan Times (Dated 29-12-1941)

"Harfe Na Tamam": Edited by Mr. Shish Chander Talib.

This is a posthumous compilation of the poetical works of Munshi Maharaj Bahadur Burq, the renowned Urdu poet of Delhi. Burq imparted several necessary and modern touches to modern Urdu poetry retaining at the some time its rich and traditional heritage in diction and thought. The anthology contains both long and short poems on the various aspeets of life. A seperate chapter is devoted to the Ghazals.

Mr. Asaf Ali, M.L.A. (Central) and Dr. Mohan Singh Diwana have contributed critical studies of the poet's work and style.

The National Herald, Lucknow

(By Dr. M. Hafiz Syed)

Harfe Na Tamam:- Collected Poems of Munshi Maharaj Bahadur Burq. Edited by Mr. Shish Chandra Saxena, B. A., Dayal Printing Press, Delhi (Rs. 1/8).

It is claimed in certain quarters that Urdu is the common language of the Hindus and the Muslims of the north of India. It is the out come of a common literary culture. In the early days of the development of the Urdu literature, the Muslim Poets of Urdu trod in the foot steps of Persian Poets adopting wholesale their ancestral, cultural, religious and

geographical back grounds, altogether disregarding Indian life, scenery and traditions. The Hindu Poets of Urdu unhesitatingly imitated their Muslim brother—Poets. Something better was expected of them. It is only recently that some of the Hindu Poets such as Chakbast, Nazar, Kaifi and Mulla have their inspiration from and dwelt on Hindu themes

Munshi Maharaj Bahadur Barq Dehalvi is one of the galaxy of Hindu poets whose poems have been universally appreciated by all class ofpeople. Pandit Brij Mohan Dattatriya Kaifi, Khwaja Hasan Nizami, Dr. Mohan Singh, Mr. Asaf Ali, M L.A., and Khwaja Mohammad Shafi have contributed appreciative forewords to the collection of his poems, which have been ably edited and arranged by Mr. Shish Chandra Talib, who deserves our thanks for his labour of love

Mr. Barq's poems have been written mostly on Hindu historical and religious topics such as Krishna Autar, Tula Dan, Maharana Pratap, Diwali, Ras Lila, Drupadi ka Cheer. In dealing with these themes, he has not failed to keep up the highest poetical ideals and has scrupulously adhered to the cannons of poetic art. He has used Hindi words with grace, without marring on the general effect of his Urdu poetry. His poetic style has a soul of its own and his poetic diction is full of charm and Vigour. His 'Ghazaliyats' are free from low and sordid references. He always dwell's on high themes and writes in an inspiring tone.

The collection of his poems under review deserves to be widely read

The Indian P. E. N. (August 1942)

Harfe Natamam (The unfinished word). Urdu. By Maharaj Bahadur Barq ; edited by Talib of Delhi (Shish Chandra Talib, Chawri Bazar, Gali Batasha, Delhi. Re. 1/8).

Conventional critics are fond of categorizing contemporary writers as opposing counter-Points : Dickens and Thackeray, Tennyson and Browning ! But the rivalry of the Delhi and Lucknow schools of poetry is based upon real literary differences.

In our time chakbast and Barq have been held up before us as exponents of the Lucknow and Delhi schools. The book under review, Harfe Natamam (The unfinished word), contains a representative selection of Barq's poetry. It is a collection of religious Odes, lyrical verses (ghazals) and mystic poems. Barq is a purist in form. He shuns innovations and fixes a range for himself which, though limited, brings out the best in him. He selects words with the care of a sculptor scrutinizing the veins of a block of marble: He seldom sounds a false note and though he never climbs very high, his gait is always steady.

For his philosophy of life Barq drew inspiration from the Bhagwat Gita. In his Poem "Khudshinasi" (self-knowledge) he lays stress on that dispassionate contemplation of life which is the essence of knowledge:—

کچھ اپنی طرف سے

اُستاذی مرحوم حضرتِ برقؔ کی وفات پر پہلا قابلِ ذکر اجتماع 'ہندو کالج دہلی' میں بلبلِ ہند شریمتی سروجنی نائیڈو کے زیرِ صدارت ہوا۔ اس باب میں اس جلسہ کی تفصیلات دے کر ایک پرانی یاد کو تازہ کیا گیا ہے۔

اس روئیداد کے لئے میں ادارہ "تیج" دہلی، بالخصوص

لالہ دھرمپال جی وفؔا کا ممنون و مشکور ہوں۔

طالبؔ۔ دہلوی

شاعر کسی خاص قوم یا فرقہ کی ملکیت نہیں ہوتے اور وہ کبھی نہیں مرتے

برق صاحب کے تعزیتی جلسہ میں سروجنی نائیڈو کی صدارتی تقریر

مسٹر آصف علی اور دیگر حضرات کا خراجِ عقیدت

(ماخوذ از روزانہ تیج۔ دہلی۔ مورخہ یکم مارچ ۱۹۳۶ء)

دہلی ۲۸۔ فروری۔ افتخار الشعرا جناب منشی مہاراج بہادر صاحب برق مرحوم کی تعزیت میں کل شام کو ہندو کالج ہال میں ایک جلسہ زیر صدارت شریمتی سروجنی نائیڈو منعقد ہوا جس میں شہر کے بیشتر مشہور شعرا و روساء و پبلک کارکنوں و طلباء و عوام نے شرکت کی۔

سوا چھ بجے شام کو جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ لالہ دیش بندھو جی مینجنگ ڈائرکٹر تیج نے صدر صاحبہ کا نام تجویز کرتے ہوئے فرمایا کہ جناب برق کی ہستی ایک ممتاز ہستی تھی۔ وہ مشہور ترین اردو شعرا میں سے تھے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس ماتمی جلسہ میں شرکت کے لئے سروجنی نائیڈو تشریف لائی ہیں۔ آج کے جلسہ کی صدارت کے لئے ان سے بہتر انتخاب نہیں ہو سکتا۔

جناب پنڈت امرناتھ صاحب مدن المتخلص بہ ساحر نے اس تجویز کی تائید کی اور شریمتی سروجنی نائیڈو کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئیں۔

مسٹر پالیوال کی تقریر

سب سے پہلی تقریر مسٹر برجی لال پالیوال ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کی ہوئی۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ جس زمانہ میں میں طالب علم تھا اس زمانے میں سب کالج کے اکثر شاعروں کے ساتھ برق صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا تھا چونکہ مجھے شاعری سے دلچسپی تھی، میں انہیں مدعو کرنے جایا کرتا تھا۔ یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ صفِ اول کے شاعر تھے۔ آج بائرن، کیٹس اور شیلی کا نام بہت سنتے ہیں اور ان کی شاعری پسند کی جاتی ہے لیکن برق کا کلام پڑھے تو وہ ان میں سے کسی سے بھی پیچھے نہیں ہیں بلکہ بعض اوقات آگے بڑھ گئے ہیں۔ ایسے اعلیٰ تخیل کے شاعر بہت کم ہوتے ہیں۔ ان میں نام و نمود کی خواہش نہیں تھی اور وہ گمنام زندگی بسر کرنا پسند کرتے تھے۔

حضرت قابل

حضرت قابل گلاؤٹھی نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ مجھے چند سال سے برق مرحوم سے رابطہ رہا۔ میں انہیں صرف بہ حیثیت ایک شاعر کے نہیں بلکہ بہ حیثیت ایک دوست کے بھی جانتا تھا۔ جو شخص ان سے چند منٹ کے لئے بھی ملتا تھا وہ ہمیشہ ملنے کی خواہش رکھتا تھا۔ اردو شاعری میں ان کا پایہ مسلمہ ہے۔ انکی تمام زندگی شاعری کی زندگی تھی۔

حضرت امن لکھنوی منشی گوپی ناتھ صاحب امن نے کہا کہ افسوس ہے کہ حضرت برق کو اپنی شاعری کا پورا پورا جوہر دکھانے کا موقعہ نہیں ملا۔ لوگوں کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں کہ وہ اپنی زندگی کی کشاکش یعنی ملازمت کے بارے سبکدوش ہو کر اپنا وقت خدمتِ ادب میں صرف کریں۔ ان کے ریٹائر ہونے میں ہنوز چار سال باقی تھے کہ قضا نے اُن کو ہم سے چھین لیا۔ حضرت برق کی شاعری کی قیمت چالیس پچاس سال بعد معلوم ہو گی کیونکہ بڑے آدمیوں کی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ اُن کے زمانے میں اُن کی پوری قدر نہیں ہوتی۔ حضرت غالب تک کا مشاعروں میں مذاق اُڑایا گیا۔ جنابِ برق کی نظمیں اور غزلیں اگرچہ اُن کی زندگی میں بھی بہت پسند کی گئیں لیکن اُن کا صحیح اندازہ ایک عرصہ بعد ہو سکے گا۔

پے در پے مصیبتوں نے آپ کے رنگ میں ایک خاص قسم کا درد پیدا کر دیا تھا۔ آپ اکثر احباب سے کہا کرتے تھے کہ میرا آخری وقت نزدیک آرہا ہے بالآخر وہ سچے ثابت ہوئے۔ ہم سوائے اس کے کیا کر سکتے ہیں کہ ایشور سے اُن کی آتما کے لئے پرارتھنا کریں اور اُن کے پسماندگان سے جن میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں اظہارِ ہمدردی کریں۔

لالہ دیش بندھو جی لالہ دیش بندھو جی نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں شاعر نہیں ہوں لیکن بہ حیثیت ایک اخبار نویس کے

مجھے سالہا سال سے برق مرحوم سے رابطہ حاصل رہا۔ تیج اخبار پر انکی خاص عنایت تھی۔ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ حکومت ہمارے ملک کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے آدمیوں کو خرید لیتی ہے اور وہ حکومت کی مشین کے پُرزے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اُن کی طبیعت کا جوش پورے طریقہ پر ظاہر نہیں ہونے پاتا۔ میں شاید کسی راز کا انکشاف نہیں کروں گا کہ جناب برق ایک سچے قوم پرست تھے لیکن حالات سے مجبور تھے۔

میں اکثر دیکھتا تھا کہ برق صاحب اپنے دفتر سے فائلوں کا بنڈل سائیکل پر باندھے مکان واپس جا رہے ہیں۔ دفتر میں سات آٹھ گھنٹے کام کرنے کے بعد اُنھیں رات کو بھی مکان پر کام کرنا پڑتا تھا۔ میں اکثر یہ ذکر اُن سے کرتا اور وہ اپنی مجبوری ظاہر کرتے۔

اُنھوں نے اگرچہ معمولی ملازمت سے ترقی کرتے کرتے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ کی جگہ حاصل کر لی تھی لیکن یہ اُن کا اصل میدان نہیں تھا۔ اُن کا اصلی میدان شعر و شاعری تھا۔

بہت عرصہ تک برق کی جگہ دہلی کے مشاعروں میں خالی رہیگی۔ شاعر ہوتے ہی رہتے ہیں۔ پہلے بھی ہوئے اور اب بھی ہوں گے لیکن ان شاعروں میں برق نہ ہوں گے۔ بدقسمتی سے دہلی نے اس سال کئی ادبی ہستیاں کھودیں۔ میرے دوست مولانا عارف ہسوی کا انتقال ہوا۔ علامہ راشد الخیری نے

جو اُردو ادب میں ایک خاص پایہ رکھتے تھے رحلت فرمائی اور اب حضرت برق نے میرے وطن پانی پت میں جہاں وہ ایک بارات میں شرکت کے لئے گئے تھے ہمیشہ کے لئے داغ جدائی دیا۔ دہلی سے جا کر حالی کی زمین میں وہ قضا کی نیند سو گئے۔

مسٹر آصف علی مسٹر آصف علی نے کہا کہ آج ہم سب جناب برق کے تعزیتی جلسے میں شریک ہیں۔ مجھے سید انشا کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

یہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔

میری یہ خوش قسمتی تھی کہ میں گذشتہ پچیس سال سے برق صاحب سے واقف تھا اور آج میری بدقسمتی ہے کہ میں اُن کے پھولوں میں شریک ہونے آیا ہوں۔ برق کی زندگی ابھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ شاید مجھ سے چند سال بڑے تھے۔ یہ وقت مرنے کا نہ تھا۔ افسوس کہ ہم آج ان کے مرثیے اور نوحے سننے آئے ہیں

برق کی وفات ادب اُردو کے لئے اتنا بڑا زخم ہے کہ اس کے لئے مرہم نہیں مل سکتا۔ اُنھوں نے اُردو ادب کو جانا، سمجھا اور اس کے بہترین نمونے ہمارے سامنے پیش کئے۔ اُنھوں نے نہ صرف ادب بلکہ اُس چیز کی صحیح خدمت کی جسے زبان کہتے ہیں۔ برق کا نسب نامہ مذہب شاعری کے اعتبار سے میر تقی، میر ذوق اور داغ وغیرہ سے ملتا ہے۔ اُردو شاعری میں ایک مذہب تو وہ ہے جو سلاست

کے ساتھ خیالات کو ادا کر دیتا ہے اور وہ انہیں زبان پر بار نہیں ہونے دیتا اور دوسرا مذہب وہ ہے جس میں آتش، ناسخ، غالب شمار ہوتے ہیں اور جن کے نمائندے ہمارے در دبرد حضرت ساحر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس طبقہ کا خاص جوہر تخیل کی بلندی ہے۔ ایک اور مذہب نظیر اکبرآبادی کا ہے جو انہیں تک محدود ہے۔ حضرت برق نے ایک نئی زمین توڑی تھی۔ اُن کی شاعری میں سلاست، جدت، اور ندرت تھی۔ وہ محض بجلی کی جھلک سی دکھلانے پائے۔ افسوس کہ ہم لوگ خدادار برق نہ دیکھ سکے۔ برق کی جسمانی زندگی ختم ہونے کے بعد بھی اُس کی روشنی مدتوں زندہ رہے گی۔

جو زبان برق صاحب نے ورثہ کے طور پر چھوڑی ہے اُس کو فروغ دینا ہم سب کا فرض ہے۔ مجھے وقت نہیں کہ برق کے کلام سے نمونے آپ کے سامنے پیش کر سکوں لیکن ان کا کلام مطلع انوار آپ کے سامنے ہے۔ اس کے جواہر ریزوں کو اپنی زندگی کے تاج میں لگا کر آپ ادب کے بادشاہ بن سکتے ہیں۔

نظمیں مسٹر آصف علی کی تقریر کے بعد نظموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جناب طالب تلمیذ حضرت برق نے سب سے پہلے اپنی نظم پڑھی۔ اس کے بعد جناب عشرت نے وہ نظم[۱] پڑھی جو کل کے پیج میں شائع ہو چکی ہے۔ جناب منور صاحب نے برق مرحوم پر ایک موثر نوحہ[۲] پڑھا۔ جناب تربھون ناتھ زار نے

ع۱ :- یہ نظم حرف ناتمام میں شامل ہے شائقین اسے صفحہ ۱۳۳ پر ملاحظہ فرمائیں

ع۲ :- ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲۷ حرف ناتمام

دونظمیں پڑھیں۔ ایک اُردو میں تھی اور ایک فارسی میں۔ دونوں نظموں میں مختلف صنعتوں سے برق مرحوم کا نام اور مختلف تاریخ ہائے وفات نکالی گئی تھیں۔ وہ تاریخیں یہ ہیں:۔

قطعۂ تاریخ وفاتِ حسرت آیات اخترِ رخشاں افقِ شرق مُنشی مہاراج بہادر برق کہ از اجتماعِ ہر حرفِ اول مصرعہائے ہوئے سنہ عیسوی و از اتصالِ ہر حرفِ اول مصرعہائے آخری سال ہجری برمی آید و از دولفظی جملۂ آخری مصرع ثانی مقطع سمت بکرمی رونماید۔

(الراقم زارؔ دہلوی)

۱۰۰۰ غریب شہر و دیار و شکارِ رنج و الم ۱ شہیدِ خنجرِ شبخونِ آسمانِ ستم ۳۰۰
۸۰۰ ضیائے چرخ برین برق ضو فشان میں ۲ ظریف طبع سخن سنج نشانِ مہر و کرم ۹۰۰
۱۰۰ قرینِ مصلحتش بود ربط و ضبطِ عوام ۳ صفائے باطن و اخلاص و آشتی باہم ۹۰
۳۰ لباسِ سادہ و رنگیں کلام و خوش خوئے ۴ سرود نغمۂ او برملائے کیف و کم ۶۰
۶ وقوعِ سالِ مماتش بگفت زارؔ بزار ۵ دلِ جہان بجز رشید بنشتر غم ۴

۱۳۵۴ ہجری ۱۹۹۳ بکرمی ۱۹۳۶ عیسوی

قطعۂ تاریخ اُردو کہ از اجتماعِ ہر حرفِ اول مصرعہائے اولے اسمش یعنی "مہاراج بہادر" برمی آید و از اتحادِ ہر حرفِ اول مصرعہائے آخری "منشی فاضل برق" رونماید و از شعر نہم سنہ عیسوی و از بیت دہم سال ہجری و از مقطع سمت

بکرمی برمی آیند۔

ماجرائے غم فرقت کا کسے ہے یارا ۔۔۔ موت نے برق کی بے موت ہمیں تو مارا

ہائے پھر انجمنِ شعر میں وہ زمزمۂ سج ۔۔۔ نہ نظر آئے گا، دلپر نہ چلے کیوں آرا

آہ اے شاعرِ شیریں سخن نوشیں لب ۔۔۔ شک نہیں آنکھوں کا شاعر[1] کی تو ہی تھا تارا

رونقِ بزمِ سخن، نازِ ادب، فخرِ وطن ۔۔۔ یوم میدانِ قلم تو نہ کسی سے ہارا

آج آنکھیں نگراں ہیں کہ نظر آئے تو ۔۔۔ فن کی اقلیم میں کہتے تھے تجھے سرب دارا

جامِ جمشید سے کم تھا نہ ترا قلبِ علیم ۔۔۔ آج سیارِ فلک جسکا ہے پارا پارا

بزمِ ماتم تیری آراستہ ہوتی ہے آج ۔۔۔ ضرب یہ سہنے کا دل کو نہیں میرے یارا

ہائے میں آج ترا مصرعۂ تاریخ وفات ۔۔۔ لکھنے بیٹھا ہوں نظر سوز ہے یہ نظّارا

آہ وہ رات عجب دلِ لقِ غضب اوڑھے تھی ۱۹۳۶ ۔۔۔ برق پر آن کے جب مرگ نے چھاپا مارا

داد ہی اسکی نہ فریاد بتم حیف! دریغ ۔۔۔ رات یا ابرِ خمستان تھی ظلمت آرا ۱۳۵۴

رحمتِ حق کہے لبیک، کہے گا یہی زار

قدر نے ایک سبک غیظ کا توڑا اتارا ۱۹۹۲

جناب چنڈی پرشاد صاحب شیداؔ نے برق کا مرثیہ مسدس کی شکل میں پڑھا۔ پنڈت امرناتھ صاحب ساحرؔ نے فارسی میں قطعہ تاریخ فرمایا پنڈت برج کشور صاحب شورؔ[2] نے ایک فارسی اور اُردو کی نظم پڑھی۔ فارسی کی نظم میں ایک ہی مصرعہ میں عیسوی، ہجری اور ہندی سمبت کی تاریخیں تھیں۔

[1]: مفخر الشعرا آغا شاعر مرحوم۔ [2]: حضرت شور بھی ۲۲۔ نومبر سنہ ۱۹۴۱ء کو آنجہانی ہوگئے۔

زاں بعد صدر صاحبہ نے تقریر فرمائی۔

شریمتی سروجنی نائیڈو کی تقریر

شریمتی سروجنی نائیڈو نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ بہتر ہوتا اگر آپ اُن اصحاب میں سے کسی کو آج کے جلسے کی صدارت کے لئے منتخب کرتے جو شاعر ہیں اور اس جلسہ میں موجود ہیں لیکن آپ نے آج صدارت کی عزت مجھے بخشی ہے۔

شاعر کسی خاص قوم یا فرقہ یا ملّت کا نہیں ہوتا۔ اسی طرح برق بھی خاص فرقہ یا ملّت کے نہیں تھے بلکہ وہ سب کے تھے۔ جس وقت یہاں برقؔ صاحب کے متعلق تقریریں ہو رہی تھیں اور نظمیں پڑھی جا رہی تھیں اُس وقت میرا خیال دوسرے شاعروں کی جانب منتقل ہو رہا تھا۔ انگلستان میں ویسٹ منسٹر ایک مشہور جگہ ہے جہاں بڑے بڑے شاعر دفن کئے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے شاعروں کو یہ بات نصیب نہیں ہے وہ گمنامی میں ختم ہو جاتے ہیں۔ برقؔ آج جسمانی اعتبار سے ہم میں نہیں ہیں اور نہ اُن کو مرنے کے بعد ویسٹ منسٹر جیسی جگہ ملی لیکن اُن کو اور بھی بہتر جگہ مل گئی ہے یعنی اُن کی جگہ آپ لوگوں کے دلوں میں ہو گئی ہے۔

ایک شاعر مرتا نہیں ہے۔ وہ ہوا کی لہروں میں، سورج کی کرنوں میں، اور آبشاروں کے نغموں میں زندہ رہتا ہے جس کی جگہ اُس سے محبت کرنے والے

دلوں میں ہے اور جس سے محبت کی جاتے وہ بھی کہیں مرتا ہے؟ اُس کا جسم موجود نہ ہو لیکن اُس کی شاعری اُس کی دائمی زندگی ہے۔

صدر صاحبہ نے فرمایا کہ آج برقؔ کے مقابلے میں نوجوان اور اُن سے بزرگ شاعروں نے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر برقؔ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ شاعر کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ نوجوان اور بوڑھے طبقہ کے درمیان ایک رابطۂ اتحاد پیدا کرے اور یہ کام لڑتی ہوئی قوموں کو آپس میں ملانے سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ شاعر ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک کڑی ہوتا ہے۔ اس کا ایک ہاتھ آنے والی نسل کی جانب اور دوسرا ہاتھ جانے والی نسلوں کی طرف ہوتا ہے۔ اسی لئے شاعر کی ہستی بہت عظیم ہوتی ہے۔

برقؔ کی زندگی میں جتنی عزت تھی آج اُس سے کہیں زیادہ ہے۔ ایسی موت مرنا ہر شخص پسند کرے گا۔ میں ایک نئی دنیا کا خواب دیکھتی ہوں۔ ایک نیا دَور آئے گا جو خوبصورتی اور سچائی کا دَور ہوگا۔ آپ کو اس دَور کے لئے ابھی سے اپنے آپ کو تیار کر لینا چاہئیے۔ اس دَور میں شاعروں اور ماہرینِ موسیقی کو بہترین جگہیں حاصل ہوں گی۔

اس کے بعد جناب منشی لشیشور پرشاد صاحب منوّر نے صدر کی جانب سے ایک ماتمی ریزولیوشن پیش کیا جو تمام مجمع نے کھڑے ہو کر پاس کیا۔

باب چہارم

ابتدائی کلمات

۱۴ فروری سنہ ۱۹۳۷ء کو غریب خانہ پر استاذی مرحوم حضرتِ برقؔ دہلوی کی پہلی برسی منائی گئی۔ یہ مقدس یادگار ہر سال منائی جاتی ہے جس میں اہلِ دل و اہلِ نظر حضرات اپنے محبوب شاعر کو نذرِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

اس باب میں وہ مقالات یکجا کر دئیے گئے ہیں جو علم دوست احباب نے

ان جلسوں میں نذرِ قارئین فرمایئے۔

یہ مضامین نہ صرف مرنے والے کے کمالِ فن پر ایک مکمل تبصرہ ہیں بلکہ اس سے اُس کی سیرت و شخصیت پر بھی نمایاں روشنی پڑتی ہے۔ اُمید ہے کہ ان ادبی جواہر پاروں کے مطالعے سے قدردانانِ اُردو اور مداحانِ برقؔ کو خاطر خواہ استفادہ پہنچے گا۔

طالبؔ دہلوی

آہ! مہاراج بہادر برقؔ

(جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب سعیدؔ بریلوی)

حاضرات کو تو ہماری محفلوں میں دخل ہی نہیں ہے اس لئے میں مجبوراً صرف معزز حاضرین کہہ کر آپ کو مخاطب کرتا ہوں۔

محترم صدر اور معزز حاضرین!

منشی مہاراج بہادر صاحب برقؔ دہلوی کی وفات پر میں نے ایک مختصر سے نوحہ میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر میں اُس نوحہ کے صرف تین شعر آپ کو سنا دوں تو آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ حضرتِ برقؔ دہلوی کیا چیز تھے یا کم سے کم میں اُنھیں کیا سمجھتا تھا!

کیسا مرنا، کیسا جینا برقؔ کا سچ تو یہ ہے
شعر کی بجلی سی اک چمکی، چمک کر رہ گئی

اُسکے ہاتوں شاعری کے رُوئے رنگیں کی نقاب
اک ذرا اوپر کو سرکی تھی، سرک کر رہ گئی

برقؔ کا یوں دفعتاً مرنا تو کچھ ایسا ہوا
نو رسیدہ اک کلی چٹکی، چٹک کر رہ گئی

حضرات، قبل اس کے کہ میں نمونے کے طور پر اُن کا کلام، یا اُن کے کلام پر اپنا ناقص سا تبصرہ آپ کی خدمت میں پیش کروں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ

تھوڑا سا ذکر اُردو شاعری کا آپ کو سنا دوں۔

"خوش قسمتی سے میں کوئی مورخ ہوں اور نہ آزاد کی آبِ حیات اور سکسینہ کی تاریخ ادبِ اُردو سے اقتباسات آپ کو سنانے کھڑا ہوا ہوں بلکہ فی الحقیقت میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہماری اُردو شاعری نے کیا رنگ اختیار کر رکھا تھا اور حضرتِ برقؔ نے اس ماحول میں پرورش پانے کے باوجود اس سے کس قدر بچکر اپنے لئے راستہ نکالا۔

اُردو زبان میں بول چال تو اس سے بہت پیشتر شروع ہو گئی تھی لیکن جب شعرا کی نگاہِ التفات اس نو عروس کی طرف متوجہ ہوئی ہے تو.....وہ زمانہ تھا کہ جب نئی دُلہنوں کے دستور کے خلاف اس بیچاری کے پاس زیور اور لباس اگر تھا تو بس اسی قدر کہ اس سے اپنا بدن چھپا لے۔ اس کی ماں اگرچہ بڑے گھرانے کی تھی اور اوپر جا کر سنسکرت جیسی مکمل زبان سے اسکا سلسلۂ نسب ملتا تھا، لیکن خود مالدار نہ تھی اس لئے جو کچھ بھی ہو سکا اس نے بیٹی کے حوالے کیا۔ اسکی خالا نے اسکی نانی یعنی سنسکرت کے گھر سے الگ ہو کر اور ایران کی ملکی اور قومی زبان بن کر بہت کچھ عروج حاصل کیا تھا اور اس کے پاس خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ ماں نے کپڑے دیئے، خالا نے زیور پہنائے، اور دونوں کی مشترکہ داد و دہش نے اُسے اس قابل بنا دیا کہ عوام اس پر جان نثار کریں اور معزز ادیب اور شاعر بھی اسکی طرف غلط اندازی نظریں ڈالنے سے باز

نہ رہ سکیں۔

غالاً اور مال دونوں کی کوششوں کے باوجود یہ ابھی تک ایک ایسی زبان نہ بن سکی تھی کہ جس میں الفاظ کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہوتا کہ شعراء اپنے ہر قسم کے خیال کا آزادانہ اور بلا تکلف اظہار کر سکیں۔ اس کے رنگ روپ اور خداداد حسن نے شعراء کو اپنی طرف مائل تو کر لیا لیکن بیچاری مفلس اور نادار ہونیکی وجہ سے الفاظ کا کوئی بڑا سرمایہ اُن کی خدمت میں پیش نہ کر سکی اور اسی لئے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کی چہیتی زبان ہونے کے باوجود اس کا دامن شعراء کے کِھلائے ہوئے پھولوں سے خالی رہا اور بہت کچھ رنگیں ادا ہونے پر بھی وہ مدتوں ان رنگینیوں کو ترستی رہی۔

شعراء کی جانب سے یہ بے التفاتی بہت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی، اور بالآخر اس کے حسن کی رنگینیوں نے اُن کے حسن پرست دلوں کو مسخر کر کے چھوڑا۔ اُنھوں نے اُردو کی بے مائگی کا عیب دُور کرنے کی یہ تدبیر سوچی کہ مختلف اصناف سخن میں سے اُردو کے لئے صرف غزل کو مختص کر دیا کیونکہ غزل میں معشوق سے باتیں کی جاتی ہیں اور باتیں کرنے کے لئے اُردو میں نہ صرف یہ کہ کافی الفاظ موجود تھے بلکہ فارسی سے بھی زیادہ شیریں زبان میں گھل گھل کر باتیں کی جا سکتی تھیں۔

یہ باتیں شروع ہوئیں، اور چونکہ بدقسمتی سے وہ زمانہ قوم کے انحطاط اور زوال کا

زمانہ تھا اس لئے اُردو شاعری صرف غزل تک محدود ہو کر رہ گئی، اور گرتے گرتے نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ چند پامال مضامین، اور چند بوسیدہ و فرسودہ خیالات کے سوا اگر کچھ تھا تو الفاظ کا اُلٹ پھیر، تھوڑے سے محاورے اور کچھ پہلے سے مقرر کی ہوئی تشبیہیں اور لفظی رعایتیں۔ انہی پیش پا افتادہ خیالات کو اور انہی کروڑوں مرتبہ کی استعمال کی ہوئی تشبیہوں کو اپنے اشعار میں اس طرح کام میں لانا کہ ان سے صاحبانِ ذوق کی طبیعتیں کچھ حظ حاصل کر سکیں کوئی آسان کام نہ تھا لیکن شعرا بیچارے مجبور تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر ان ظاہری صنائع و بدائع سے ہٹ کر یا ان متبذل اور رکیک خیالات سے جدا کوئی چیز پیش کرتے ہیں تو اسے قبولیت عامہ کا فخر ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا اور انہیں اپنی جگر کاوی کی داد کا حصہ نہیں مل سکتی۔ اُن کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا کہ حقیقی جذبات اور قلبی واردات کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر کے کلام کی ظاہری تزئین و آرائش میں مصروف ہو جائیں اور اپنا تمام زورِ قلم صرف تھوڑی سی لفظی رعائتیں شعر میں نظم کر دینے پر خرچ کر دیا کریں۔ حالات اس درجہ خراب ہو چکے تھے کہ اگر کوئی شاگرد معشوق کی زلف کے متعلق کوئی بہت ہی اچھا شعر کہہ کر اُستاد کے سامنے جاتا تو شفیق اُستاد اس کی ندرتِ خیال کی داد دینے کے بعد اسے یہ نکتہ سمجھاتے کہ شعر میں اگر زلف کا ذکر آ جائے تو یہ لازمی ہے کہ اس کے ساتھ کسی نہ کسی طریق پر مار، سودا، شام سنبل

مشک، عنبر یارات وغیرہ کی طرح کا کوئی لفظ ضرور آنا چاہیئے ورنہ بہ لحاظ فن شعر ناقص رہتا ہے۔ ان مصوروں کو اب اصل تصویر کی آرائش کا خیال کم آتا تھا۔ ان کی تمام تر کوشش و محنت صرف چوکٹے کو خوب صورت بنا دینے پر صرف ہو جاتی تھی۔

غالب، نظیر اکبرآبادی اور حکیم مومن نے اس وبائے عام میں مرنا پسند نہ کیا۔ اور اسلاف کی کورانہ تقلید کرکے "نقل مطابق اصل" قسم کی غزلیں کہنے کی بجائے اُنھوں نے شاہراہ چھوڑ دی لیکن اس کا نتیجہ صرف اسی قدر نکلا کہ آج بدلے ہوئے حالات میں بھی بہت سے ایسے "خوش ذوق" سخن فہم موجود ہیں جو غالب اور نظیر کو تو سرے سے شاعر ہی نہیں سمجھتے، اور مومن کو صرف اس وجہ سے برادری سے خارج نہیں کرنا چاہتے کہ اس نے بہت زیادہ "آوارہ گردی" نہیں اختیار کی تھی۔ اپنے زمانۂ حیات میں غالب کو ذوق پر تفوق نہ حاصل ہو سکا اور ظلِ اللہ کی اُستادی کا منصب بلند اُن کے ہاتھ نہ آیا، اور نظیر بھی جب تک زندہ رہے، ایک خوش فکر مگر مبتذل گو شاعر کے درجے سے زیادہ بلند کوئی مرتبہ اُن کو ارباب فن کی محفلوں میں نہ ملا۔

مرزا نوشہ نے غزل کے آرام دہ مگر مختصر حجرے سے تنگ آکر کہا تھا:-

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

بعض دوسرے شعراء نے بھی غزل کی اس تنگ ظرفی کو محسوس کیا لیکن بدقسمتی سے اُنھوں نے اس ظرف کو جو وسعت دی وہ صحیح معنوں میں ظرف کی وسعت نہ تھی۔ اُنھوں نے اپنی قوّتِ فکر کے لئے ایک نیا میدان تو ضرور تلاش کر لیا لیکن غزل کی ماہیت میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ اُنھوں نے اپنا تمام زورِ بیان اس بات پر صرف کر دیا کہ سنگلاخ زمینوں میں، ایسی زمینوں میں کہ جن کی ردیف بہت لمبی اور قافئے گنتی کے چند ہوں، غزلیں کہنے لگے۔ اب اس قسم کے اشعار پر محفلیں داد کے شور سے گونجنے لگیں:۔

ضرر نہ ہو اسے کچھ اُس میں آبلے پڑ جائیں
وہ ماہ رکھے اگر دیدۂ حباب میں پاؤں

اور غزل الفاظ کا ایک گورکھ دھندا بن کر رہ گئی

علم کی کمی کے ساتھ ساتھ خیالات کا پست ہونا لازمی تھا، رفتہ رفتہ حالت اس درجہ خراب ہو گئی کہ اساتذۂ فن فخر کے ساتھ مشاعروں میں اس قسم کے شعر سنانے لگے:۔

سب اُس کو سرو باندھیں میں تو اُس کو تاڑ باندھ
لوہے کی گر ہوس ہو تو گِرد اُسکے پاڑ باندھ

یا یہ کہ

مرغِ دل کو توڑے گی بلّی ترے دروازے کی
رخصتِ تن کو کترے گا چوہا تمہاری ناک کا

دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب بربادی اور خرابی حد سے گذر جاتی ہے تو انقلاب کے مبارک قدم آتے ہیں۔ اُردو شاعری بھی اپنی خرابی کی آخری منزل پر پہنچ چکی تھی۔ انقلاب رونما ہوا، اور اسی خاک سے حالی و اقبال، و سرور و چکبست پیدا ہوئے اور یہ کہنا چاہیئے کہ انھوں نے ڈوبتی ناؤ کو سنبھال لیا۔ ان بزرگوں نے غزل کو بھی ابتذال سے پاک کیا اور مثنوی یا قصیدے کے انداز پر ایسی نظموں کو اُردو میں رائج کیا کہ جو نہایت پاکیزہ اور بلند خیالات سے پُر تھیں اور اکثر و بیشتر چونکہ وارداتِ قلب کا بیان ہوتی تھیں اس لئے اس مشہور مقولے کے مطابق "ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد" دلوں میں تیر و نشتر بنکر پیوست ہوجاتی تھیں۔ عوام اور خواص سب ان نظموں کے ایک ایک شعر پر سر دُھنتے تھے، لیکن عام طور پر ہمارے شعرا کو یہ ادا نہ بھائی، اور یہ بدعت پسند نہ آئی۔ کسی نے حالی پر اعتراض کئے اور کسی نے اقبال پر اور چکبست و شرر میں تو ادبی جنگ مدتوں چلتی رہی۔ لیکن یہ لوگ دُھن کے پکے تھے اور ہر طرف سے بہت کچھ لعن طعن ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی طرز نہ بدلی۔

انہی مایۂ صد ناز بزرگوں کی آنکھیں دیکھنے والوں میں منشی مہاراج بہادر صاحب برق دہلوی بھی تھے۔ اُن کی شاعری کی ابتدا کے وقت تک شعرائے اُردو کا مذاق سخن بدلا نہ تھا اور اگر ان کے دل میں تھوڑی سی مشاعروں کی واہ واہ کی ہوس ہوتی تو انھیں اسی پرانی طرزِ غزل گوئی کو اختیار کرنا چاہیئے تھا۔

فطرت نے انھیں شاعر پیدا کیا تھا اور مشرقی اور مغربی علوم نے اُن کی قابلیت اور استعداد میں اور چار چاند لگا دئے تھے۔ اور پھر اس پر طرّہ یہ کہ دلّی کے رہنے والے تھے زبان اُن کی گھر کی لونڈی تھی، وہ اگر چاہتے تو آغازِ شباب ہی میں اساتذہ کے مرتبے کو پہنچ جاتے لیکن ان کی حقیقت بیں نظر نے اچھی طرح اندازہ کر لیا کہ پُرانی طرز کی گل و بلبل، خنجر و گلو، رقیب و پاسبان، بوسۂ دشنام اور ہجر و وصال کی داستانوں میں اب کوئی جدت نہیں پیدا کی جا سکتی۔ اُردو سے انھیں محبت تھی اور اس کا دامن گلہائے رنگا رنگ سے خالی دیکھ کر اُن کے دل نے انھیں مجبور کیا کہ اپنی خداداد قابلیت کو زبان کی سچی خدمت کرنے پر صَرف کریں اور جن ادبی پھولوں سے اُس کا دامن خالی ہے وہی پھول اُس میں بھریں۔

جہاں تک میرا خیال ہے جناب برقؔ کا دیوان یا اُن کی نظموں کا مجموعہ مطلع انوار کے نام سے ۲۹ء میں شائع ہوا تھا، ممکن ہے کہ اس سے بھی کچھ پہلے شائع ہوا ہو۔ اس وقت ملک کے ایک مایۂ ناز شاعر اور نقادِ سخن جناب اصغر گونڈوی نے اُس پر تبصرہ کرتے وقت ان خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔

"جناب برقؔ نے عکاسی کی بجائے تخلیق سے کام لیا ہے، اور فطرت کی بیجان اشیاء کو اپنے زورِ صنعت سے زندگی بخش کر معارف و اسرار کے خزائن پیش کئے ہیں"۔

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے کہ جب میں جناب برقؔ کی خدمت میں نیاز حاصل

کر چکا تھا، اور اُن کا کلام اُن کی زبان سے بھی سُن چکا تھا، اور "مطلع انوار" کی زیارت سے بھی میری آنکھیں سبز ہو چکی تھیں۔ مجھے حضرتِ برق کے کلام کے متعلق جناب اصغر کی رائے سے کامل اتفاق تھا لیکن میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب میں نے "ادبی دنیا" جیسے مؤقر رسالے میں ایک نقاد صاحب کی جنھیں اپنا نام ظاہر کرنے کی ہمت نہ تھی اور صرف حرف "ع" کے نام سے رسالے کے صفحات پر جلوہ آرا ہوئے تھے یہ تنقید پڑھی کہ مجھے اصغر صاحب سے اختلافِ رائے ہے اور گو میں ایک عرصے سے اصغر صاحب کے ذوقِ شعری کا مداح ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ برق صاحب کی نظموں میں صرف استعارات و تشبیہات کی بہتات ہے اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

اس کے بعد "ادبی دنیا" کے نقاد جناب "ع" نے شاید یہ ثابت کرنے کے لئے حضرت برق نے اپنے استعارات اور تشبیہات کا صحیح استعمال نہیں کیا ہے تشبیہ اور استعارے کے استعمال کا طریقہ بھی تحریر فرما دیا تھا جو انہی کے الفاظ میں یہ ہے "شاعر کے لئے فطرت کی ہر جمیل شے ایک درخشاں جوہر ہے جس کے پہلو تراشے ہوئے ہیں۔ روشنی کم و بیش ان پہلوؤں میں مختلف رنگ اور مختلف دلآویزیاں پیدا کرتی ہے۔ ان مختلف نوعیتوں کو واضح کرنے کے لئے شاعر کو معمولی الفاظ کا استعمال ناکافی معلوم ہوتا ہے اور

وہ تشبیہات و استعارات کام میں لاتا ہے۔ یہ دو بجلیاں ہیں جو صنعت کی فضا کو روشن کرتی ہیں"۔ اسی کے ساتھ جناب نقاد صاحب یا جناب "ع" نے برق صاحب کے کلام کے متعلق یہ رائے ظاہر فرمائی تھی "نہایت افسوس کا مقام ہے کہ استعارات و تشبیہات کو محض آرائشِ کلام کے لئے استعمال کیا گیا ہے"۔

میں نے اُس وقت بھی "ع" صاحب کے ان مہمل اعتراضات کا جواب دیدیا تھا اور اب اس وقت آپ کے سامنے بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تشبیہات اور استعارات ہوتے ہی اسی لئے ہیں کہ ان سے کلام کی زینت اور آرائش کا کام لیا جائے۔ ہم کسی حسین کے دانتوں کو دیکھ کر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کے دانت بہت سفید یا بہت چمکدار ہیں۔۔۔ اور اسی مطلب کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ اس کے دانت کیسے موتی جیسے ہیں اور ہر شخص بہ آسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ ذرا سی تشبیہ سے ہمارے بیان یا ہمارے کلام کی کس قدر تزئین اور آرائش ہوگئی۔ جناب "ع" نے یہ تو بالکل صحیح فرمایا ہے کہ ایک ہیرے کے ترشے ہوئے یا انہی کے الفاظ میں" تراشے ہوئے" پہلوؤں کو دیکھکر شاعر کو یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے قلبی تاثرات کو تشبیہ اور استعارے کے ذریعہ بیان کرے لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ استعارات اور تشبیہات کو کلام کی آرائش کے لئے استعمال نہ کرنا چاہیئے۔ درحقیقت کسی ہیرے کے مختلف پہلوؤں کی چمک کو استعارے

اور تشبیہہ کی مدد سے ظاہر کرنے ہی کا نام آرائش کلام ہے کہ جس سے جنابِ "ع" اس قدر بیزار معلوم ہوتے ہیں۔

جنابِ "ع" کو حضرتِ برقؔ سے یہ بھی شکایت ہے کہ "ان کی تشبیہات نہ تو مناظر کا کوئی نیا پہلو ظاہر کرتی ہیں اور نہ اچھوتی اور نادر ہیں، صرف یہ ہے کہ آپ کے پاس تشبیہات اور استعارات کا ایک لامحدود ذخیرہ ہے جسے وہ نہایت فراخ دلی سے استعمال کرتے ہیں۔"

جنابِ "ع" مجھے معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ انھیں اگر برقؔ صاحب پر یہی اعتراض تھا تو وہ اُن کے کلام کا نمونہ پیش کرکے دکھاتے کہ حضرت برقؔ نے اس منظر کے فلاں فلاں پہلو تو دکھائے لیکن یہ پہلو چھوڑ دیا ہے۔ اگر جنابِ "ع" کا مناظر کے نئے پہلو سے یہ مطلب ہے کہ حضرتِ برقؔ نے جہاں پیڑوں کا ذکر کیا ہے وہاں بس اُن کی شاخوں، اُن کے پتّوں، اُن کے پھولوں، اور اُن کے پھلوں ہی کا ذکر کرکے چھوڑ دیا ہے کہ جو سب کو نظر آتے ہیں اور ایک نئے پہلو یعنی ان کی جڑوں کا نام تک نہیں لیا ہے جو زمین کے اندر ہی اندر جال پھیلاتی چلی جاتی ہیں، یا اپنی مشہور نظم 'تاج' میں جہاں تاج محل کے میناروں کا بیان کیا ہے وہاں ان کی بلندی اور ظاہری خوشنمائی کا ذکر تو تشبیہات اور استعارات کے ذریعہ سے کر دیا ہے لیکن اُن کا یہ نیا پہلو بیان کرنا بھول گئے ہیں کہ اگر ان میناروں کو

الٹ کر زمین میں گاڑ دیا جائے تو کوئی گہرے سے گہرا کنواں بھی اُن کا مقابلہ نہ کر سکے گا، تو جنابِ "ع" کی خدمت میں بہت ہی ادب کے ساتھ میں یہی عرض کروں گا کہ "شعر فہمی عالم بالا معلوم شد"

"ع" صاحب نے بار بار یہ شکایت کی ہے کہ برق صاحب کے پاس استعارات و تشبیہات کا ایک نامحدود ذخیرہ موجود ہے، کیا ہم اس سے یہ مطلب سمجھیں کہ ایک اچھے شاعر کے پاس ان چیزوں کا ذخیرہ بہت ہی مختصر سا ہونا چاہیئے بس اتنا کہ جتنا "ع" صاحب کے پاس ہے؟ خدائے سخن میر انیس لکھنوی کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ اُن کے پاس الفاظ کا، استعارات کا، اور تشبیہات کا ایک نامحدود ذخیرہ تھا اور وہ بھی ان چیزوں کو بے دریغ خرچ کیا کرتے تھے کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اسی لئے میر انیس صرف خدائے سخن رہ گئے ورنہ جنابِ "ع" کی طرح کلیم سخن بنجاتے! حضرات، میں نے جنابِ برق کے کلام کا بہت کافی غور کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور میری رائے صحیح ہو یا غلط، میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ موصوف کے کلام میں اگرچہ تشبیہیں اور استعارے بہ کثرت ہیں لیکن یہ ہرگز نہیں ہے کہ تشبیہوں اور استعاروں کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ جنابِ "ع" اگر ناانصافی کی عینک اتار کر ملاحظہ فرمائیں تو برق کے کلام میں بہت سی نادر اور اچھوتی تشبیہوں کے ساتھ ساتھ انہیں کوئی چیز ایسی بھی ضرور نظر آئے گی جو یہ ثابت کر دے کہ حضرت برق مٹی کے بُت نہیں کہ جیسا انہیں "ع" صاحب نے فرض کر لیا ہے

بلکہ وہ سچ مچ کے انسان تھے اور سینے کے اندر ایک ایسا دل رکھتے تھے کہ جو حُسنِ مناظر سے بھی متاثر ہوا کرتا تھا، اور جس میں صحیح اور سچے انسانی جذبات بھی موج زن رہتے تھے۔ مثال کے طور پر اُن کی نظم "تاج" ہی کو لے لیجئے۔ اس بے نظیر عمارت کی تعریف وہ کون ہے جو نہیں کرتا۔ برقؔ صاحب بھی اس کے حُسنِ ظاہر سے اثر قبول کرتے ہیں اور پہلے تو تشبیہات اور استعارات کا انمول خزانہ اس طرح لٹاتے ہیں :۔

زفرق تا بقدم پیکرِ حسیں ہے تو
ردائے نُور میں ملبوس نازنیں ہے تو
مرقعِ کششِ حُسنِ دل نشیں ہے تو
بہارِ خلد کی تصویر بالیقیں ہے تو
فروغِ دیدۂ دل جنّت نظارہ ہے
ضیا فشاں کرۂ ارض پر ستارہ ہے

عجائباتِ زمانہ میں انتخاب ہے تو
زمیں پہ منزلِ خورشید کا جواب ہے تو
سپہرِ حُسن ہے یا بُرجِ ماہتاب ہے تو
نگار خانۂ صنعت کنارِ آب ہے تو
یہ تیرا عکس ہے سیلاب کی روانی میں
کہ اک سفینۂ زرّیں پڑا ہے پانی میں

روضۂ تاج محل کے حُسنِ ظاہر کی اس قدر کمال فن کے ساتھ عکاسی کر چکنے کے بعد وہ اُس اثر کو بھی ظاہر کر دیتے ہیں کہ جو اُن کے دردمند دل نے قبول کیا تھا اور جس نے اُنھیں مجبور کر کے اُن سے یہ نظم لکھوائی :۔

نہاں ہے گوہرِ نایاب تیرے دامن میں
خموش شمعِ فروزاں ہے کنجِ مدفن میں

بہارِ حسن ہے خوابیدہ صحنِ گلشن میں
سکوں پذیر ہے ممتاز اپنے مسکن میں
حریمِ خاک میں ہیں حسن و عشق ہم آغوش
ہیں محوِ خوابِ عدم تاج و تاجدار خموش

حضرات، اب میں آپ ہی کے انصاف پر یہ بات چھوڑتا ہوں کہ کیا مٹی اور پتھر کے دلوں میں بھی کبھی یہ گرمی اور ایسے پاکیزہ جذبات پیدا ہوتے ہیں اور کیا صحنِ گلشن میں خوابیدہ بہارِ حسن کسی معمولی ادیب اور شاعر کو بھی نظر آسکتی ہے؟ اگر "ع" صاحب خفا نہ ہو جائیں تو میں تو یہی عرض کروں گا کہ "ع" صاحب کو عینک سے بھی یہ چیزیں نظر نہ آئیں۔

"مٹی کے چراغ" کو دیکھکر حضرتِ برقؔ کے دل میں جو خیالات پیدا ہوئے وہ بھی سن لیجئے:-

کیا سرور انگیز اسکا جلوۂ مستانہ ہے
بیخودِ صہبائے آتش خیز ہر پروانہ ہے
سرخیٔ افسانۂ شب زینتِ کاشانہ ہے
میں سیہ قسمت ہوں یہ میرا چراغِ خانہ ہے
شامِ غم اس کے فروغِ رخ سے نورانی ہوئی
تیرگی میں نور پھیلا جلوہ سامانی ہوئی
اسکے شب افروز جلوہ سے فضا معمور ہے
دیدۂ نظارہ جو روشن ہو دل مسرور ہے
شعلۂ عریاں میں پنہاں رنگِ برقِ طور ہے
شمع کافوری بھی اسکے سامنے بے نور ہے
دیکھنا اک پارۂ گِل کی ذرا اوقات کو
نور کے سانچے میں ڈھالا ہے اسی نے رات کو

یہ تو مٹی کے دستے کی ظاہری شکل وصورت کی عکاسی تھی۔ اب اسکا باطنی پہلو بھی ملاحظہ فرماتے :۔

رات بھر سوزِ دروں رکھتا ہے گرمِ سوز و ساز
خرمنِ جاں پھونکتی ہے برقِ عشقِ دل گداز
اسکی خاموشی ہے اک روشن مثالِ ضبطِ راز
تابِ گویائی ہے کم، افسانۂ الفت دراز
کتنی زحمت ہے حیاتِ مختصر کے واسطے
گُل بداماں ہے یہ خورشیدِ سحر کے واسطے

برسات کی اندھیری راتوں میں جگنو کی چمک کا نظارہ اس قدر عام ہے کہ اس میں کوئی حسن تلاش کرنا تو کجا، اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کا بھی خیال عام دلوں میں نہیں آتا، لیکن ایک شاعر، بلکہ ایک ذکی الحس شاعر اسکی وقفہ دار چمک میں بھی نورِ ازل کی جھلکیاں دیکھ لیتا ہے، اور جگنو کی بہت کچھ ثناء و صفت کرنے کے بعد ہماری بے حس روحوں کو یہ پیغام دیتا ہے :۔

برقِ ایمن کو جو منظور ہوئی اپنی نمود
ڈھل گیا نور کے سانچے میں ترا نقشِ وجود
حُسن میں تیرے عجب نازِ دل آرائی ہے
ترا جلوہ کبھی پنہاں کبھی پیدائی ہے

شفق کی سرخی بھلی تو ہر اک نگاہ کو معلوم ہوتی ہے لیکن انصاف سے کہئے ایسے دیکھنے والے کتنے ہیں جو اسے دیکھکر اپنی آنکھ سے یہ کہیں کہ :۔

دیکھ لے چشمِ تماشا تُو یہ جلوہ دیکھ لے
ملکِ صناعِ حقیقی کا کرشمہ دیکھ لے

شفق کے مختصر قیام سے بھی برقؔ کا اثر پذیر دل عبرت حاصل کرتا ہے اور وہ بے اختیار ہو کر آفتاب کے جلوۂ آخر کی مٹتی ہوئی تصویر کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :-

محو ہو جائینگے دم بھر میں ترے نقش و نگار
ہے یونہی وقفِ خزاں عمرِ دو روزہ کی بہار

جلوۂ گل تو ہی مشتاقِ تماشا کے لئے
منظرِ عبرت نما ہے چشمِ بینا کے لئے

حضرات میں نے حضرتِ برقؔ کے کلام کی شاعرانہ خوبیوں اور ادبی لطافتوں کو الگ الگ کر کے واضح کرنے سے قصداً احتراز کیا ہے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ میں سے بیشتر حضرات مجھ سے کہیں زیادہ سخن فہم اور سخن سنج ہیں اور سورج کو چراغ دکھا کر میں کسی طرح بھی آپ کی توہین کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ انمول جواہرات کے ایک ڈھیر میں سے جو ہیرا بھی چُنا جائے گا اُس کی تعریف میں دفتر کے دفتر سیاہ ہو سکتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ حضرتِ برقؔ کو قدرت نے شاعر پیدا کیا تھا اور وہ "شاعری جزویست از پیغمبری" کے مطابق اپنے دل کی گہرائیوں میں اہلِ دنیا کے لئے ایک پیغام پنہاں رکھتے تھے اُن کی زندگی نے وفا نہ کی، اور بالکل ناگہانی طور پر حرکت کرتے کرتے ایک ایسا دل رُک گیا کہ جس میں پاکیزہ جذبات اور

بلند ترین خیالات کے سمندر موجزن رہتے تھے، اور جب کبھی یہ سرچشمۂ الولد لبریز ہو جاتا تھا تو نہایت لطیف اور رنگین اشعار صفحۂ قرطاس پر موتیوں کی طرح بکھر جاتے تھے۔

جو موتی کہ اس طرح بکھر کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں، میرا مطلب اُن کی اُن نظموں سے ہے کہ جو مطلع انوار میں چھپ چکی ہیں؛ اُنہیں پڑھ کر تو آپ بطورِ خود لطف اندوز ہو سکتے ہیں لیکن اُن کے شاگردِ رشید جنابِ طالب دہلوی نے کہ جو ہر سال اپنے شفیق اُستاد کی برسی مناکر ہم جیسے فراموش کاروں کے دلوں میں بھی برق کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں، مجھے اُن کا کچھ ایسا کلام بھی دیکھنے کو دیا کہ جو مطلع انوار میں شامل نہیں ہے۔ میں اپنی اور آپ سب صاحبان کی طرف سے جنابِ طالب کا اس کرم فرمائی کے لئے شکریہ ادا کر کے اس میں سے بھی کچھ اشعار مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کئے دیتا ہوں تاکہ تنہا خوری کے الزام سے بچ جاؤں۔

ان تمام نظموں میں بھی آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ وہی روانی، وہی بندشوں کی چستی، وہی نزاکتِ خیال، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہی پیغام موجود ہے جو جنابِ برق کی نظموں کی خصوصیت ہے۔

گزرے ہوئے شباب کی یاد ہمارے آپ کے سب کے دلوں کو ستایا کرتی ہے، لیکن ایک فطرتی شاعر کے دل میں جب وہ چٹکیاں لیتی ہے تو وہ

اس طرح پکار اٹھتا ہے:-

کہاں وہ ذوقِ تماشا کہ اضطراب کے ساتھ
کہاں وہ چھیڑ کسی گوشۂ نقاب کے ساتھ
کہاں وہ ربطِ بہم حسنِ جلوہ تاب کے ساتھ
وہ کیفِ عشق کہاں چشمِ نیم خواب کے ساتھ
چمن پہ اوس پڑی دورِ انقلاب کے ساتھ
گئیں شباب کی رنگینیاں شباب کے ساتھ

میں اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کروں گا کہ .... ایک ایک لفظ پہ غور کیجئے کس قدر درد میں ڈوبا ہوا اور حسرت سے لبریز ہے۔

پھر فرماتے ہیں:-

نہ ولولے، نہ مسرت کی جستجو باقی | نہ دل، نہ دل میں تمناؤں کا لہو باقی
چمن اجڑ گیا ایسا رہی نہ بو باقی | مٹا مٹا سا ہے اک داغِ آرزو باقی

جو دن ہیں زیست کے کٹتے ہیں اضطراب کے ساتھ
گئیں شباب کی رنگینیاں شباب کے ساتھ

نہ زندگی ہے نہ زندہ دلی کے احساسات | جو وجہ کیف تھیں معدوم ہو گئیں وہ صفات
بہارِ زیست گئی ڈھل گئی شباب کی رات | نمودِ صبح سے گل ہو گیا چراغِ حیات
سی کی یاد ہے اب دیدۂ پُر آب کے ساتھ | گئیں شباب کی رنگینیاں شباب کے ساتھ

نہ اب وہ مجمعِ احباب وہ بزمِ رندانہ — سُرورِ عیش و مسرت سے دل ہے بیگانہ
چھلک گیا مئے عشرت کا بھر کے پیمانہ — فراق و وصل کا بھولا ہوا ہے افسانہ
کہاں وہ شغلِ طرب حسنِ انتخاب کے ساتھ
گئیں شباب کی رنگینیاں شباب کے ساتھ

میرا خیال ہے کہ میں جنابِ برقؔ کے اس تخیل کو جو ایک شاعر کے متعلق اُن کے ذہن میں تھا آپ کے سامنے پیش کر کے اپنے اس معروضہ کو ختم کر دوں۔ شاعر کے عنوان سے جو نظم اُنھوں نے لکھی ہے اور جس کے دو چار بند میں آپ کو سنانے والا ہوں، وہ آپ پر واضح کر دے گی کہ ایک شاعر کے متعلق حضرت برقؔ کے خیالات کیا تھے، اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد آپ صحیح طور پر یہ اندازہ کر سکیں گے کہ برقؔ کیا چیز تھے اور اُن کی بے وقت موت نے اُردو ادب اور اُردو شاعری کو کیا نقصانِ عظیم پہنچایا ہے۔

معجزہ عالمِ امکاں میں ہے شاعر کا وجود — اسکی اعجاز بیانی سے سخن کی ہے نمود
اسکی تخیل فلک تاز ہے آزادِ قیود — ہیچ ہیں اس کے لئے عالمِ بالا کی حدود
یہ وہ ہے بار جسے جلوہ گہِ راز میں ہے
اسکے لب پہ ہے وہ نغمہ جو نہاں ساز میں ہے
[illegible] خورشیدِ فطرت سے ہے [illegible] — [illegible] انوارِ حقیقت سے ہے [illegible]

رہبرِ منزلِ عرفان و طریقت ہے یہی
ساقیٔ کیف فروشِ مئے وحدت ہے یہی
اس کے وجد آفریں نغموں سے جہاں وجد میں ہے
رقص میں قلبِ تپاں، روحِ رواں وجد میں ہے

حسنِ معنی کا پرستار یہ مستانہ ہے
ہوش کی بات جو کہتا ہے وہ دیوانہ ہے
قیدِ تفریق و تعین سے یہ بیگانہ ہے
دیر بھی اس کی نگاہوں میں صنم خانہ ہے
رندِ مشرب ہے ہمہ اوست کے میخانے کا
جرعہ کش ہے یہ مئے نور کے پیمانے کا

ہمہ تن درد ہے، خوکردۂ رنج و راحت
مرتبہ دانِ الم، نبض شناسِ فطرت
چشمِ بینا ہے یہ ناظرِ بزمِ قدرت
ذرے ذرے سے اسے ملتا ہے درسِ عبرت
سبق آموزِ حقیقت ہے زمانے کے لئے
خضرِ منزل ہے رہِ راست دکھانے کے لئے

میرا خیال ہے کہ برق حقیقی معنوں میں شاعر تھے اور اُن کی ذات میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو اُنھوں نے شاعر کے لئے لازمی قرار دی ہیں۔

برق کی غزلگوئی

(اُن کے معاصرین کے مقابلہ میں)

(جناب منشی بشیشور پرشاد صاحب منوّر لکھنوی)

محفل میں برق جمع ہیں کیا کیا سخن شناس
مدِ نظر نزاکتِ حسنِ بیاں رہے

میرے مرحوم دوست اور بزرگ افتخار الشعرا منشی مہاراج بہادر برق دہلوی جہاں ایک طرف اقلیم نظم کے بادشاہ تھے وہاں دوسری طرف میدان غزل میں بھی ان کی معرکہ آرائیاں اُن کے فرقِ ہمایونی پر فوقیت کا تاج رکھتی ہیں۔ ممکن ہے بعض اہل الرائے میرے اس نظریہ سے کامل طور پر متفق نہ ہوں لیکن غالباً میرا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ غزل گوئی کے معاملے میں اگر مرحوم اپنے ممتاز معاصروں سے آگے نہیں جاتے تو وہ کسی طرح سے اُن سے پیچھے بھی نہیں ہیں۔

برق مرحوم کے معاصروں میں ہم فانی، اصغر، جگر، اور سیماب کو آسانی کے ساتھ شمار کر سکتے ہیں۔ حسرت موہانی اُن سے کسی قدر پہلے زمانے کے ہیں۔

پھر بھی چونکہ دَورِ موجودہ کے متغزلین میں سبقت کا تاج اُن کے سر پر رکھا گیا ہے اور برقؔ دَورِ موجودہ کے باکمالوں میں ہیں، اس لئے حسرتؔ بھی اگر اسی صف میں شامل کرلئے جائیں تو نامناسب نہ ہوگا۔

ہر شاعر کے خصوصیات جداگانہ ہوتے ہیں اور اکثر و بیشتر ان خصوصیات کا اثر اس شاعر کے کلام پر بھی پڑتا ہے۔ ذاتی خصوصیات کے علاوہ گردو پیش کے اثرات بھی اُس کے کلام میں دخیل ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک مسلّم امر ہے۔ مثلاً حسرتؔ موہانی مومنؔ کے اسکول سے متعلق ہونے کے باعث معنوی لطافت و نزاکت کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ فانیؔ کے کلام پر غالبؔ کا اثر ہے اور اُن کے بعض مداحوں نے اُنھیں کہیں کہیں غالبؔ سے بھی زیادہ اہمیت کا مستحق ٹھیرایا ہے۔ فانیؔ کے کلام میں جہاں بلاغت ہے، علوِ لفظی ہے، وہاں اُس میں ایک ایسی لطافت آمیز اثر انگیزی بھی ہے جس کے ماتحت ہم اُن کے شعر پڑھتے وقت اپنے ہاتھوں سے اپنا کلیجہ ملتے جلتے ہیں۔ اُن کا کلام دل میں ایک ہیں سی ٹیس پیدا کرتا ہے۔

اصغرؔ نے غزل کا رُخ ہی پلٹ دیا۔ غزل میں وقت کے اثر سے جو حزینہ رنگ پیدا ہوگیا تھا اُس کو اُنھوں نے نشاط کے سانچے میں ڈھالا اور شعری لطافت کے ساتھ ایسی متصوفانہ کیفیات پیدا کیں جن سے دل میں راحت اور نظر میں کشادگی پیدا ہوئی۔ اُن کا رنگ جہاں تک میں نے

غور کیا ہے، ایک علیحدہ رنگ ہے۔ جسے کسی اسکول سے منسوب نہیں کیا جاسکتا
جگر مرادآبادی کے کلام میں کئی رنگ پائے جاتے ہیں اور اسکا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ جگر نے خود ہی اپنے کلام کے کئی دور قائم کئے ہیں اُن کا موجودہ رنگ مستقل معلوم ہوتا ہے۔ وہ وجدانیات اور حالیات کے قائل ہیں اور یہی ایک چیز ہے جو اُن کو اپنے دوسرے معاصروں سے متمیز کرتی ہے۔ جگر کے مقلد لاکھ اپنے کلام میں جگر کا رنگ پیدا کریں، اُن کو جگر کی سی بات نصیب نہیں ہوسکتی۔ وہ اپنی رگوں میں جگر سا خون کہاں سے لائیں گے۔ جگر اور اُن کے مقلدوں میں وہی نسبت ہے جو داغ اور اُن کے پیروؤں کے درمیان ہے۔ داغ کا رنگ بھی (میرا یہ ایماناً خیال ہے) اُن کے بیشتر مقلد کامیاب طور پر اپنے کلام میں قائم نہ رکھ سکے۔

ادب اُردو کے ایک اسکول نے صرف حسرت فانی۔ اصغر اور جگر ہی کو غزل گوئی میں طرّہ امتیاز عطا کیا ہے لیکن سیماب بھی آسانی کے ساتھ نظر انداز نہیں کئے جاسکتے۔ سیماب کے کلام سے ہمیں کئی ٹھوس چیزیں ملتی ہیں۔ ہر انسان میں خامیاں ہوتی ہیں حسرت، فانی، اصغر، جگر میں بھی خامیاں ہوں گی اور سیماب بھی اس سے مستثنےٰ نہیں لیکن انصافاً سیماب کو ان حضرات کے ساتھ ساتھ جگہ نہ دینا میرے خیال میں ناانصافی ہے۔

میں نے میدانِ غزل کے ان سورماؤں میں صفی، ثاقب، آرزو، چکبست،

عزیز اور جعفر علی خاں اثر کا کیوں ذکر نہیں کیا؟ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ذاتی طور پر میں صفی کو اقلیم فصاحت کا بادشاہ سمجھتا ہوں۔ ثاقب اپنے رنگ میں یکتا ہیں۔ آرزو نے غزل میں عجیب عجیب ندرتیں پیدا کی ہیں نظر کی غزل گوئی کا تقریباً ہر اسکول قائل ہے۔ چکبست کے تغزل کا نکھار ایک خاص شان رکھتا ہے پھر بھی صفی ثاقب، آرزو اور نظر حسرت موہانی کی طرح صحیح معنوں میں برق مرحوم کے معاصر نہیں کہے جا سکتے۔ اُن کی شاعری کا آغاز برق سے کئی سال پہلے ہوتا ہے چکبست کو اُنکی قومی شاعری کے باعث زیادہ منزلت دی جاتی ہے اگرچہ

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

اور

اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا
فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا

جیسے بلند اشعار کے باعث جو اپنی روحانی پاکیزگی کے ساتھ ہی ساتھ رنگ تغزل میں بھی ڈوبے ہوئے ہیں، چکبست غزل گوئی کے معاملے میں اُسی قدر قابلِ توجہ ہیں جسقدر نظم گوئی میں۔

عزیز نے بھی غالب کا تتبع کیا لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ فانی اُن سے سبقت لے گئے۔ پھر بھی عزیز عزیز ہیں اور ایک اسکول آج بھی اُن کو امامِ سخن مانتا ہے۔ جعفر علی خاں اثر کے کلام کی پختگی کا ایک زمانہ قائل ہے مگر تاثراتِ شعری اور

قدامت پروری کے باعث انھیں زمانۂ حال کا شاعر ہونے کے باوجود فانی اصغر اور جگر کے برابر جگہ نہیں دی گئی۔ ارباب ادب کا یہ فیصلہ غلط ہے یا صحیح اس سے مجھے بحث نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ جب ہم کامیاب غزل گو شعرا کی فہرست بنانے بیٹھیں گے تو ان حضرات کے حقوق پر بھی نگاہ رکھیں گے۔ میدانِ غزل گوئی کا ایک اور بھی جوانمرد ہے جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے اور وہ یاس عظیم آبادی ہے لیکن زمانے نے اُسے کیوں نہیں اپنایا۔ اسکا جواب دینا میرا کام نہیں۔ وہ فانی، اصغر، اور جگر کے ساتھ نہیں بٹھایا گیا اور یہی سلوک افتخار الشعرا منشی مہاراج بہادر برق کے ساتھ بھی ہوا۔

برق مرحوم کے متعلق بھی عام خیال یہ ہے کہ وہ غزل کے بجائے نظم میں زیادہ کامیاب ہیں اور اسی لئے ان کو بہترین متغزلین کی صف میں جگہ نہیں دی جاتی۔ یہ صحیح ہے کہ نظم گو شعرا بالعموم غزل کے میدان میں لپست پائے جاتے ہیں اور غزل گو شعرا نظم کے معاملے میں پیچھے رہتے ہیں تاہم بعض جوانمرد ایسے بھی ہیں جنھوں نے دونوں میدان سر کئے ہیں اور انھیں میں افتخار الشعرا برق مرحوم کا بھی شمار ہے۔

برق کی شاعری کا آغاز بھی اسی ماحول میں ہوا جب داغ کا رنگ مقبول تھا۔ اُن کی شاعری دہلی کی ٹکسالی زبان کا آئینہ دار ہے۔ زبان کی چاشنی کے ساتھ وہ غزل میں خوب معاملہ بندی کرتے ہیں۔ داغ کے رنگ کو

اپنے طریقے سے اپناتے ہیں اور آگے چل کر وہ رنگ خود برق کا رنگ بن جاتا ہے عشقیہ شاعری تغیرِ طبیعت کے ساتھ فلسفیانہ پہلو اختیار کر لیتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ برق غزل کے ناپیدا کنار سمندر میں زیادہ گہرے نہیں اُترے تاہم بھی جو موتی وہ نکال کر لاتے ہیں، اُن کی آب و تاب سے جواہر خانۂ ادب معمور ہو جاتا ہے اور ہم اُن موتیوں کو دیکھ کر مجبور ہو جاتے ہیں کہ برق کو بھی بحرِ سخن کے اُنھیں شناوروں میں لا کر بٹھائیں جو صفِ اوّل کے مستحق قرار دئے گئے ہیں۔ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ برتری کا تاج کسی کے سر پر زبردستی نہیں رکھا جا سکتا۔ تسلیم۔ مگر ساتھ ہی ساتھ آپ برتری کا تاج زبردستی کسی سے چھین بھی نہیں سکتے۔

داغ کی نسبت سے برق آشنا شاعر کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے حالانکہ اُنھیں اس رہنمائی کا برائے نام ہی محتاج ہونا پڑا۔ برق زندہ دل تھے اگرچہ آخر آخر مکروہاتِ زمانہ نے اُنھیں زندگی سے بددل بھی کر دیا تھا۔ برق کی فطری تیزی اور شوخی اُن کے کلام میں شروع سے آخر تک کام کرتی نظر آئیگی۔ غزل کے لطیف انداز میں فلسفہ کی خشکیوں کو ڈھالنا برق ہی کا کام تھا۔ اور کیوں نہ ہو، وہ اُس اُستاد کے شاگرد تھے جس کا یہ شعر ایک خشک حقیقت کا آئینہ دار ہونے پر بھی ہزاروں رنگینیاں اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے:-

جو برق و باد پہ قادر وہ اسقدر مجبور
کہ ایک سانس بڑھانے کا اختیار نہیں (آغا شاعر)

وقت بہت ہوگیا ہے اور اصل مقصد کی طرف ابھی تک توجہ نہیں دی جا سکی۔ آیئے اور دیکھئے کہ برق کی ہمنوائیاں اُن کو کس حد تک اپنے معاصروں کا ہم پایہ بناتی ہیں۔

مولانا حسرت فرماتے ہیں ؎

پایا کہیں جو شکوۂ گزارِ وفا مجھے — بولے وہ ہنس کے آپ نے یہ کیا کہا مجھے؟
ہر حال میں رہا جو ترا آسرا مجھے — مایوس کر سکا نہ ہجوم بلا مجھے
محفل میں دیکھنے کو کسی کے نہ دیکھنا — اب تک وہ آنکی یاد ہے شانِ حیا مجھے
ہر نغمہ نے انھیں کی طلب کا دیا پیام — ہر ساز نے انھیں کی سنائی صدا مجھے

حسرت کے بیان میں کتنی سادگی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ معنوی لطف بھی سمویا ہوا ہے۔

محفل میں دیکھنے کو کسی کے نہ دیکھنا — اب تک وہ اُن کی یاد ہو شانِ حیا مجھے

عجیب کیفیت کا حامل ہے

برق نے بھی اس زمین میں شعر کہے ہیں۔ دیکھئے زبان اور محاورہ کی صفائی کے ساتھ ساتھ کتنا جاندار تغزل ان اشعار میں ہے ؎

اسے چھڑائے گی شبِ ہجراں قضا مجھے — تیری طرح سے یہ بھی نہ پوچھے گی کیا مجھے؟

میٹھی چھری ہے دیگی یہ مل کر دغا مجھے
دیتی ہے تیری آنکھ فریب وفا مجھے

گھر بیٹھے دیکھتا ہوں تماشے جہان کے
آئینۂ خیال ہے جلوت سرا مجھے

میں نامرادِ دہر سراپا ہوں دردِ برق
سمجھو شکستِ شیشۂ دل کی صدا مجھے

فانیؔ آہ! فانی جو ہمیشہ کے لئے اپنی نادر بیانیوں سے ہمیں محروم کر کے اس منزل میں جا پہونچے جہاں برقؔ آج سے ۶ سال پہلے جا چکے ہیں، کہتے ہیں سے :-

کیوں جفاکیش کبھی تو بھی جفاکوش نہ تھا
وہ بھی دن تھے کہ خود اپنا ہی تجھے ہوش نہ تھا

جگرؔ لکھتے ہیں سے

یادِ ایام کے جلووں کا ترے ہوش نہ تھا

حسرت آوارہ نہ تھی عشق جنوں کوش نہ تھا
دن جوانی کے جگر بے خبری میں گذرے

ہوش کا وقت جب آیا تو مجھے ہوش نہ تھا

برقؔ نے ہوش کے قافیہ کو کس طرح اپنایا ہے، دیکھئے :-

غیر سے ربط بڑھایا جو وفا کوش نہ تھا
نشۂ حسن میں اتنا بھی تمہیں ہوش نہ تھا

تیرے بیمارِ محبت کو سحر کیا ہوتی
رات بھاری تھی سرِ شام ہی بیہوش تھا

فانیؔ کا شعر بہین بہین جھلکی لے کر دل کو موستا ہے۔ جگرؔ بیخودی و سرشاری کی

کیفیت پیدا کرتے ہیں اور برق اپنی شوخ بیانی کے ساتھ ساتھ تغزل کا رنگ نکھارتے ہیں۔

فانی کیا خوب فرماتے ہیں ؎

بھول جانے کے سوا اب تجھے کچھ یاد نہیں
کل کی ہے بات کہ تو وعدہ فراموش نہ تھا

برق نے کتنا اچھوتا مضمون پیدا کیا ہے ؎

پائے قاتل پہ قلم ہو کے گرا سر میرا
بعدِ مُردن بھی میں احسان فراموش نہ تھا

ایک مطلع بھی ہے ؎

دل میں دنیا کی محبت کا کبھی جوش نہ تھا
سبقِ روزِ ازل مجھ کو فراموش نہ تھا

فانی کہتے ہیں ؎

نگہِ شوق نہ تھی کیفِ اثر سے محروم
میری قسمت میں غمِ بادۂ سرجوش نہ تھا

جگر کی سرشاریاں دیکھئے ؎

حُسن بھی بزم میں جب تک کہ قدح نوش نہ تھا
بادۂ عشق میں نشہ تھا مگر جوش نہ تھا

مطلع کے معنی پر غور کیجئے اور جھوم جائیے

پھر کہتے ہیں:۔

ہائے آغازِ محبت کا وہ دَورِ سرشار
کونسا اشک تھا جو بادۂ سرجوش نہ تھا

برق کے کلام کا جوش بھی عجیب ہے:۔

ابرِ رحمت کے برسنے میں تو کچھ دیر نہ تھی
قلزمِ اشکِ ندامت میں مگر جوش نہ تھا
برق ممکن نہ تھا دل اسکا نہ ملتا تجھ سے
تیرے جذباتِ محبت میں مگر جوش نہ تھا

ثانی ندرت طراز ہیں:۔

دلِ مشتاق نہ تھا شکوہ طرازِ تپِ ہجر
گلۂ غم کا مرقع لبِ خاموش نہ تھا

برق نے کہا ہے:۔

کہہ دیا اُن سے نگاہوں نے مرا رازِ نہاں
لاکھ تھا مُہر بہ لب پھر بھی میں خاموش نہ تھا
عمر آغوشِ قناعت میں بسر کی ہم نے
آشنا حرفِ طلب سے لبِ خاموش نہ تھا

یک دوسری زمین میں دو باکمال ایک ہی مضمون کو دیکھئے کس طرح ادا کرتے ہیں ؎

زیست ہے زیست جو رگ رگ میں رواں ہو مئے عشق
موت ہے موت اگر رقص نہیں جوش نہیں

شعر اپنی مجذوبانہ اندازِ بیان کے باعث خود زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ میں جگر مرادآبادی کا جگر پارہ ہوں۔ مگر برقؔ جادہ سلوک کے رہگیر ہو کر یہی بات کہتے ہیں

میرے نزدیک وہ بدمست ہے ذی ہوش نہیں
جو غزا خانۂ ہستی میں طرب کوش نہیں

جگرؔ کے دوسرے شعر بھی کچھ کم وجد آور نہیں ؎

محوِ تسبیح تو سب ہیں مگر ادراک کہاں
زندگی خود ہی عبادت ہے مگر ہوش نہیں

حسن سے عشق جدا ہے نہ جدا عشق سے حسن
کون سی شے ہے جو آغوش در آغوش نہیں

درج شعر تو عجیب شعر ہے ؎

مٹ چکے ذہن سے سب یادِ گذشتہ کے نقوش
پھر بھی اک چیز ہے ایسی کہ فراموش نہیں

یہاں مطلب زیادہ برؔق کے کلام سے ہے اس لئے ان کے دو شعر اور پیش کرتا ہوں ؎

ہمہ تن گوش ہوں سُننے کو نوائے فطرت
آشنا سازسے یہ نغمۂ خاموش نہیں

اور یہ شعر بھی ایک تازیانۂ عبرت ہے ؎

نغمۂ راز ہے ہر تارِ نفس سے پیدا
خونِ فرصت ہے اگر تو ہمہ تن گوش نہیں

ایک زمین میں مولانا سیمابؔ کا کیا خوب مطلع ہے ؎

حسن سے دل میں جگہ پاتے ہی دیوانہ بنے
ہم ابھی راز بنے ہی تھے کہ افسانہ بنے

برؔق مرحوم کی رنگیں بیانی ملاحظہ ہو :-

کیوں نہ رُودادِ محبت ہو سراپا رنگیں
خونِ اُمید اگر سُرخیٔ افسانہ بنے

مولانا کا ارشاد ہے ؎

آج وہ بزم میں خود شمع بنے بیٹھے ہیں
ہے کوئی مُدعیٔ حسن جو پروانہ بنے

ذرّے ذرّے میں ہو اک شعلۂ پرواز مگر
ہو کشش گرمیٔ محفل کی تو پروانہ بنے

برق کا شعر بھی کسقدر مضبوط شعر ہے ؎

آتشِ عشق بہر رنگ ہے جاں داوۂ حسن
سرد ہو جائے جو یہ آگ تو پروانہ بنے

اصغر گونڈوی کے کچھ شعر اور ملاحظہ ہوں ان کی تمام غزل سیر ہے۔

مرتے مرتے نہ کبھی عاقل و فرزانہ بنے
ہوش رکھتا ہو جو انسان تو دیوانہ بنے
جز تمہارے تری مستی کی ادا ہو جائے
موجِ صہبا تری ہر لغزشِ مستانہ بنے

اسکو مطلوب ہیں کچھ قلب و جگر کے ٹکڑے
جیب و دامن نہ کوئی پھاڑ کے دیوانہ بنے

اس میں برق نے بھی خوب خوب شعر کہے ہیں ؎

دل جو صورت گرِ معنی کا صنم خانہ بنے
آنکھ جس شئے پہ پڑے جلوۂ جانانہ بنے
نقشِ وحدت جو خیالِ رُخِ جانانہ بنے
کعبہ جسپہ فدا دل وہ صنم خانہ بنے
اُتنے ہی ہو گئے ہم منزلِ عرفاں کے قریب
جسقدر ہم دیر و دہر سے بیگانہ بنے

ظرف مے ٹوٹ کے بھی ہونے نہ پائے بیکار
ہو شکستہ کوئی شیشہ تو وہ پیمانہ بنے

یہ مطلع تو کس قدر حوصلہ افزا ہے۔ زندگی کی کشمکش سے کون نہیں گھبرا جاتا مگر

برق یہی کہتے ہوئے دُنیا سے چلے گئے

سعیٔ ناکام سے میں ہاتھ اٹھاؤں گا نہ برق
میری بگڑی ہوئی تقدیر بنے یا نہ بنے

چکبست کا یہ شعر اُردو زبان کے لئے سرمایۂ تفاخر ہے اور فصاحت کی جان۔

ذرّہ ذرّہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

اس زمین میں بڑے ..... بڑے اُستادوں نے غزلیں کہی ہیں اور خوب خوب کہیں ہیں۔ آتش، ناسخ، آباد، اسیر وغیرہ نے اپنے جوہرِ طبع دکھلائے ہیں۔ دورِ جدید میں بھی باکمالوں نے اس زمین کو سرسبز و شاداب بنایا ہے لیکن چکبست کی غزل غزل کے بمقابلہ نظم کا رنگ لئے ہوئے ہے۔

مولانا سیماب فرماتے ہیں

لے چلی وحشی بنا کر فتنہ سامانی مجھے
حشر تک ڈھونڈا کرے اب خانہ ویرانی مجھے

باغ میں لے جائے ہو گر برگشتہ سامانی مجھے
پھول کھل کر دیں نوید چاک دامانی مجھے

اب بہ آسانی کرے گا جذب دریائے کرم
تو نے اے جوش ندامت کر دیا پانی مجھے

بے نیازِ محفلِ عالم ہوا سیماب میں
ہے غنیمت اپنے دل کی جلوہ سامانی مجھے

مولانا عزیز کے چند شعر ملاحظہ ہوں :۔

عمر گزری ہے تجمّل خانہ ویرانی مجھے
کیا ہوا ہستی سے حاصل جز پریشانی مجھے
اے حنائے دست قاتل دیکھ کر قسمت تری
رشک سے کرنا پڑا آخر لہو پانی مجھے

ہاں ملائے دشت کو اے وسعت شوق جنوں
ہے بہت کم اپنے کاشانے کی ویرانی مجھے

....

برق کی غزل بحد کامیاب اور مقبول ہے اور یہ شعر تو اُن کے حسب حال تھا ؎

مشکلات دہر نے بدلی وہ شکل زندگی
موت نے میری نہ پہچانا بہ آسانی مجھے

پھر ارشاد ہے ؎

ہیچ ہے میری نگاہوں میں متاع روزگار
گوہر نایاب بھی ہے بوند بھر پانی مجھے
میں مزے لیتا ہوں انداز عتاب یار کے
موج بحر حسن ہے ہر چین پیشانی مجھے
آئے ہیں وہ کھینچ کر مقتل میں تیغ آبدار
سر سے اونچا اب نظر آنے لگا پانی مجھے
بن ہوں افسردہ دلی پر اسقدر نازک مزاج
موج بوئے گل سے ہوتی ہے پریشانی مجھے
ساقیا دے پے بہ پے جام شراب آتشیں
رند ہوں میں آتش سیال ہے پانی مجھے

گاہے گاہے بادۂ گلرنگ پی لیتا ہوں برق
غم غلط کرنے کو راس آیا ہے یہ پانی مجھے

اگر گستاخی نہ ہو تو کہہ سکتا ہوں کہ برقؔ نے پانی کے قافیہ میں جو شعر نکالے ہیں وہ بہترین ہیں اور ان سے اُن کی اُستادانہ شان ٹپکتی ہے۔

چکبستؔ کہتے ہیں ؎

شرکتِ غم کا عزیزوں میں جو دستور نہیں
امتحاں اُن کی وفا کا مجھے منظور نہیں

کیوں رُلانے کو سُناتے ہو وفا کے قصے
دوستو اب تو محبت کا یہ دستور نہیں

تپشِ شوق کو مُوسیٰ کی نظر ہے درکار
ورنہ دنیا میں تجلّی نہیں یا طور نہیں

دار سونی ہے فقط نعرہ زنی باقی ہے
مست و مجذوب ہیں لاکھوں کوئی منصور نہیں

چکبستؔ کی غزل دُنیا کی حالت کا ایک مرثیہ ہے۔

جگرؔ نے اپنے رنگ میں خوب فرمایا ہے۔

اک جگہ بیٹھ کے پی لوں مرا دستور نہیں
میکدہ تنگ بنادوں مجھے منظور نہیں

قیدِ آدابِ محبت مجھے منظور نہیں
عشق دستور ہے خود عشق کا دستور نہیں

اللہ اللہ رے یہ رنگِ حقیقت کی بہار
کونسا خون کا خطرہ ہے جو منصور نہیں

سخت مشکل سے پڑا آج گریبان پہ ہاتھ
میں سمجھتا تھا کہ یہ فاصلہ کچھ دور نہیں

برقؔ کی جلوہ پاشیاں بھی خیرگیِ نظر میں خورشیدِ درخشاں سے کم نہیں۔

تابشِ حسن حجابِ رُخِ پُر نور نہیں
رخنہ گر ہو نگہِ شوق تو کچھ دور نہیں

لطفِ پنہاں سے جو بھر جائے تو کچھ دور نہیں ۔۔۔ زخمِ تیغِ نگہ ناز ہے ناسُور نہیں
نظر آتا نہیں گو منزلِ مقصد کا نشاں ۔۔۔ ذوقِ صادق یہی کہتا ہے کہ کچھ دور نہیں
رازِ سربستۂ فطرت نہ کھلا ہے نہ کھلے ۔۔۔ میں ہوں اس سعی میں مصروف جو مشکور نہیں
اُسکے پرتو سے ہو جذبات کی دنیا آباد ۔۔۔ آنکھ کو دور ہے وہ دل کو مگر دور نہیں
دم زدن میں ہو طے عالمِ فانی کا سفر ۔۔۔ کھل گیا راز کہ ہستی سے عدم دور نہیں

آپ نے دیکھا کہ برق اپنے معاصرین کے ساتھ ساتھ کہاں تک ہم قدم ہیں بعض میدانوں میں وہ معاصرین سے کچھ آگے بھی نظر آئیں گے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر میں برق کے کچھ اشعار آپ کی خدمت میں اور پیش کروں یہ اشعار حرفِ ناتمام سے اقتباس کئے گئے ہیں۔ مرحوم کا یہ مجموعہ کلام مرحوم کے لائق شاگرد یعنی میرے عزیز شیش چندر طالب کی کوشش سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

برق کی زندگی میں ان کی کافی قدر ہوئی اور آج بھی زمانہ اُن کے حُسنِ کلام کا دلدادہ و مداح ہے۔ اِس لئے ان کا یہ شعر اگرچہ ان کے جذبات کی صحیح تصویر ہے مگر حقیقت سے کوسوں دور ہے۔

کھل کے مرجھا بھی گیا آنکھ کسی کی نہ پڑی
میں چمن زارِ جہاں میں گُلِ صحرائی تھا

ہزار بلبلِ بیکس ہو گرمِ نالۂ شوق — ہے اک ادائے خموشی جوابِ خندۂ گل
یہی ہے باغِ جہاں میں شگفتگی کا مآل — بجز خزاں نہیں تعبیرِ خوابِ خندۂ گل

بہ فیضِ ساقیٔ میخانۂ بہار ہے آج
لگی ہوئی ہے سبیلِ شرابِ خندۂ گل

یہیں راہِ طلب میں خاک ہو جانے سے مطلب ہے
قدم پہنچے نہ پہنچے منزلِ مقصود پر اپنا

ہوائے مرگ کی زد میں چراغِ زندگانی ہے
مجھے آغاز میں انجام آتا ہے نظر اپنا

چشمِ کم بیں واقفِ نیرنگیٔ فطرت نہیں — ایک جلوے کی فراوانی ہی یہ کثرت نہیں
اہلِ دل کو غیب سے ملتی ہے نعمت عشق کی — بوالہوس کے ہاتھ آجائے یہ وہ دولت نہیں

میں وفا سے ہاتھ اٹھاؤں وہ جفا سے باز آئیں
عشق کی وہ خو نہیں یہ حسن کی فطرت نہیں

اور یہ شعر تو شاید اپنا جواب نہیں رکھتا

مجھ سے سہواً بھی خطا ہو تو لرز جاتا ہوں
خونِ انصاف جو کرتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں؟

رہیگا کس کا حصہ بیشتر میرے مٹانے میں
یہ باہم فیصلہ پہلے زمین و آسماں کر لیں
شرار آتش گل سے نشیمن پھونکدیں اپنا
چمن کی منجمد بجلی کو برق آشیاں کر لیں

چراغ داغ دل بجھنے پہ بھی لو دے اُٹھے شاید
کہ پنہاں سوز الفت ہے ان افسردہ شراروں میں
نہ مژگاں سے دفور ضبط نے ڈھلنے دیئے آنسو
یہ دریا غرق ہو کر رہ گیا اپنے کناروں میں
حقیقت شاہد حسن ازل کی کھل نہیں سکتی
کیا ہے کچھ اشارہ فلسفہ نے استعاروں میں

بند آنکھیں تھیں تو دنیا تھی مرے پیش نظر
کھل گئیں آنکھیں تو پھر یہ خواب کی محفل نہ تھی

سراپا بے خطا ہوں اور وہ خنجر کشاں پھر بھی
برنگ شمع ہوں خاموش کٹتی ہے زباں پھر بھی
چھپاتا ہوں مگر چھپتا نہیں سوز نہاں پھر بھی
چراغ داغ افسردہ ہے، دیتا ہے دھواں پھر بھی

یہی دو چار تنکے کائنات آشیاں کیا ہے
جلانے کے لئے بیتاب ہے برقِ طپاں پھر بھی

کیا دم کا اعتبار دم واپسیں نہ ہو
ہر اک نفس پہ سجدۂ شکرانہ چاہیئے

دولتِ دید ملی ہم کو نہ لطفِ گفتار
ہمہ تن دیدِ تماشا ہمہ تن گوش رہے
بسترِ خاک پہ وہ آج ہیں ہم پہلوئے گور
عہدِ طفلی میں جو آغوش در آغوش رہے
برقؔ کب آتشِ الفت میں دھواں اٹھتا ہے
یہ ہے وہ آگ بھڑک کر بھی جو خاموش رہے

غرض کہ برقؔ نے اپنا یہ قول حرف بہ حرف صحیح ثابت کر دیا۔

حسنِ تاثیرِ لبِ زمزمہ پرداز میں ہے
نغمہ ہر رنگ کا خوابیدہ مرے ساز میں ہے

آپ برقؔ کو میکدۂ غزل کی کسی صف میں بھی بٹھلائے، وہ آپ پر چھا کر رہینگے
اُردو دُنیا پر برقؔ کے عظیم احسانات ہیں۔ اُردو دُنیا ان احسانوں کو کس طرح
ادا کرتی ہے، یہ ہمیں دیکھنا ہے۔

خطبۂ صدارت[۱]

(جناب خواجہ عبدالمجید صاحب بی۔ اے)

زہ بر خاکِ شہیدانِ سخن ضائع مکُن ۔۔۔ نامِ ایشان ثبت دار و کارِ ایشاں پیش گیر
برقؔ باشد یادِ من اُو رفتہ و من می روم ۔۔۔ نالہ و شیون نہ زیبد از اسیرے بر اسیر

برقؔ کو مرے چھ سال گزر گئے۔ نامِ نیکاں یاد ماند۔ ہر سال برسی ہوتی ہے۔ یہ کچھ کم ہے؟ اُن کے کلام پر بڑے بڑوں نے تبصرہ کئے اور خوب کئے۔ ہتی خمخانہا کردند و رفتند۔ رفتند نہیں۔ الحمد للہ زندہ ہستند و ان شاء اللہ تا دیر زندہ مانند۔ بندہ کو ز شجاری ناگوار۔ ہاں اُن کے کلام کے امتیاز کا ایک خاص پہلو نظر آتا ہے۔ ممکن ہے میں غلطی پر ہوں۔ تمام کا کلام سب نظر سے گزرا ہے۔ حال کے شعرا کے کلام سے ناواقف۔ اس کو بدقسمتی پر محمول کرتا ہوں۔ تاہم واقعہ ہے۔

برقؔ کا دور اردو شاعری کی دو صنفوں کے تصادم کا دور ہے۔ گل و بلبل کی شاعری اور حقائق گزاری۔ صنفِ ثانی کو اپنے زمانہ میں نیچرل شاعری کہا گیا۔ اسکی توجیہ کا موقع نہیں۔ اس کیاس زمانہ کلام ایجاد کہنا روا نہیں۔

---

[۱] اسلام برق ۱۹۴۲ء کا جلسہ نواب صاحب موصوف کی صدارت میں ہوا چنانچہ آپ نے یہ مضمون بطور خطبۂ صدارت نذر قارئین ۔۔۔

پہلے بھی اُردو میں ہوئی۔ یہ دان نہیں چڑھی۔ نظیر اکبرآبادی کا کلام شاہدِ حال اس کو فروغ نہیں ہوا۔ شاعر پُرگو تھے۔ مضامین دلچسپ، حسنِ بیان سحر عاری۔ اس دَور میں حالی اور اکبر الہ آبادی نے اس صنف کی آبیاری کی اور کشتِ زار کو گلزار بنادیا۔ بعد میں جو آئے خوشہ چیں آئے۔ ایجاد کا تو نہیں، برتری کا سہرا اُن کے سر رہا۔ یہ عجیب دَور تھا صنفیں دوش بدوش چل رہی تھیں۔ تغزل کا معراجِ کمال داغ کی سحرکاری کا ممنون۔ محاورہ بندی اور معاملہ بندی ہم عنان۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ اب یہ میدان تنگ تازپربند نظر آتا ہے۔ فرمائیے آپ مختار ہیں ہنہ فرمائیں تو بہتر ہے۔ دوسری راہ کشادہ ہے۔ اس میں کیوں نہ طبع آزمائی کی جائے؟ چبائے ہوئے نوالے چبانے کیا ناگوارِ طبع نہیں؟ نشیب و فراز راہِ ہموار ہو چکے ہیں۔ خوشنما نمونے پیشِ نظر ہیں۔ گام زن ہونے کی دیر ہے۔ پھر باغِ نوبہار کھلا نظر آئے گا۔ اس بحث میں اپنے موضوع سے دُور جا پڑا۔

جی ہاں برقؔ نے بڑی کاری گری کی۔ بیان کی خوش اسلوبی کے ساتھ حقائق نگاری سے کام لیا۔ یہ ہی نہیں۔ اس باغ میں جو پودے پہلی مرتبہ لگائے چکبستؔ بھی اسی باغ کا مالی ہے۔ پودے لگائے مگر نئے نہیں۔ معاف فرمائیےگا ہندو روایات کو اُردو شاعری میں لانا ضروری ہے۔ زبان میں بھی سنسکرت کے الفاظ آئیں تو کیا خوب یہ برقؔ کی بالغ نظری ہے۔

آپ گھبرایئں نہیں۔ اس وقت اس بات سے لوگ ذرا آتش زیر پا ہو رہے ہیں۔ ایوانِ شوریٰ سرکارِ عظمت مدار میں بھی سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ کا قول ہے کہ کہیں اردو دریا میں اسپ تازی اور فارسی کی جولانگاہ نہ بن جائے۔ دوسرے گروہ کو کجلی بن کے فیلانِ مست کی رزمگاہ کا اندیشہ دونوں اپنے اپنے کاموں میں مصروف کار۔ دربار زیرِ ملکِ کوبِ حوادث سمجھ کا پھیر ہے۔ خدا شرّے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد۔ جناب زندہ زبان کس کو کہتے ہیں؟ خدا نہ کرے اس چمنِ ہمہ بہار میں مُردہ کا نام بھی آئے۔ زبان میں الفاظ کا گردہ در گردہ داخل ہونا، نمو کی تیزی کی دلیل ہے۔ اللّٰہم زد فزد۔ اس کی پروا نہیں۔ الفاظ کہاں سے آئے۔ جن پودوں کو اس چمن کی ہوا راس ہوگی، زندہ رہیں گے چشمِ ما روشن دلِ ما شاد۔ جن کو ناموافق مرجائیں گے۔ ہم ان کا بھی ماتم کریں گے۔ موقع ومحل نہیں ورنہ اس معاملہ میں عربی زبان کی خصوصیات بیان کرتا اور آپ حیران رہ جاتے۔ اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ کوئی قدیم زبان ایسی نہیں جس کے لاتعداد الفاظ اس میں موجود نہیں۔ یہی اس کے ہمہ گیر ہونے کا راز ہے۔ میری پیشین گوئی یاد رہے۔ یہی چیز ایک دن اردو کو عالمگیر بنائے گی۔ دنیا کی موجودہ زندہ زبانوں میں کوئی زبان اس تیزی سے ترقی نہیں کر رہی۔ ترقی وہی نئے الفاظ کا ادخال تفصیل کا وجہ طوالت۔ معافی کا خواستگار ہوں۔

کیوں صاحب۔ بحرِ اوقیانوس کو مہاساگر کہیں تو بُرا۔ اوقیانوس اچھا اگرچہ لفظ عربی کا بھی نہیں عبرانی کا۔ بحرالکاہل۔ شانتی ساگر بکاہل کے لفظاً وہ معنی نہیں جو شانتی میں ہیں۔ اس موقع پر شانتی زیادہ موزوں۔ اُردو زبان ہندوستان کی دونوں قوموں کا مشترک ورثہ ہے۔ تصرف کا دونوں وارثوں کو اختیار۔ ایک کا تصرف بجا اور دوسرے کا بیجا۔ کیا خوب۔ ہاں ایک عرض ہے۔ تصرّف افتراق کی حد کو نہ پہنچے، ورنہ میراث تقسیم ہوجائے گی۔ اور دونوں جزِ منقسم ضعیف۔ اتحاد میں جو لطف اور طاقت ہے وہ نفاق میں نہیں۔

مجھے تعجب ہوتا ہے۔ جب میں قدیم زمانہ کے ہندو شعرا کو حمد باری تعالیٰ نعتِ رسولِ اکرم اور منقبت حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے راگ گاتے دیکھتا ہوں۔ آخر تقلید کی کوئی انتہا ہے۔ الناسُ وعلی دین ملوکہم۔ کا راز یہیں کھلتا ہے۔ اب تو مالک کوئی نہیں، دونوں ملوک ہیں۔ اس قصہ کو چھوڑیئے۔ آپ اپنے روایات کو زندہ کیجئے۔ ہم اپنے تاکہ سرمایۂ علم و دانش میں افزائش ہو، ایک دوسرے کے خیالات سے اور روایات سے مستفید ہوسکیں۔ تعصب کی عینک اتار دیجئے۔ حقیقت کی روشنی میں دیکھئے ہندو شاعر جو اُردو زبان کی شاعری میں پیچھے نظر آتے ہیں۔ میری ناقص عقل میں اس کی یہی وجہ ہے۔ نقل میں اصل کا لطف نہیں ہوتا۔ ؎

ہر چند کہ صنعت سے بنائے کوئی نافہ
پہنچیگا نہ وہ نافۂ آہوئے ختن کو

برقؔ کے کلام میں یہ جدت ہے اور پیروی لازمی۔ برقؔ کے ہاں الفاظِ نامانوس داخل ہیں۔ مگر کس کے لیے؟ مسلمانوں کے لئے نہ کہ ہندوؤں کے لئے۔ کیوں صاحب! ہمارے کلام میں عربی الفاظ کیا ہندوؤں کے لئے نامانوس نہیں۔ وہ تو جائز اور سنسکرت کے ناجائز۔ اپنا پوت پرائے کا دہینگرا۔ ترقی کا زینہ یہ ہے۔ ہم سنسکرت کے الفاظ سیکھیں، وہ عربی کے یوں زبان کو فروغ ہو۔ ہر لفظ ایک شان رکھتا ہے جو دوسرے میں نہیں ہوتی۔ یہی شان اس کو مختص کر دیتی ہے۔ زبان میں جتنے لفظ زیادہ ہوں گے، زبان کی شان بڑھے گی۔ مطلب نگاری اور شاعری آسان اور خوشنما ہوتی چلی جائے گی۔ برقؔ نے اس راز کو سمجھا اور اس کام کو کیا۔ کامیابی کا دارومدار آپ کے ہاتھ ہے۔ روایات بیان کر دینے کافی نہیں۔ ان میں جان حسنِ بیان اور حسنِ زبان ڈالتا ہے۔ یہ کام آپ صاحبوں کے کرنے کا ہے۔ کیجئے اور برقؔ کے حسنِ عمل کو کمال تک پہنچائیے۔ غزل گوئی سے ہاتھ اٹھائیے۔ حقائق نگاری کی طرف آئیے آپ بھی زندۂ جاوید بنئے اور اپنے کارنامہ کو بھی زندۂ جاوید بنائیے۔ غزل گوئی کی تقلید آپ کو برباد کر رہی ہے۔ زمین پامال ہے ہر کہ دمہ قدم اٹھانے کو

تیار ہو جاتا ہے۔ اپنی اوقات بھی ضائع کرتا ہے اور سننے والوں کی بھی۔ کیا کرے، مجبور ہے۔ واہ واہ کا شوق دامنگیر ہے۔ اتنا مادّہ نہیں کہ حقائق نگاری کر سکے مجبوراً کولہو کا بیل بننا پڑتا ہے۔ نظم نگار اگر ہزار ہیں تو نثار دو چار۔ نثر میں اپنی گرہ کا درکار ہے۔ نظم میں دوسروں کے باغوں سے لاکر ڈالی سجائی جاسکتی ہے۔ میں نے کافی سمع خراشی کر لی۔ معاف فرمائیے اور مجھے اجازت دیجیے۔

برقؔ دہلوی[۱]

(جناب منشی شیام موہن لال جگرؔ بی اے. بریلوی)

افتخار الشعرا منشی مہاراج بہادر برقؔ دُنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ یوں بھی عطر آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ لہٰذا ان کے نجی، ذاتی اور خاندانی حالات سے قطع نظر کرتے ہوئے اِن کے کلام سے بحث کرتا ہوں۔

جس زمانہ میں حضرتِ برقؔ کی شعر گوئی کی ابتدا تھی اُس وقت جدید شاعری کی بُنیا دیں قائم ہو چکی تھیں۔ جدید مذاق انگریزی نظموں کے بے کیف اور خشک ترجموں کی تقلید سے معمور رہے۔ سرورؔ جہان آبادی نے خالص وطنی قالب میں اسے ڈھال کر لطافت، رنگینی اور پاکیزگی کی ایسی روح اس میں پھونکی جو ہمیشہ دلوں کو تڑپاتی رہے گی۔ برقؔ مرحوم نے بھی جدید رنگ اختیار کیا اور دہلی اسکول میں نظم نگاری کو ممتاز حیثیت دی۔ اپنی قوتِ فکر سے اس میدان میں وہ چمن کھلایا جو اُردو ادب کے لئے

---

[۱]:۔ تعارف کے عنوان میں اُستاذی مرحوم کے ضمن سوانح و خاندانی حالات کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ انھیں جگرؔ صاحب کی اجازت سے یہاں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ طالبؔ دہلوی

باعثِ زینت رہے گا۔ جدید شاعری کے علاوہ آپ نے غزل بھی کہی۔ میں پہلے نظموں کے متعلق کچھ لکھتا ہوں۔ آپ کی نظموں میں شاعری کے اعلیٰ جوہر نمایاں ہیں۔ ان میں بڑی روانی اور دُرخشانی ہے۔ زبان دہلی کی مستند زبان ہے، فارسی الفاظ اور ترکیبوں کی آمیزش اس انداز سے کی ہے کہ کلام میں شکوہ، جوش اور تابانی کا حسن پیدا ہو گیا ہے۔ بعض بعض نظموں کو بڑا نورانی بنا دیا ہے۔ آپ حسنِ فطرت سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ بسنت کی ولولہ انگیز بہاروں پر بار بار نغمہ سرائی کی ہے اور بڑی دلکش اور کیف آور نظمیں لکھی ہیں۔ جذبات بڑے پاکیزہ ہوتے ہیں حسن کی تاثیر ہوس کارانہ خیالات نہیں پیدا کرتی بلکہ عرفانیت کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اوائل عمر سے آپ کا میدانِ طبع نیکی و نکوکاری کی طرف تھا اور سب سے پہلے انہیں خیالات نے نظم کی صورت اختیار کی۔ شمارِ خیر میں لکھتے ہیں :۔

بتا اے خاک کے پتلے کہ دنیا میں کیا کیا ہے　　بتا کے دانت ہیں منھ میں سے ترکھایا پیا کیا ہے

بتا خیرات کیا کی راہِ مولا میں دیا کیا ہے　　یہاں سے عاقبت کے واسطے توشہ لیا کیا ہے

دعائیں لیں کبھی ٹھنڈا کیا دل تفتہ جانوں کا

ہوا ہے تو کبھی راحت رساں تشنہ دہانوں کا

کسی گم کردہ رہ کی خضر بن کر رہنمائی کی　　کسی کی ناخنِ تدبیر سے عقدہ کشائی کی

دم مشکل کسی مظلوم کی حاجت روائی کی
کسی کی دستگیری کی کبھی کچھ بھلائی کی
کبھی کچھ کام بھی آیا کسی آفت رسیدہ کے
کبھی دامن سے پونچھے تو نے آنسو آبدیدہ کے

آگے چل کر لکھتے ہیں :-

فنا و زیست کا اک روز قصہ پاک ہونا ہے
اجل کے ہاتھ سے دامانِ ہستی چاک ہونا ہے
کسی دن خاک کا تودہ تہِ افلاک ہونا ہے
کہ آخر خاک کے پتلے کو مِل کر خاک ہونا ہے
حباب آسا قرارِ زیست ہے دُنیائے فانی میں
جو تجھ سے ہو سکے کر لے بھلائی زندگانی میں

نظارہ چشمِ معنی خیز سے کر باغِ امکاں کا
سبق آموز ہے ایک ایک ذرہ اس گلستاں کا
نہ ہو محوِ تماشا ہوش رکھا اپنے تن و جاں کا
اُلجھنے پائے کانٹوں میں نہ گوشہ تیرے داماں کا
بسر کر زندگی قیدِ تعلق سے جُدا ہو کر
برنگِ سبزۂ بیگانہ رہ نا آشنا ہو کر

کیسی سبق آموز نظم ہے اور کیسے پاکیزہ خیالات سے مملو۔ شاعر کی اُفتادِ طبع اس سے بخوبی آشکارا ہو گئی۔ یہی رنگ مشقِ سخن کے ساتھ ساتھ نکھرتا گیا اور شاعرانہ دلفریبیوں کے ساتھ حکمت و فلسفہ و عرفانیات پر چھا گیا۔ اسی میں برق مرحوم کی شاعری کا پیام ملتا ہے۔..........

..........اکثر نظمیں ہندوانہ رنگ کی ہیں جن میں بعض خاص

مذہبی اثر رکھتی ہیں۔ مثلاً راس لیلا، کرشن بھگوان، کرشن اوتار، کرشن سداماں، پریم کا تحفہ، بن باسیوں کی وطن میں آمد، بھرت ملاپ، وغیرہ وغیرہ۔ یہ نظمیں بھگتی اور پریم کی کیفیتوں سے لبریز ہیں۔

آپ کے یہاں تنوعِ مضامین بھی کافی ہے جس سے آپ کی ہمہ گیر طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاعر کو ہر باعظمت اور شاندار چیز میں حسن نظر آتا ہے چنانچہ گرو نانک، میرا بائی، پدمنی کا جوہر، زیب النساء کی قبر، مہارانا پرتاپ وغیرہ نظمیں اسی حسن کے اثر سے لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسی ہیں کہ باید و شاید۔ میرا بائی پر جو نظم ہے واقعی موتیوں کی لڑی ہے۔

مرحوم کے خیالات کا سرچشمہ گیتا جیسے مقدس بحرِ معرفت سے نکلا ہے جس سے آپ نے اپنے تمام چمنستانِ سخن کی آبیاری کی ہے۔ کوئی بھی موضوع کیوں نہ ہو گھوم پھر کے عارفانہ مرکز ہی پر آ جاتے ہیں اور یہیں آپ کی لے ٹوٹتی ہے ’حسن فطرت‘ میں لکھتے ہیں:۔

اِک جلوہ گہ حسن ہے یہ عالم اسباب نظارہ بداماں ہے رخِ مہر جہانتاب
ہے چادرِ مہتاب کہ اک نور کا سیلاب ہر اخترِ تابندہ ہے رشکِ دُرِ نایاب

ہے وسعتِ دامانِ فلک حسن سے لبریز
آنکھیں ہوں تو ہیں ارض و سما حسن سے لبریز

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

ہر ذرے کے دامن میں ہے اک حسن کی دُنیا — ہر قطرے میں ہے قلزمِ زخار کا نقشا
ہر ذرّے کی خرمن کے ہیں آثار ہویدا — ہر شعلے میں ہے برقِ سرِ طور کا جلوا
ہر جزو کے آئینے میں عکسِ رُخِ کل ہے
ہے اپنی جگہ ایک چمن زار جو گل ہے

جو منظرِ دلچسپ ہے زود رس نظر ہے — نیرنگِ شبِ تار ہے یا نورِ سحر ہے
ہے غنچۂ دوشیزہ کہ شبنم کا گہر ہے — ہر شے میں نیا حسن نیا رنگِ اثر ہے
جو شعلۂ بیتاب میں سامانِ تپش ہے
روئے گلِ خنداں میں وہی جذبِ کشش ہے

دل میں اگر ہے آرزوئے حسن پرستی — ہے عالمِ تصویر صنم خانۂ ہستی
فرش سے تا عرش یہاں اوج کہ پستی — انوار سے معمور ہے یہ حسن کی بستی
جو ذرہ ہے وہ خاتمِ قدرت کا نگیں ہے
جو شکل ہے اس آئینہ خانے میں حسیں ہے

"سبزۂ بیگانہ" میں کہتے ہیں:-

کب یہ خیال تھا ترے وہم و گمان[۱] میں — وہ حرف میں نے ڈال دئے تیرے کان میں
پورا اُترنا چاہے اگر امتحان میں — بیگانہ وار تو بھی بسر کر جہان میں

۱:- جو ارباب فن اس ترکیب عطفی میں اعلانِ نون پر انگلی رکھیں وہ ترقی پسند شعرا کا کلام دیکھیں انھیں معلوم ہوگا کہ یہ سب حضرات ان زنجیروں کو توڑ رہے ہیں، اور ان میں حضرتِ جوش سب سے آگے ہیں۔

نیرنگ روزگار کا شائق نہ ہو کبھی
غافل اسیرِ دامِ علائق نہ ہو کبھی

ہرگز ستم نہ توڑ کسی ناتوان پر
بے فائدہ عذاب نہ لے اپنی جان پر

دارِ فنا میں پھول نہ تو عز و شان پر
او مشتِ خاک اڑ کے نہ چل آسمان پر

ہشیار ہے تو دہر میں دیوانہ بن کے رہ
باغِ جہاں میں سبزۂ بیگانہ بن کے رہ

چند بند "شمعِ کشتہ" کے لکھتا ہوں۔ اس نظم میں شمع کی سی ضیاباری اور پروانوں کی سی دلسوزی بھی موجود ہے:۔

رات دن تو نے مزے لوٹے ہیں سوز و ساز کے
دیدنی تھے رنگ تیری جلوہ گاہِ ناز کے
تجھ سے سیکھے ڈھنگ پروانوں نے ضبطِ راز کے
حوصلے نکلے بقدرِ ظرف ہر جانباز کے
جو فدا ہونے بڑھا رخسارِ آتشناک پر
گر پڑا آتش بجاں ہو کر بساطِ خاک پر

(اس کے آگے آٹھ بند اور ہیں۔ آخری بند یہ ہے)

تیرے گل ہوتے ہی قصہ مختصر کچھ بھی نہ تھا
خواب کا نقشہ تھا سب نیرنگ اثر کچھ بھی نہ تھا

کھل گیا جزبے ثباتی جلوہ گر کچھ بھی نہ تھا
رات بھر کی ساری رونق تھی سحر کچھ بھی نہ تھا
شمع کشتہ تو مجسم یاس کی تصویر ہے
یا بیاضِ صبح پر اندوہ کی تفسیر ہے

"جوش بہار" کے چند بند لکھتا ہوں۔ واقعی قاآنی کے قصائد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے:۔

ہوا کی جنبشوں سے گل، برس رہے ہیں پے بہ پے
شگوفہ ریز ہیں شجر کہ ڈھل رہے ہیں جام مے
سرور خیز کس قدر چمن کی ہے ہر ایک شے
ترانۂ ہزار ہے خجل کن نوائے نے
چٹک میں غنچے کی اثر لبِ ادائے جانفزا کا ہے
تبسم لطیف میں یہ شائبہ حیا کا ہے
کرشمۂ بہار ہے کہ نخلِ گلبدن بنے
یہ زینتیں نمو کی ہیں کھڑے ہیں سب دُلہن بنے
یہ فیضِ برشگال ہے کہ خاک سے چمن بنے
یہ رحمتِ کریم ہے کہ غیرتِ عدن بنے
ضیا میں مثلِ برق ہے ادائے دلفریبِ گل
کہ جنتِ نگاہ ہے جمالِ دیدہ زیبِ گل

اسی طرح پوری نظم میں اوّل سے آخر تک سلاست، روانی، دلکشی شوخیٔ بیان کی کثرت اور کیف بہار چھایا ہوا ہے۔

مسٹر آصف علی بیرسٹرایٹ لا۔ ایم۔ ایل اے نے برق مرحوم کے ایک مجموعۂ کلام پر مختصراً تبصرہ فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ عارفانہ تجسّس ہندو متفکّروں اور شاعروں کے خمیر میں ہے۔ یہ رائے بڑے وسیع مطالعہ پر مبنی ہے اور ہندوؤں کے ایک شاعرانہ امتیاز پر مہر تصدیق، موضوعاتی لفظیں تو حکمت، و فلسفہ کے نور سے منور ہیں ہی۔ برق مرحوم نے غزل میں بھی عارفانہ خیالات کی شمع روشن کی ہے۔ غزل کے عامیانہ رنگ سے بچ کر کلیتہً اُسے حکیمانہ خلعت سے آراستہ کر دینا آسان کام نہ تھا۔ آپ نے یہ مشکل راہ اختیار کی اور یہ ان کی غزل کا مابہ الامتیاز ہو گیا۔ جذبات پاکیزہ، خیالات بلند اور مسائل بلند تر آپ کے اشعار کی بنیاد ہیں، وحدت، وکثرت، بقا و فنا، حیات و ممات، تخلیقِ عالم، مدعائے آفرینش، مکافات عمل، وغیرہ وغیرہ کے اسرار آپ نے غزل میں کھولے ہیں اپنی قادر الکلامی سے ہر شعر کو چست، مضبوط اور رواں بنا دیا ہے اور دِلّی کی زبان کا سٹھاس اس میں بھر دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

دو عالم میں نظر آتا ہے جلوہ سربسر اپنا
تماشا دیکھتا ہے آپ حسن خود نگر اپنا

ہیں راہِ طلب میں خاک ہو جانے سے مطلب ہے
قدم نیچے نہ پہنچے منزلِ مقصود پر اپنا

میسر ہو گا اَوج خاکساری خاک میں مل کر
فلک پر اُڑ کے پہنچیگا غبارِ منتشر اپنا

ہوائے مرگ کی زد میں چراغ زندگانی ہے
مجھے آغاز میں انجام آتا ہے نظر اپنا

ہر نفس شکرانۂ معبود ہونا چاہیے
زندگی کا کچھ نہ کچھ مقصود ہونا چاہیے

کعبہ و بتخانہ کیوں مسجود ہونا چاہیے
لایقین کس لئے محدود ہونا چاہیے

عالم اسباب ہی یک جلوۂ حسن ازل
ذرہ ذرہ کعبۂ مقصود ہونا چاہیے

ہستیٔ قطرہ ہو جیسے بحر بے پایاں میں گم
یوں وصال شاہد و مشہود ہونا چاہیے

کیوں حجاب ہوا ہے مانع ذوق نظر
فاش راز ہستیٔ بے بود ہونا چاہیے

سوز دل سے رخت ہستی پر نہ آنچ آئے کہیں
کچھ علاج آتش بے دود ہونا چاہیے

رکھ اسے پہلو میں بے لوث غبار آرزو
دل کا آئینہ نہ زنگ آلود ہونا چاہیے

جوش ہمت کا تقاضا ہے کہ اک اک گام پر
صرف راہ منزل مقصود ہونا چاہیے

غرضکہ فی الواقعی مصنف کا یہ قول اسپر سو فیصدی صادق آتا ہے

نغمہ ہر رنگ کا خوابیدہ مرے ساز میں ہے

برق کی شاعری

(جناب اشرف صبوحی ۔ دہلوی)

ماخوذ از "الہام" ۔ دہلی ۔ جنوری ۱۹۳۲ء

کسی شاعر کے کلام پر تنقید یا تبصرہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ شعر کی ماہیت سے بحث کی جائے ۔ آخر وہ خوبیاں بھی تو معلوم ہوں جن سے شاعری کا کمال ظاہر ہوتا ہے لیکن اس وقت ہم اس بحث کو نظر انداز کرتے ہیں۔

ارباب ذوق اس سے بے خبر نہیں ۔ شاعری کائنات کی ذہنی اور خارجی اشیا کی آئینہ دار ہے ۔ عالم محسوسات ۔ دولت کے انقلابات ۔ سیرت انسانی ۔ معاشرت اور وہ تمام چیزیں جن کا تصور میں آنا ممکن ہے اور جن کی سمائی نہ مصوری میں ہو نہ موسیقی میں، شاعری میں بے تکلف سما سکتی ہیں ۔ شاعری کی مقدم شرط تخیل ہے ۔ یہ قوت جسقدر شاعر میں ہو گی اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجہ کی سمجھنی چاہیئے ۔ اب رہا خیال کا اظہار، یہ کائنات کے مطالعہ اور مشق پر منحصر ہے ۔ کیونکہ قوت متخیلہ کتنی ہی قوی بھی اگر ماحول پر نظر نہیں تو شعر ہرگز نیچرل نہیں ہو سکتا ۔ پھر سلیقہ اور الفاظ کا تناسب ہے جن کے ذریعے سے خیالات قلمبند کئے جاتے ہیں ۔ جن شاعروں میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ اپنے افکار سے

اپنے ہمجنسوں کے دلوں میں اثر اور جوش پیدا کر سکیں انھیں ایک ایک لفظ کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال برق آنجہانی اپنے وقت کے ایک فطرت نگار جذبات کی مصوری کرنے والے شاعر تھے۔ ان کے ایک ایک شعر میں شاعری کی روح بولتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مطلع انوار کی پہلی نظم "جلوۂ حق" کے پہلے بند کا تیسرا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

رنگ نوائے راز ہے ہستی کے ساز میں
ذرہ ذرہ بس رہی ہے حقیقت مجاز میں

کتنا بلند، کس قدر شعریت سے لبریز اور کس انداز میں راز درون خانہ کی بیرون در نمائش کر رہا ہے۔ دوسری نظم "حسن فطرت" میں لکھتے ہیں:۔

اک جلوہ گہ حسن ہے یہ عالم اسباب
نظارہ بداماں ہے رخ مہر جہانتاب

ہے چادر مہتاب کہ اک نور کا سیلاب
ہر اختر تابندہ ہے رشک دُر نایاب

ہے وسعت دامان خلا حسن سے لبریز
آنکھیں ہوں تو ہیں ارض و سما حسن سے لبریز

جھرمٹ میں ستاروں کے ہے کیا شان جمالی
کس درجہ ہے دلکش شفق شام کی لالی؟

نئے ہیں کہ پھولوں میں ہے ٹلتی ہوئی ڈالی
دنیا میں کوئی چیز نہیں حسن سے خالی

بیتابی امواج میں بھی حسن نہاں ہے
یہ جنبش پیہم کا سماں اور کہاں ہے

حسنِ فطرت کی کیا نظر نواز تصویر کھینچی ہے۔ قدرت کے جلوے دیکھنے والی آنکھیں جس طرح پھولوں میں خالقِ کائنات کے حسن کی جھلکیاں دیکھتی ہیں اسی طرح کانٹے بھی اُن کی نگاہوں کے لئے کچھ کم حسین نہیں۔ جمال آرا کی ہر ادا جمیل ہوتی ہے۔ بہار و خزاں تو صرف پردے ہیں۔ خوب و زشت کا سوال کیسا؟

باتیں ہیں ہزار مگر مدعا ہے ایک

آگے چل کر اسی نظم میں "ہمہ اوست" کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے بعض مصرعے ملاحظہ ہوں :-

پھیلا ہوا ہر سمت ہے اِک دامِ تماشا
دامانِ فضا حسن کے جلوؤں سے ہے معمور
ہیں دفترِ ہستی کے ورق دید کے قابل
جو شعلۂ بیتاب ہیں سامانِ تپش ہے　　　روئے گلِ خنداں میں وہی جذب و کشش ہے
دل میں ہو اگر آرزوئے حسن پرستی
ہے عالمِ تصویر صنم خانۂ ہستی
انوار سے معمور ہے یہ حسن کی بستی
ذرہ ہے وہ خاتمِ قدرت کا نگیں ہے　　　جو شکل ہے اس آئینہ خانہ میں حسیں ہے

دامِ تماشا، پھیلا کر تمام منطقی اعتراضات سے کس طرح بچے ہیں۔ اسی کا نام شاعری ہے۔ اور پھر دل کی آنکھیں کھول کر حسن کی شان دکھانے لگے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی نظر حسن فطرت کے مطالعہ میں مصروف ہے۔ اس کا تخیل سطحی نہیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے لئے طور در آغوش ہے ظلمت و نور دونوں اسے حسن پرستی کا پیغام دے رہے ہیں۔ اور دونوں کے اندر وہ اپنی تخیلی آنکھوں سے کسی کی جمال آرائیاں دیکھ رہا ہے۔ پھر اظہار مطالب میں الفاظ کا انتخاب اور ان کی بندش سبحان اللہ۔ ایک باکمال آرٹسٹ کی طرح حسن فطرت کی زندہ متحرک اور قابل پرستش تصویر بنا کر تخلیقی شان دکھائی ہے۔ جوش کا یہ عالم ہے کہ ہر مصرعہ ایک دوسرے سے دست و گریباں۔ جذبات احساس کو اور احساس جذبات کو اس طرح سنبھالے ہوئے ہیں جیسے شاعر کا دل درد و نیاز اور سوز و گداز کو

"جلوۂ سحر" میں فرماتے ہیں:۔

تاروں کی اب کہاں ہیں وہ جلوہ نمائیاں؟   گُل ہیں چراغ مہر منوّر کے سامنے
چھٹتی ہیں ماہتاب کے رُخ پر ہوائیاں   کیا رنگ جم سکے شہ خاور کے سامنے؟
کیا تازگی ہے خندۂ گُل کی شمیم میں   فرحت فزائے قلب ہے تازہ کن دماغ
اعجاز جانفزائی ہے موجِ نسیم میں   وقتِ سحر بجھے ہوئے دل بھی ہیں باغ باغ
بیٹھا جہاں پہ سکۂ خورشیدِ خاوری   زیرِ نگیں مہر ہے اورنگِ کائنات

ظاہر ہیں ذرہ ذرہ سے آثارِ زندگی
چاروں طرف ہے گرمیٔ ہنگامۂ حیات

صبح ہوتے سب دیکھتے ہیں۔ نئی بات نہیں۔ ماہتاب ماند پڑتے پڑتے

چھُپ جاتا ہے۔ تارے جھلملاتے جھلملاتے غائب ہو جاتے ہیں۔ پھُولوں کا کھِلنا ہوا کی تازگی اور جانفزائی کسی کی آنکھوں سے اوجھل نہیں۔ ظاہر ہے کہ رات سونے کے لئے اور دن کاروبار کے واسطے ہے۔ راتیں تاریک سُنسان ہوتی ہیں اور دن روشن اور چہل پہل سے معمور۔ لیکن ایک ایسے عجوبہ طرز میں اس کا بیان کہ سُننے والے ہر لحظہ نیا کیف حاصل کریں ہر غیر شاعر کا کام نہیں۔ عمدہ شعر کی تعریف سب سے بہتر یہ کی گئی ہے کہ جب پڑھا جائے تو ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں لیکن کہہ نہ سکے یعنی جس منظر یا جس جذبہ کی وہ تصویر کھینچے، ہو تو سب کی آنکھوں سے دیکھی۔ دلوں پر بیتی۔ یہ نہیں کہ فرشتوں کی دنیا یا طلسمی عالم میں بھی اس کے وجود کا پتہ نہ لگے، البتہ بیان میں ایسی رنگ آمیزیاں کرے کہ سُننے والے دنگ رہ جائیں۔ برقؔ آنجہانی کی ساری نظمیں کم و بیش اس تعریف کی مستحق ہیں۔ درحقیقت وہ جب تک کسی منظر سے خود متکیف نہیں ہو جاتے تھے، قلم اُٹھانا شاعری کی ہتک سمجھتے تھے۔

"تاج" کے عنوان سے شاہجہاں کی پیاری ملکہ تاج محل کے ابدی خوابگاہ پر جو نظم لکھی ہے اُس کے دو چار شعر سُنئے :-

فروغِ دیدۂ دل جنتِ نظارہ ہے ۔۔۔ ضیا فشاں کُرۂ ارض پر ستارہ ہے

بہر حُسن ہے یا برجِ ماہتاب ہے تو ۔۔۔ نگار خانۂ صنعت کنارِ آب ہے تو

ترا عکس ہے سیلاب کی روانی میں ۔۔۔ کہ اِک سفینۂ زرّیں پڑا ہے پانی میں

حریمِ خاک میں ہیں حسن و عشق ہم آغوش
ہیں محوِ خوابِ عدم تاج و تاجدار خموش

اگر تشریف لے جا کر چاندنی رات میں اس سفید پری کو لبِ آب چپ چاپ کھڑے ہوئے دیکھئے۔ آپ کے دل میں بھی ایسے ہی کچھ جذبات پیدا ہوں گے لیکن آپ کے پاس شاعری کی زبان نہیں یہ صرف شاعری کا اعجاز ہے کہ ایک بے جان حسین مرمریں مجسمہ منھ سے بول اٹھا حسن کے شوالے میں عشق کا شعلہ بھڑکنے لگا۔

غزل کا انداز ہماری شاعری میں ایک بیجان مستی کا تماشہ ہے عشق اور حسن کے سوا کچھ نہیں عشق و عاشقی بھی سچی نہیں بلکہ جھوٹی۔ عاشق کا بہروپ بست وغیرہ۔ کفر و الحاد ظلم و ستم داد و بیداد کے چند مضمون ہیں۔ جن کے اندر عموماً جوانی کھپائی جاتی ہے۔ یہ اردو کی خوش قسمتی سمجھنی چاہیئے کہ کچھ عرصہ سے غزل کا معیار بدل رہا ہے۔ کوششیں جاری ہیں کہ شاعری کا میدان ان بدمستوں چاک گریبانوں سے پاک ہو اور ملک و قوم میں پیغام دینے والے پیدا ہو جائیں۔ غزل کا ہر شعر جوش کا سبق نہ دے تو ہوش کی تعلیم تو دے۔ اگرچہ غزل کی بنیاد عشقیہ مضامین پر رکھنے کا رواج ایسا عام ہو گیا ہے کہ نے ترک کرنا شراب کو سرکہ بنا کر پینے سے کم نہیں لیکن اس سڑاند کا کیا علاج جو اس خم سے آنے لگی۔ اب قوم کو لوریاں دے کر سلانے کی ضرورت نہیں۔ باجے بجا کر یا توپیں چھوڑ کر جس طرح ہو سکے جگانے کی ضرورت ہے یعنی آج ملک میں جس اخلاقی انقلاب کی ضرورت ہے شاعر بھی

اپنی غزلوں کا رُخ اُسی جانب موڑ دیں۔

برق آنجہانی کی غزلوں میں محض تقلیدی رنگ بہت کم ہے عشق و محبت کی چاشنی ہے لیکن اسی قدر کہ اصلیت کی سرحد نہ چھوٹے۔ وہ بھی تصوف کے انداز میں۔ مجاز کے پردے میں حقیقت کو چھپائے ہوئے۔ سُن لیجیے:

کعبہ و بُت خانہ کیوں مسجود ہونا چاہیئے
لامتناہی کس لئے محدود ہونا چاہیئے

مضمون نیا نہیں، صوفیوں کی پرانی تعلیم ہے لیکن موجودہ قوم پرستانہ شورشوں کے زمانہ میں تصوف کے ایک مسئلہ کو اتحاد و اتفاق کا پیغام بنا دینا آسان نہیں۔

مجھ سے سہواً بھی خطا ہو تو لرز جاتا ہوں
خونِ انصاف جو کرتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں؟

حُسن اور عشق میں قائم ہے مراتب کا لحاظ
وہ جفا کرتے ہیں ہم شکرِ جفا کرتے ہیں

کس قدر بلند اخلاقی کا سبق دے رہے ہیں۔ مصائب پر شکر، کیا بات ہے۔ فرقِ مراتب بندے اور خدا میں کتنی خوبصورتی سے دکھایا ہے:-

اُسکے پرتو سے ہے جذبات کی دُنیا آباد
آنکھ سے دُور ہے وہ دل سے مگر دُور نہیں

کس کو ہے ہست و بود کے انجام پر نظر
کچھ سُوجھتا نہیں غمِ دوراں کے سامنے

ادھر ذوقِ تماشا اور ہے حد کو نزدں وہ بھی
ادھر اک بے نیازی ذہن میں مضطر سکوں وہ بھی

دل کو تازگی بُلبل کو خوش نوائی دی
کیسے کلام ترے حُسنِ انتخاب میں ہے؟

ہے کیسے رنگ میں خالق و مخلوق کے تعلقات۔ انسانی مجبوریاں۔ خدا کا قادرِ مطلق ہونا ثابت کیا ہے۔ اسی کو فلسفہ کہتے ہیں یہی ایک شاعر کا دعویٰ ہے اور اسی میں زندگی کے ہزاروں پیغام پوشیدہ ہیں

کلام برق میں حسن تعلیل

(جناب منشی گوپی ناتھ صاحب امن لکھنوی۔ نائب مدیر تیج روزانہ دہلی)

برق مرحوم کے کلام میں لفظی صنعتوں کے مقابلہ میں معنوی صنعتیں زیادہ ہیں ہر حقیقی شاعر کے یہاں یہی بات ہوتی ہے معنوی صنعتوں میں حسن تعلیل کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ یہ صنعت شاعر کے پرواز تخیل کی کسوٹی ہے یعنی کسی واقعہ یا وجود کا سبب عوام کچھ سمجھتے ہیں اور شاعر کچھ اور شاعر کی نظر عوام سے مختلف ہوتی ہے لہذا اس کا تصور بھی جداگانہ ہوتا ہے۔ جب وہ کسی سبب و نتیجہ کو عام لوگوں کے نظریہ سے الگ ہو کر بیان کرتا ہے تو اسے حسن تعلیل کہتے ہیں۔ یوں تو برق کے کلام میں معنوی صنعتوں میں تشبیہہ و استعارہ سب سے زیادہ ہیں لیکن جیسا وہ فرماتے ہیں ع

نغمہ ہر رنگ کا خوابیدہ مرے ساز میں ہے

حسن تعلیل کی بھی کمی نہیں۔ میں اس مضمون میں ان کے کلام میں سے حسن تعلیل کے نمونے پیش کر رہا ہوں جہاں کہیں دوسرے شاعروں کے حوالے آئے ہیں اس سے میری مراد مقابلہ کی نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ کبھی تو شعرا کا ذہن ایک واقعہ سے

ایک ہی علت کی طرف منتقل ہوتا ہے اور کبھی اپنے میلانِ طبع کے مطابق قیادت ہوتا ہے۔ اسی کو حضرت اصغر گونڈوی نے برق مرحوم کے پہلے مجموعۂ نظم کے دیباچہ میں افکار وتخیل کی ترکیبِ نفسی کہا ہے۔

تارے شاعر کی نظر میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ میں زیادہ زبانوں سے واقف نہیں لیکن جتنی زبانیں جانتا ہوں سب میں تاروں کا ذکر شاعروں کے یہاں ضرور آیا ہے۔ شاعر کے نزدیک تارے روتے ہیں ہنستے ہیں، گاتے ہیں، دیکھتے ہیں سنتے ہیں، انسانوں سے مخاطب ہوتے ہیں اور تاروں میں بھی بالخصوص صبح کا تارہ خاص طور پر شاعر کا موضوع ہوتا ہے۔ دورِ جدید کے شاعروں میں جناب ساغر نظامی کی نظم

اے صبح کے تارے تو ہی بتا

بہت دلآویز ہے جب تارے صبح کے وقت ڈوبنے لگتے ہیں تو شاعر کے دل پر خاص کیفیت طاری ہوتی ہے۔ انیس چونکہ عرب کا منظر نظم کرتے ہیں اس لئے اُن کے نزدیک بادِ سموم کی وجہ سے غنچۂ نجوم پژمردہ ہوکر رہ جاتے ہیں۔ انگریز شاعروں نے صبح کے تارے کو تھکا ہوا بوڑھا سا نظم کیا ہے۔ انگریزی شاعری میں تاروں کا ذکر اس لئے اور زیادہ ہے کہ انگلستان میں تاروں بھری رات ایک نعمت ہے جہاں سال میں نو مہینے بادل چھائے رہتے ہوں اور دو مہینے کہر وہاں تاروں کا نظر آجانا ایک غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ جس طرح ہم لوگ

برسات کو خوشگوار موسم سمجھتے ہیں اسی طرح یورپ اور بالخصوص برطانیہ میں کھلے دن کو خوشگوار خیال کیا جاتا ہے۔ ہاں تو میں تاروں کے متعلق حسنِ تعلیل کا ذکر کر رہا تھا مرزا غالب فرماتے ہیں کہ

زمیں پہ ایسا تماشا ہوا برات کی رات
کہ آسماں پہ کواکب بنے تماشائی

لیکن برقؔ کے نزدیک اس برق کے نزدیک جو ایک محکوم مشرقی ملک میں پیدا ہوا۔

سحر کے جلوے ہیں مشرق میں نیم خوابیدہ | یہ ڈالتا ہے ابھی پر نگاہِ دزدیدہ
پیامِ نور کے تڑکے سحر کا لایا ہے | نویدِ مقدمِ خورشید دینے آیا ہے

دیکھئے مشرق کے یہ نیم خوابیدہ جلوے بیدار ہوتے ہیں یا نہیں جناب روشؔ صدیقی کو تو ایسا ہی یقین ہے جس طرح ستارۂ صبح کو پیامبر سحر بتاتے ہیں اسی طرح چراغ کو میزبانِ سحر بتلایا ہے فرماتے ہیں کہ

کتنی زحمت ہے حیاتِ مختصر کے واسطے
گل بداماں ہے یہ خورشیدِ سحر کے واسطے

کلیوں کے کھلنے کی وجہ نسیمِ صبح کا گدگدانا یا چھیڑنا ہے۔

تیری پیاری شوخیاں بھی کیسی دل آویز ہیں | گدگدانے سے ترے کلیاں تبسم ریز ہیں

تو نے چھیڑا نسیم جا کلیوں کی باچھیں کھل گئیں
تیرے دم سے انکو منہ مانگی مرادیں مل گئیں

دم اور ستمگر کے الفاظ خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ اسی نظم میں آگے چل کر فرماتے ہیں

ہر گلِ تر ہے چمن میں ناز پروردہ ترا
نیم وا کلیاں بھی دم بھرتی ہیں در پردہ ترا

صفرہ رخِ چمن کا سبب برق کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:۔

شانِ خوبی جب رخِ گل سے ہویدا ہو گئی
اور بیتابی دلِ بلبل میں پیدا ہو گئی

سبزہ ایک بیجان چیز ہے مگر شاعر کے نزدیک بقول حضرتِ سیماب اکبرآبادی

رازِ گیتی کا تماشا نہ سمجھنے والے — ہے یہاں ہر خس و ہر خارِ خرابات میں شیخ

چنانچہ سبزہ ایک ٹہلنے والے سے اپنے فرشِ زمیں ہونے کا سبب یوں بیان کرتا ہے:۔

ٹھکرا نہ اس طرح کہ گیاہ حزیں ہوں میں
خود فرطِ انکسار سے فرشِ زمیں ہوں میں

شمع و پروانہ کا ذکر اردو شاعری میں بہت ہے اب تو موم بتیوں کا رواج ہی اٹھتا جاتا ہے۔ جس زمانہ کی یہ شاعری ہے اس زمانہ میں شمع جلانے کا رواج بہت تھا۔ ظاہر ہے کہ جلتے وقت شمع کا موم پگھلتا ہے، اسے شاعروں نے رونے سے تشبیہ دی ہے اور اس رونے کے مختلف اسباب بیان کئے ہیں۔ برق مرحوم اس طرح فرماتے ہیں:۔

کوئی پروانہ جو گر کر ہو گیا فی النار بھی
تا سحر ٹوٹا نہ تیرے آنسوؤں کا تار بھی

شہنشاہ اورنگ زیب کی لڑکی زیب النساء شاعرہ تھی۔ اُس کی قبر کے متعلق برقؔ مرحوم کو یہ معلوم ہوا کہ تیس ہزاری میں ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے زیب النساء کی قبر کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ چونکہ زیب النساء کا تخلص مخفیؔ تھا اس لئے فرماتے ہیں ؎

شاید یہی فنا یہ تخلص کا تھا اثر
مخفی کی قبر بھی جو خفا میں رہی نہاں

کون شاعر ہے جو پھول کو دیکھ کر متاثر نہ ہوتا ہو۔ برقؔ یک پھول کو دیکھتے ہیں تو اُنھیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب اس کے جمال کا دلدادہ ہے اور اسی لئے روئے زمین پر کرنیں بھیج رہا ہے۔ چاند عالمِ فریفتگی میں اسی کی خاطر رقصاں ہے۔ تارے اسی کے نظارے دیکھ رہے ہیں۔ شبنم کے گوہر اسی کے لئے نچھاور کئے جا رہے ہیں۔ بلبل اسی کی وجہ سے نالاں ہے۔ اس نظم میں سے حسنِ تعلیل کے اشعار درج ذیل ہیں:—

تیرے جمال کا ہے دلدادہ مہرِ انور	کرتا ہے یہ سنہری کرنیں نثار تجھ پر
چرخِ بریں کی مشعل یعنی مہ درخشاں	ہے تیرے گرد پھر کر دیوانہ وار رقصاں
اوجِ فلک پہ تارے ہیں محو دید سارے	در پردہ دیکھتے ہیں یہ حسن کے نظارے

شبنم کے کر رہے ہیں تجھ پر گہر نثار | کھلتا نہیں معمہ تو کیا ہے اے گل تر

جامے سے اپنے باہر ہے عندلیب نالاں

خود رفتہ کر رہا ہے رہ رہ کے شوق پنہاں

بسنت میں اتنی رنگینی اور دلآویزی کیوں ہے اسکی وجہ برق سے "رنگینیٔ بسنت" میں سنئے۔ ؎

ترانہ ریزیٔ بلبل سے وجد طاری ہے | یہ برق حسن محبت کی سحر کاری ہے

اور دلآویزیٔ بسنت میں اس کی وجہ بتلاتے ہیں کہ لوگوں کو آگ تاپنے کا شوق کیوں نہیں رہا۔

اب کس کو ہے آگ سے سروکار | ہے آتش گل کا گرم بازار

بھگوان کرشن کے متعلق برق مرحوم کی بہت سی نظمیں ہیں کچھ مطلع انوار میں چھپیں کچھ طالب صاحب نے "حرف ناتمام" میں یکجا کیں ابھی شائد ابھی ہوگی "حرف ناتمام" میں "کرشن اوتار" نامی نظم میں کرشن کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے حسن تعلیل میں کیا خوب فرمایا ہے۔

تجلیِ رخ روشن سے نور پھیل گیا | شراب نور سے کیف سرور پھیل گیا

انیس نے بھی کیا خوب کہا ہے ؎

عکس رخ شبیر کی ضو تا بہ فلک تھی

دریا کی ہر اک لہر میں بجلی کی چمک تھی

برقؔ خوشی کا سماں لکھ رہے تھے اس لئے کیف و سرور نکھلا۔ انیسؔ مرثیہ لکھ رہے تھے اس لئے انہیں وہ نور بجلی کی صورت میں نظر آیا۔

دیوالی کی رات شاعر کے لئے ایک خاص کیفیت رکھتی ہے۔ اس دن گھر گھر دیے جلائے جاتے ہیں اس سے روشنی ہوتی ہے لیکن اس روشنی کا سبب برقؔ کے لفظوں میں سنئے :-

یہی وہ رات ہے قسمت جگاتی ہے مکانوں کی
زمیں پر کھینچ لائی ہے تجلّی آسمانوں کی

برقؔ کے یہاں خارجی پہلو ہے جوش داخلی پہلو سے فرماتے ہیں

دل کے روشن ہو رہے ہیں سب نقوش　　　تیرگی ہے آج کی آئینہ ساز

سورج مکھی کا پھول دیکھکر برقؔ مرحوم فرماتے ہیں:-

مہرِ مبیں سے اُنس اسے بے حساب ہے　　　اسکا بھی رُخ اُدھر ہی جدھر آفتاب ہے
ہر وقت خیر مقدمِ خورشید کے لئے　　　رکھتا ہے اپنا حلقۂ آغوش وا کئے

برقؔ کے کلام میں جو سوز و گداز ہے وہ بھی جا بجا حسنِ تعلیل کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ گورِ غریباں میں فرماتے ہیں

کھنچ کھنچ کے چلے آتے ہیں سب کی یہ روش ہے
کیا جانئے اس خاک میں کس درجہ کشش ہے

تلمیح کے ساتھ حسنِ تعلیل کی ایک مثال ملاحظہ ہو سیتا جی اشوک بن میں رام کی

یاد کرکے بہت روئیں مگر اُن کی آنکھیں نہ گئیں، اس کا سبب برق نے اس خوبی سے بیان کیا ہے۔

بسی رہتی ہے ہر دم رام کی تصویر آنکھوں میں
اسی کے نور سے آنکھیں ہیں سیتا جی کی نورانی

ناسخ نے دنیاوی رنگ میں کہا ہے

آنکھیں کھلی ہوئی ہیں پسِ مرگ بھی مری
یہ حال کر دیا ہے ترے انتظار نے

کوئیٹہ کے زلزلہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

غضب سے پچھلے پہر آسمان ٹوٹ پڑا　　　فلک زدوں پہ یہ کیا خدا کا قہر ہوا

اور پھر

ہزاروں خاک کا پیوند ہو گئے صد حیف
اٹھا تھا قلب زمیں میں یہ ولولہ کیسا

پُرانوں میں ذکر ہے کہ رامچندر جی چودہ برس کے بن باس کے بعد دیوالی کو واپس آئے تھے اس روز چونکہ گھر گھر چراغ جلے تھے اسلئے وہ رسم اب تک جاری ہے برق فرماتے ہیں۔

آج بن باس سے واپس شری رام آئے ہیں
دیپ مالا نہ ہو کیوں ماہِ تمام آئے ہیں

تلسی داس ایک جگہ یوں فرماتے ہیں

نار کمدنی اودھ سر رگھبر برہ دنیش۔ است سے نگست جیئے رام راکیش

یعنی اودھ ایک تالاب تھا اس میں رہنے والی استریاں کوکا بیلی کی طرح تھیں رامچندر کے فراق کا آفتاب چمک رہا تھا اس لئے وہ کمھلائی ہوئی تھیں۔ رامچندر مثلِ ماہتاب تھے وہ نکلے آفتابِ فراق غروب ہوا اور اودھ کی رہنے والیاں کھِل گئیں تشبیہ اور حسنِ تعلیل کے یکجا ہونے کی یہ ایک بہترین مثال ہے

تاثرات

(جناب پنڈت بال مکند عرش ملسیانی۔ بی۔ اے)

(ماخوذ از "الہام" دہلی۔ جولائی ۱۹۳۲ء)

بعض واقع انسان کی زندگی میں ایسے بھی آتے ہیں جن کی یاد ہمیشہ کے لئے سرمایۂ راحت بن جاتی ہے۔ افتخار الشعرا منشی مہاراج بہادر صاحب برقؔ دہلوی مرحوم کے ساتھ میری پہلی ملاقات جو شومئی بخت سے آخری بھی ثابت ہوئی، ایک ایسا اتفاق تھا کہ جب کبھی اس کی یاد آتی ہے، طبعیت ایک کیف کے عالم میں ڈوب جاتی ہے۔ آپ بزم اردو شملہ کے مشاعرہ میں شمولیت کی غرض سے شملہ تشریف لے جارہے تھے۔ کالکا سے میں بھی آپ ہی کے ساتھ ریل گاڑی میں سوار ہوا۔ آپ کے ساتھ آپ کے صاحبزادے مسٹر کرشن بھی تھے جن کی عمر اس وقت شاید دس بارہ برس کی ہوگی۔ ہم پاس پاس بیٹھے ہوئے اُونگھتے اُونگھتے ریل میں سوار چلے جارہے تھے کہ عزیزی کرشن نے پہاڑ کے پیچھے چھپے ہوئے چاند کی طرف دیکھکر محترمی برقؔ صاحب کو مخاطب کیا: "تاجی۔ دیکھئے چاند کیسا خوشنما معلوم ہو رہا ہے" بچے کے اس شاعرانہ مشاہدہ اور اس کے سادہ اظہار کو دیکھ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہہ دیا "عزیز! تم تو ایک شاعر کا دل رکھتے ہو"

برقؔ صاحب نے میری بات سُنی اور اُن کے ایک معنی خیز تبسم سے مجھے محسوس ہوا کہ شاید میں کوئی حقیقت بیان کرگیا ہوں۔ سولن کے اسٹیشن پر مخدومی منورؔ صاحب لکھنوی جو اس گاڑی کے کسی دوسرے ڈبے میں سوار تھے، ہمارے ڈبے میں تشریف لائے اور آپ نے کوہسار کے مناظر پر ایک رُباعی برقؔ صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ مَیں محترمی منورؔ صاحب اور جناب برقؔ صاحب سے رُوشناس نہیں تھا۔ غائبانہ تعارف تو خیر اُس دن سے تھا جب سے طبیعت میں شعر اور اچھا شعر پہچاننے کی تھوڑی بہت صلاحیت پیدا ہوئی۔ مطلع انوار میں برقؔ صاحب کی تصویر دیکھ چکا تھا۔ کسی کی آنکھ پڑنے سے پہلے ہی کھِل کے مُرجھا جانے والے اس گُلِ صحرائی کی خوشبو سے مشامِ جاں میں عطر بیزیاں ہو چکی تھیں۔ دیکھتا رہا۔ تصویر میں چہرے پر جوانی کے آثار اور وجاہت کا جلال تھا مگر یہاں نسبتاً ایک نحیف اور ناتواں صورت سامنے تھی۔ خدوخال کے اندازہ سے اور کچھ حالات سے جو ابھی در پیش آئے، میں نے قیافہ سے پہچانا اور جھجکتے ہوئے عرض کی "کیا میں جناب برقؔ دہلوی سے مخاطب ہو رہا ہوں؟" میری بات سُن کر آپ کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہوئی اور آپ نے میرے قیافہ کی داد دیتے ہوئے فرمایا "آپ نے خوب پہچانا"۔ بس یہی لمحات ہیں جنھیں یاد کرتا ہوں تو اُس عالم میں پہنچ جاتا ہوں جہاں سے دل و دماغ واپس آنا پسند نہیں کرتے۔ میں نے فرطِ عقیدت سے آداب بجا لایا اور اس بات پر اظہارِ ندامت کہ اتنی دیر آپ کی خدمت میں حاضر رہ کر اپنے

جوش عقیدت کے اظہار سے قاصر رہا۔ آپ مجھ سے میرا نام پوچھتے رہے اور اس تقاضے میں منور صاحب بھی شامل ہوئے مگر اس خیال سے کہ ان باکمالوں کو اپنا نام بتاؤں بھی تو کس شوق اور کس خیال سے، چاہتا تھا کہ اپنے آپ کو ظاہر ہی نہ کرتا مگر یہ ممکنات میں سے نہ تھا۔ شملہ پہنچکر معلوم ہو جاتا۔ مجھ سے میرا نام سُنکر آپ نہایت محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ والدِ محترم جناب جوش ملسیانی کی خیر و عافیت پوچھی۔ پھر تو سولن سے شملہ کا سفر باتوں ہی میں کٹ گیا۔ ملاقات کے اس طرح جلد ختم ہو جانے کی حسرت اس لئے حسرت نہ رہی کہ ہوٹل میں آپ کے ساتھ ہی قیام رہا اور ایک دو دن اچھی صحبت رہی۔ دورانِ گفتگو میں مرحوم بعض اوقات ایک خاص یاس انگیز آہ بھر دیتے اور دریافت کے بعد معلوم ہوا کہ آپ کو اپنی صاحبزادی کے انتقالِ پُرملال کا صدمہ نہیں بھولتا۔ مرحوم ایک مخلص انسان تھے اور اسکا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ سے ایک مختصر سی مُلاقات کا اثر ابھی تک محو نہیں ہوا اور نہ عمر بھر ہو گا۔ آپ کے ناگہانی انتقالِ پُرملال کی خبر پڑھکر سوچتا تھا کہ دُنیائے اُردو تو اپنا ایک قیمتی ہیرا کھو ہی بیٹھی لیکن مخلص انسانوں کی مجلس میں بھی ایک ممتاز نشست خالی ہو گئی۔

مرحوم ایک وہبی شاعر تھے۔ غزل اور نظم دونوں میں آپ نے اپنا کمال دکھایا ہے۔ ندرتِ تراکیب آپ کے کلام کا ایک نمایاں جوہر ہے۔ تشبیہات کی تلاش میں آپ کا تخیل دور رس تھا۔ جگنو کے نام سے جو نظم ارشاد فرمائی ہے وہ دنیائے ادب

ہمیشہ یادگار رہے گی۔ کیا لاجواب مصرع فرما گئے ہیں :۔

اُڑتی پھرتی کوئی ہیرے کی کنی ہے شاید

"کارِ خیر" کے عنوان سے جو نظم کہی ہے وہ ایک مستقل شاہکار ہے تاریخی واقعات مناظر۔ مذہبی اور دیگر عنوانات پر آپ کی بیش بہا نظمیں صفحۂ اردو پر ایک نقش دوام بن کر رہیں گی اور آپ کے خامۂ رنگیں نگار کی گلکاریوں سے اس زبان کا دامن ہمیشہ نگار خانۂ چین بنا رہے گا۔ بولتے ہوئے مصرعے، چست بندشیں۔ برمحل الفاظ۔ ندرتِ تراکیب، تشبیہات کی موزونیت اور ان سب سے بڑھ کر شوکتِ الفاظ یہ چند جوہر ہیں جو آپ کے کلام میں مقام مقام پر نمایاں طور پر نظر آئینگے۔ آپ نہایت زود گو تھے۔ بیٹھے بیٹھے بیسیوں شعر کہہ جاتے تھے۔ شملہ کے مشاعرہ کے بعد آپ نے بہت سے شعراء کے کلام پر اپنی رائے نظم میں ظاہر کی تھی۔ کچھ شعراء میں سے ہر ایک کے متعلق آپ نے ایک ایک شعر ارشاد فرمایا تھا جن میں یہاں صرف دو شعر عرض کروں گا :

والدِ محترم جناب جوش ملسیانی کے متعلق :۔

جوش کے اشعار میں ہر رنگِ داغ و میر بھی ۔۔۔ سادگی کے ساتھ رنگینی بھی ہے تاثیر بھی

راقم کے متعلق

عرش کے نغمۂ دلکش کو بلا ساز بھی خوب ۔۔۔ شعر بھی خوب ہیں پڑھنے کا ہے انداز بھی خوب

یہ محض آپ کی بزرگانہ عنایت کا ثبوت ہے کہ آپ نے میرے متعلق کسی حد تک

اچھی رائے کا اظہار فرمایا ورنہ من آنم کہ من دانم۔ یہ مثالیں اپنے گھر کی تعریف کی غرض سے نہیں بلکہ مرحوم کے خلوص اور عنایت کو ظاہر کرنے کے لئے یہاں بیان کر رہا ہوں۔

دہلی کو ایسے باکمال کی یادگار منانے میں فخر محسوس کرنا چاہیئے کیونکہ اسکی کھوئی ہوئی عظمت کو برقرار رکھنے والوں میں مرحوم ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ ایک مخلص انسان تھے اور کسی رنگ میں بھی کسی کی دل شکنی گوارا نہیں فرماتے تھے۔ آپ کا مطمع نظر یہ نہیں تھا سے

گر دل ایں مخزنِ کینست کہ مردم دارند
ہر کہ یک دل شکند کعبۂ آباد کند

بلکہ آپ مرنجاں مرنج انسان تھے۔ آپکے پاس تسخیر قلوب کا جادو تھا اور آپ اپنے پیچھے اپنے عقیدتمندوں کی ایک اچھی تعداد چھوڑ گئے ہیں جو ہمیشہ آپ کی یادگار منانے کے فرائض ادا کرتی رہے گی۔ اسی کا نام معراجِ زلیست ہے۔ وقت کوتاہ وقصہ طولانی۔ اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ ہم میں یہ استطاعت رہے کہ مرحوم کے احسانات کو جو اردو نظم پر ہیں ہمیشہ یاد رکھیں۔

گلہائے عقیدت

جناب شاہد احمد صاحب بی اے آنرز۔ مدیر ساقی دہلی

(ماخوذ از چمنستان دہلی۔ جون ۱۹۴۳ء)

افتخار الشعرا منشی مہاراج بہادر برق آنجہانی اردو کے مشہور اور دلّی کے مایۂ ناز شاعر تھے، شعر ایک خاص اسلوب سے کہتے تھے، اُن کا تخیل بلند اور الفاظ کا انتخاب نہایت موزوں ہوتا تھا۔ ؎

بحر معنی کا شناور ہے گہر پاش سخن
حسن فطرت کا مصور ہے یہ نقاش سخن

شعر و شباب، نغمہ و شراب، برق کے اجزائے زندگی تھے یہاں ان کا کلام حسن کاری کے سانچے میں ڈھلتا تھا۔

شعر سے، حسن سے، نغمہ سے، مئے ناب سے ہے
زندگی میری جہاں میں انہیں اسباب سے ہے

شاعر کے دل میں کسی خارجی یا داخلی اثر سے جذبات کی ایک لہر اٹھتی ہے، اور یہی اس کے تخیل کو موج زنی پر مائل کرتی ہے، شاعر اپنے احساسات و تصورات کے بکھرے ہوئے موتیوں کو مترنم الفاظ کی کڑی میں پروتا ہے، اور اس طرح ایک اچھا شعر

مرتب ہوتا ہے، شعر کی عمدگی کا دارو مدار اس جوش و شدت پر ہے جس سے کہ اس نے کسی خاص جذبے یا کیفیت کو محسوس کیا ہے۔ شدتِ تاثر ہی سے جذبات میں گرمی اور تخیل میں رنگ پیدا ہوتا ہے، شاعری صرف جذبات کی ترجمانی ہی کا نام نہیں ہے، یہ ایک فن ہے جو فنونِ لطیفہ میں سب سے برتر ہے اور برق اس فن سے کما حقہ واقف تھے، شاعر کے متعلق فرماتے ہیں ؎

اس کے اشعار میں رنگینیٔ جذبات بھی ہو — کیف بھی، درد بھی، نغمہ بھی، کاکات بھی ہو
حسنِ تاثیر بھی، پردازِ خیالات بھی ہو — لذتِ عشق بھی ہو، معرفتِ ذات بھی ہو

ملہمِ غیب ہے، خلاقِ معانی ہے یہ
نکتہ آرائے رموزِ ہمہ دانی ہے یہ

حقیر سے حقیر شے دیکھ کر بھی شاعر کے دل میں وہ جذبات پیدا ہوتے ہیں جن کا اظہار الفاظ کی خاموش زبان سے بھی ممکن نہیں، اکثر یہ جذبات فوراً شعر کے قالب میں نہیں ڈھل جاتے بلکہ شاعر کے شعور میں نشو و نما پاتے ہیں اور پھر تحت الشعور میں آسودہ ہو جاتے ہیں، شاعر خارجی تاثرات ہمیشہ حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب کسی ایک تاثر کو وہ شدت و جوش سے محسوس کرتا ہے تو اس کے تحت الشعور میں بھی بیداری ہوتی ہے اور آسودہ تاثرات اُبھر آتے ہیں۔ اس طرح ایک شعوری تاثر کے گرد تحت الشعوری تاثرات کا ایک ہالہ سا بن جاتا ہے اور الفاظ کی ٹکسال میں شعر کا سکہ ڈھلنے

لگتا ہے۔ شاعر کی طبیعت حساس، اور دل گداز ہوتا ہے۔ برق کا دل غم عشق نے گداز کیا تھا، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

آپ کیا جانیں غم عشق کسے کہتے ہیں
درد کا اس کو مزا کیا جو دل افگار نہ ہو

یہ عشق ہی تو تھا جس نے برق کو آتش بجاں کر کے ان کے پہلو میں ایک قلب تپاں رکھ دیا تھا، اس جوالہ مکھی کے اندر تو آگ بھڑک رہی ہے لیکن باہر خوشنما پھول کھل رہے ہیں۔ برق آتش خاموش کی مانند ...... جلتے ہیں اور اسی جلن اور اسی لگن سے چپکے چپکے وہ خاموش پھول کھلاتے ہیں جو اپنی تابش سے مطلع انوار بنتے ہیں ؎

حسرت آلودہ نگاہیں، لب پہ ہے مُہر سکوت
برق درد عشق کی تصویر خاموشی میں ہے

برق فطرتاً یاس پسند ہیں اور غم دوست انھیں ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ وہی پھول سب سے حسین ہوتے ہیں جو کسی ویرانے میں کھلتے ہیں۔ برق کی عظمت کا راز ہی حسرت و یاس، غم و اندوہ، درد و حرماں میں پوشیدہ ہے، غم عشق نے انھیں شق غم بخشا ہے اور یہی وہ تحفہ ہے جس نے میر کو آب حیات پلایا اور فانی کو لافانی بنایا، ساز دل کا نغمہ بہت دلفریب ہوتا ہے لیکن صدائے شکست ساز کچھ اور ہی خروش ہوتا ہے ؎

نامراد دہر سراپا ہوں درد برق — سمجھ شکست شیشۂ دل کی صدا مجھے

بسنت رُت آتی ہے، شگفتگی و شادابی کے قدم لیتی ہے، زمین خزاں کی ژند سالہ تار تار کرتی ہے، اور بسنتی جوڑا زیب تن کرتی ہے اور بہار کی خوشی چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ برقؔ پر بھی اس سازو سامانِ بہار کا اثر ہوتا ہے لیکن اس طرح کہ دبی ہوئی چوٹیں اُبھر آتی ہیں اور اُن کے دل کا زخم ہرا ہو جاتا ہے ؎

برقؔ اور فصلِ گل میں بھڑکتے ہیں داغِ دل
میرے لئے تو باعثِ حرماں بسنت ہے

داغوں نے انھیں ایک سروِ چراغاں بنا دیا ہے اور بسنت میں ان داغوں کی بہار دیکھنے کے قابل ہوتی ہے جبکہ شاعر کا دل غم کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔

؎ یہ رُت بسنت کی اور برقؔ مبتلائے الم
بہار اور دلِ داغدار، کیا کہنا

برقؔ کی نگاہ نکتہ رس اور باریک بیں تھی۔ ان کا مشاہدہ صحیح اور تجربہ وسیع تھا، مضامین چاہے عاشقانہ ہوں، چاہے فلسفیانہ، چاہے مادّی دنیا کے ہوں چاہے روحانی دُنیا کے سب کو شاعرانہ انداز سے بڑی خوبصورتی سے پیش کرتے تھے یہاں تک کہ دقیق مسائلِ حیات کو بھی تشبیہوں اور استعاروں میں حل کرتے تھے ؎

زندگی کی کشمکش کا رازِ مفہوم سکون
دن کے ہنگاموں میں ہے، راتوں کی خاموشی میں ہے

دو لفظوں میں 'جنت' اور 'دُنیا' کی تفسیریں پیش کی ہے ؎

یہ دو لفظوں میں ہے تفسیر جنت اور دنیا کی
وہ اک نقشِ خیالی ہے، یہ اک خواب پریشاں ہے

برق کا تخیّل بلند پرواز تھا، لیکن اتنا نہیں کہ سرحدِ ادراک سے پرے نکل جائے، اُن کا مفہوم ہماری نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتا، اپنے مفہوم کو واضح اور آراستہ کرنے کے لئے وہ بڑی سے بڑی کاوش کرتے تھے، یہاں تک کہ تخیل کے پَر لگا کر اُڑتے تھے اور زمینِ شعر کے لئے آسمان سے ستارے توڑ لاتے تھے۔ ؎

زمینِ شعر کی زینت کے واسطے اے برق
ستارے توڑ کے لانے ہیں آسماں سے ہمیں

شعر کی یہ بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ خیال بندی کی گئی ہو، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازمی ہے کہ شعر پہیلیاں یا معمہ نہ بننے پائے، جیسا کہ ایک عام معمہ مشہور ہے ؎

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا — کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

اس قسم کے شعر دماغی ریاضت کے لئے مفید ہوں تو ہوں، لطافتِ شعری سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں، شعر ایسا ہو کہ اُسے سُننے یا پڑھنے کے بعد آنکھوں کے سامنے کسی خاص کیفیت کی مکمل تصویر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ کھنچ جائے اور دیکھنے والا آئینہ کی طرح حیران رہ جائے۔ مثلاً نظام کا یہ شعر ؎

لینا وہ اُسکا ساغرِ مے یاد ہے نظام — منہ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

برقؔ کے سرمایۂ اشعار میں اس نوع کے اشعار کی کمی نہیں ہے۔ میں آپکو صرف ایک شعر سناؤں گا، فرماتے ہیں ؎

برقؔ وہ بھر کر مرا دینا انھیں جامِ شراب
اور ان کا ناز سے کہنا نہیں اتنی نہیں

ان مفرد اشعار میں پوری پوری نظم کا سا لطف ہے۔ اس خوبی کو آپ غالباً ایجاز سے موسوم کریں گے، لیکن میں تو اسے اعجاز ہی سمجھتا ہوں۔ اس قسم کے اشعار شاعر کے ذاتی تجربے ہوتے ہیں۔ حسین تجربے۔ بیش قیمت تجربے، جن سے کسی زبان کی شاعری مالا مال ہوتی ہے۔

برقؔ کی شاعری کی جملہ خصوصیات کو وضاحت سے بیان کرنے کے لئے وقت اور یکسوئی کی ضرورت ہے ع

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کیلئے

اس کے علاوہ اصناف و محاسنِ شعر یا یوں کہئے کہ فنِ شاعری سے پوری طرح واقفیت ہو۔ اس سلسلے میں مجھے اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہے۔ میں نے صرف چند نکات پیش کئے ہیں اور وہ بھی اُس حسنِ عقیدت کے ساتھ جو مجھے مرحوم سے ہے۔ ورنہ ع

میں کہاں اور کہاں ہوائے بہشت

برقؔ فرماتے ہیں ؎

فصاحت سے پڑھوں میں برق بارنگِ ترنم سے
ہے ہر شعرِ تر میں نغمۂ فردوس شامل ہے

افسوس کہ وہ لبِ نغمہ پرداز جس سے یہ نغمۂ فردوس جاری ہوتا تھا، اب سکوتِ مستقل اختیار کر چکا ہے لیکن اس کی گونج رہتی دنیا تک فردوسِ گوش بنی رہے گی۔

اُردو ادب اور ہندو

جناب مہرلال ضیا۔ ایم۔ اے۔ فتح آبادی

جنابِ صدر اور معزز حاضرین!

اجازت دیجئے کہ میں آج آپ سے وہ تلخ حقیقت بیان کردوں جس کا مشاہدہ میں آج مدت سے کر رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کا نتیجہ اور پراکرت اور فارسی کا سنگم ہے۔ چنانچہ ادبِ اُردو پر ہندوؤں کا بھی وہی حق ہونا چاہیئے جو مسلمانوں کا ہے لیکن ایسا ہونے کے باوجود اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رفتہ رفتہ اُردو صرف مسلمانوں کی ملکیت بن کر رہ گئی ہے اور ہندو اس مشترکہ جائداد سے دست بردار ہو گئے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس کے دو وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ اُردو زبان کی پیدائش میں مسلمان حملہ آوروں کی ضرورت زیادہ نمایاں ہے اور اُس کا ظاہری لباس یعنی فارسی رسم الخط بھی اُس کو مسلمانوں سے زیادہ قریب کر دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس وقت تک مجموعی طور پر ہندو اُردو زبان میں بات چیت کرتے ہوئے بھی اُس کو اپنانے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے زبانِ اُردو کو ہندوستان کی

بنگوا فرینکا Lingua-franca تو قرار دیا لیکن ادب اُردو میں ہندو ادبا کی خدمات کا صحیح اعتراف کرنا اور اُن کے لئے تاریخ ادب میں کوئی درجہ متعین کرنا کسی دَور میں بھی گوارا نہیں کیا۔ اگر کہیں کسی ہندو ادیب یا شاعر کا ذکر آیا بھی ہے تو محض ضمنی طور پر اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہندو بھی اُردو زبان سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ صدی عیسوی تک اُردو ادب پر عربی اور فارسی کے اثرات اِس شدّت سے غالب رہے ہیں کہ ہندوستانی ماحول میں پلے ہوئے ہندو ذہن قدرتی طور پر اُس سے اجنبی ہی رہے۔ چنانچہ اِس میدان میں ہندو وہ کام نہ کر سکے جو مسلمانوں نے کر دکھایا، اور اگر کسی ہندو نے نام پایا بھی تو محض فارسی علمیت کی بنا پر اور اپنے مسلمان ہمعصروں کی صحبت اور کرمفرمائیوں کا سہارا لے کر ورنہ وہ سرمشیہ کے لئے پس پشت کر رکھدیا گیا۔

جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں یہ ایک نہایت تلخ حقیقت ہے ہندوؤں کے لئے بھی اور مسلمانوں کے لئے بھی۔ ہندوؤں کے لئے اس لئے کہ وہ کسی دَور میں مجموعی طور پر اُردو کو اپنی جنتا کی زبان بنانے سے شرماتے رہے اور اس سلسلے میں اُن کی طرف سے جو کوششیں وقتاً فوقتاً ہوئیں بھی تو اُن کی حیثیت انفرادی ہونے کی وجہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اور مسلمانوں کے لئے اس لئے کہ سرزمینِ ہند پر مستقل طور پر سکونت پذیر ہو جانے پر بھی سماجی یا سیاسی اصولوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اُنھوں نے اُردو کو ہندوؤں کی زبان بن جانے سے

بجائے رکھنا ہی مناسب سمجھا۔

اس بحث کو طول نہ دیکر میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حالات اور واقعات کی ناسا عدت کے باوجود انفرادی اور ذاتی طور پر ہندوؤں نے اُردو زبان کی ترویج و ترقی میں ہر ممکن حصہ لیا۔ ایسے لوگوں کا مطمح نظر اکثر اپنے ذوق کی تکمیل تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے ادب کو ذریعۂ معاش نہ بناتے ہوئے اُردو زبان کی خدمت اُن چند لمحات فرصت میں کی جو زندگی کی کشمکش میں کبھی کبھی اُن کو میسر آسکے۔ یہی سبب ہے کہ میرے نزدیک ایسے اصحاب کی خدمات اُردو زبان و ادب کے لئے زیادہ قابل فخر ہونی چاہئیں۔ آج ہم جس عظیم المرتبت اور نادرِ روزگار شاعر کی یاد تازہ کرنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں اُسکا شمار ایسے ہی ادب نواز اور اُردو دوست ہندوؤں کی صف اوّل میں آتا ہے اور ایک خالص ہندو ہونے کی حیثیت سے مجھے ایک گونہ خوشی ہوتی ہے یہ معلوم کرکے کہ اس شخص کے ادبی اور فنّی کمالات کا اعتراف میرے مسلمان ہمعصروں نے بھی نہایت فراخدلی سے کیا ہے۔

افتخار الشعرا منشی مہاراج بہادر برق کو وفات پائے تقریباً آٹھ برس ہوتے ہیں جب سن چھتیس کے آغاز میں میں نے مستقل طور پر دہلی میں سکونت اختیار کی تو برق اُس وقت ذی حیات تھے۔ لیکن میں اس کو اپنی انتہائی بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ اُن کی زندگی میں مجھے اُن سے ملنے کا موقع نہ ملا۔ اور میں

ایک ایسے شخص کے نیاز سے محروم رہ گیا جسکا ماتم دہلی برسوں اور ادب اُردو ہمیشہ کرتا رہے گا۔ چنانچہ برقؔ کے متعلق جو کچھ میں آج آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں وہ اس تاثر پر مبنی ہے جو میرے دل نے مرحوم کے کلام کے مطالعہ سے اخذ کیا ہے۔

برقؔ کی شاعری ادبِ اُردو کے اُس نازک ترین دَور سے متعلق ہے جس کو دورِ عارضی Transitory Period کہنا چاہیئے۔ یہ دَور غالبؔ سے شروع ہوا۔ آزادؔ اور حالیؔ نے اس کی پرورش کی اور اقبالؔ اور چکبستؔ نے اسکی تکمیل کے ذرائع پیدا کئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو شاعری کو جھنجھوڑ کر اُس میں سے عربیت اور فارسیت کے وہ اجزا دُور کئے جا رہے تھے جن میں سے صدیاں گذر جانے پر بھی اجنبیت کی بُو برابر آ رہی تھی۔ یعنی اردو شعر و ادب کو ہندوستانی ماحول اور زندگی سے زیادہ قریب لانے کے تجربات کئے جا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ تجربات میں نوعیت تو ہو سکتی ہے لیکن فنی تکمیل نہیں مل سکتی۔ اسی وجہ سے تجرباتی دَور تجربہ کرنے والوں کے حق میں اکثر خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ اقبالؔ اس راہ پر دُور تک نہ چل سکا اور دوبارہ فارسی کے در پر جبیں سائی کرنے کے لئے مجبور ہو گیا اور زندگی کے ہر پہلو کو مذہب کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ لیکن غالبؔ نے جس ڈگر کی طرف اشارہ کیا اور آزادؔ اور حالیؔ نے جس کی کچھ پیسوں کو اُبھارا اُس ڈگر سے اقبال کے ہٹ جانے پر بھی

چمکیت اور برقؔ بدستور رواں دواں نظر آتے ہیں۔

ادب برائے ادب ہو یا ادب برائے زندگی، دونوں صورتوں میں ضروری ہے کہ وہ لکھنے والے کے جذبات و تاثرات کی صحیح ترجمانی کرے۔ جو ادب ایسا نہیں کر سکتا وہ معیار سے گر جاتا ہے۔ غالبؔ سے پہلے اُردو شاعری کی بھی یہی حالت تھی۔ جب اس سقم کو محسوس کیا گیا تو غزل کی اہمیت کم ہو گئی اور توجہ قدرتی طور پر نظم کی طرف مبذول ہوئی۔ نظم کی وسعتوں میں سیاسی، سماجی اور وطنی خیالات و جذبات کی گنجائشوں کے علاوہ حسن و محبت، گل و بلبل اور وصال و فراق کی ابدی داستانوں کی کھپت بھی زیادہ موزوں اور موثر طریقہ سے ہو سکتی ہے۔ چنانچہ نظم کا مقبول ہونا ایک یقینی امر تھا۔ نظم مقبول ہی نہیں ہوئی بلکہ اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے غزل کو کوسوں دور چھوڑ آئی۔ برقؔ تحریکِ نظم نگاری سے صرف متاثر ہی نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے اس تحریک کو کامیاب بنانے میں اپنی تمام قوتوں کا مناسب استعمال کیا۔ ایک سچے نظم نگار کی حیثیت سے انھوں نے جو چند ایک غزلیں کہیں ہیں تو ان میں بھی نظم کی شان نظر آتی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سمجھا میں غم نصیب کہ قسمت چمک گئی　　زنداں میں دھوپ آئی جو دیوار پر کہیں

محو نظارہ ہیں ہم دنیا کی محفل دیکھ کر　　منزلِ عقبیٰ کو بھولے ہیں یہ منزل دیکھ کر

تری صورت نے عہد طفلی یاد کرتا ہوں　　بلائے جاں ہو بد مستی شباب فتنہ ساماں کی

اب کہاں لالۂ خونیں سا تھ لطفِ سیرِ گل　　　　برقؔ اب وہ بھی خوابِ پریشاں ہوگئیں

دیکھا آپ نے برقؔ نے صرف ایک مصرعے میں لالۂ رخوں کے ساتھ لطفِ سیرِ گل کا منظر کس خوبی اور کامیابی سے کھینچ دیا ہے۔ یہی برقؔ کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ جس طرح حالیؔ اور اقبالؔ نے مسلمان قوم کو گذشتہ واقعات کی یاد دلا کر بیدار کیا اُسی طرح چکبستؔ اور برقؔ نے بھی ہندو قوم کو اُبھارا اور خوب اُبھارا لیکن برقؔ کے کلام میں جس چیز نے مجھے زیادہ متاثر کیا ہے، وہ ان کی منظر کشی ہے۔ بیجا نہ ہوگا اگر میں کہہ دوں کہ برقؔ کا درجہ اُردو شاعری میں وہی ہے جو ورڈز ورتھ Wordsworth کا انگریزی شاعری میں ہے۔

منظر کشی بجائے خود ایک آرٹ ہے اور نقاشی سے بالکل قریب۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک چترکار کسی منظر کی تصویر اُتار کر اس میں مختلف رنگوں کے اجتماع اور امتزاج کے ذریعے اپنے جذبات کو دیکھنے والوں تک پہنچاتا ہے لیکن ایک شاعر اسی منظر کو الفاظ کا جامہ پہنا کر استعاروں اور تشبیہوں کو اپنے تاثرات کا ذریعۂ اظہار بناتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ برقؔ اس اصولِ منظر کشی کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کی تمام نظموں میں جہاں منظر کشی پائی جاتی ہے، یہ اصول کارفرما نظر آتا ہے۔ تشبیہات پر ان کو کامل دسترس حاصل ہے۔ جس منظر کو بھی اُنھوں نے نظم کے قالب میں ڈھالا ہے مناسب اور موزوں تشبیہوں سے مزین کرکے اس میں جان ہی نہیں ڈال دی بلکہ اپنے دل کی کیفیات کو نہایت خوش اسلوبی سے پڑھنے والے کے دل تک پہنچا دیا ہے۔

"ستارۂ صبح" کو یاقوتِ ناتراشیدہ، کہنا صرف برقؔ ہی کا حصہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

تپِ بلا سے ہو فق رنگِ شب رنجیدہ
ہے مانند صورتِ یاقوتِ ناتراشیدہ
سحر کے جلوے ہیں مشرق میں نیم خوابیدہ
یہ ڈالتا ہے آہنی پر نگاہِ دُزدیدہ
پیام نور کے تڑکے سحر کا لایا ہے
نویدِ مقدمِ خورشید دینے آیا ہے

راس لیلا کی تصویر کھینچی ہے ؎

حلقہ باندھے ہوئے رقصاں ہیں حسیں مستِ شباب
قلزمِ حُسن میں تابش سے پڑا ہے گرداب
بجلیاں کوندرہی ہیں کہ ہیں جلوے بے تاب
چشم بد دُور وہ منظر ہے نہیں جس کا جواب
حلقۂ رقص میں نٹ راج بھی خود شامل ہے
یا یہ جھُرمٹ میں ستاروں کے مہِ کامل ہے

اس بند کو پڑھئے اور آنکھیں بند کر لیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ صرف راس لیلا دیکھیں گے ہی نہیں بلکہ خود بھی جھوم اُٹھیں گے اور رقص کرنے لگیں گے۔ روضۂ تاج کو دیکھکر کون ایسا شاعر ہے جو خودبخود گنگنانے نہیں لگتا۔ اگر تاج سے متعلق کہی ہوئی نظمیں جمع کی جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے لیکن جس انداز سے برقؔ نے تاج کو دیکھا وہ اپنی نوعیت اور ندرت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے

دو بند پیش کرتا ہوں ؎

بساطِ خاک پہ تو ہی نگار خانۂ حسن
رقم ہے یا سرِ لوحِ زمیں فسانۂ حسن
جبینِ سنگ پہ منقوش ہی ترانۂ حسن
نظر نواز ہے یا گوہرِ یگانۂ حسن
خجل ہے جلوۂ مہتاب، ہے وہ ضو تجھ میں
نہاں ہے شانِ اداے عروسِ نو تجھ میں

شگفتہ تختۂ نسریں ہی تو کہ قصرِ بلور
سپیدۂ سحری ہے کہ خرمنِ مہ کا نور
نظارۂ کفِ سیلاب ہی کہ چشمۂ نور
فرازِ خاک پہ یا ضو فگن ہے شعلۂ طور
نثارِ جلوۂ سیمیں ہے چشمِ نظارہ
فداے شوکتِ تزئین ہے چشمِ نظارہ

مٹی کا چراغ دیکھکر کہہ اٹھتے ہیں ؎

برق شاید مُہرۂ مارِ سیاہِ شب یہ ہے
یا زمیں پر چرخ سے ٹوٹا ہوا کوکب یہ ہے

بہت پر مرحوم نے کئی ایک نظمیں کہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ہر نظم اپنی منظر کشی کی وجہ سے موثر و کامیاب ہے۔ ایک بند ملاحظہ کیجئے ؎

کنول کے پھولوں سے ہو رہے ہیں کہیں لبِ جو چراغ روشن
ہے انکی رنگیں اداؤں سے منقش آبِ رواں کا دامن
ہوا کی مسرور جنبشوں سے یہ گل جو ہوتے ہیں عکس افگن
مصفا پانی کے آبگینے میں لہریں لیتا ہے روے گلشن

نظارۂ دلکشا ہے ہر سو، حسین ہے جاذبِ نظر ہے
بسنت رت کے ہیں سب کرشمے، بہار ذروں میں جلوہ گر ہے

کرمکِ شب تاب کو اُڑتی پھرتی ہیرے کی کنی کہہ کر برق نے ثابت کر دیا ہے کہ ؎

زمینِ شعر کی زینت کے واسطے اے برق   ستارے توڑ کے لانے ہیں آسماں سے ہمیں

آپ نے ملاحظہ فرمایا وہ ستارۂ صبح ہو یا زردۂ تاج، مٹی کا چراغ ہو، یا کرمکِ شب تاب، سرس کے پھول ہوں یا ٹیسو کے پھول، بسنت ہو یا راس لیلا، غرضکہ برق کی نظر کائنات کی ہر شے پر پڑی۔ اُنھوں نے ہر شے میں حسن کو جھلکتے ہوئے پایا۔ اُن کا طرزِ بیان رنگین اور نہایت اچھوتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں صاحبِ طرز تھے۔

اب میں مختصراً برق کی مذہبی اور قومی نظموں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، برق اُس زمانے میں پیدا ہوئے جب اپنی عزت ناموس اور آزادی کھو چکنے کے بعد قدرتی طور پر ہندوستان کا ذہن اپنی عظمتِ ماضی کے تصور سے تسکین حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ اقبال یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ع

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

برق بھی ہندوستان کی تباہی اور بربادی پر اشکبار ہیں اور حالی اور اقبال کی طرح اپنی قوم کی ترقی و بہبودی تاریخ ماضی کے اوراق میں تلاش

کرتے ہیں ۔ اُن کو یقین ہے کہ گرکر اُبھرنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے اپنے بزرگوں کی عظمت اور اُن کے کارناموں کی یاد اپنے دلوں میں تازہ کرنا منجمد رگوں میں خون گرمانے کی اس سے زیادہ کارگر اور کوئی تدبیر نہیں ۔ چنانچہ برق نے بھگوت کے دوش بدوش رامائن اور مہابھارت کی عظیم الشان گاگزاریوں کو نظمایا ۔ دیوالی اور دسہرہ کی اہمیت کو اُجاگر کیا ۔ مہارانا پرتاپ ، ہیم چندر ، سیلوجی پدمنی اور راجکماری پنا کے شجاعت آفریں پیغام کو تازہ کیا ۔

باعتبار مذہب برق کرشن بھگت تھے اور بھگوت گیتا کے پریمی ۔ اُن کی مذہبی نظموں میں بھگتی رس کی گھلاوٹ ہے ۔ میراں بائی کو وہ سب سے بڑا بھگت سمجھتے تھے ۔ اِن کے نزدیک بھگتی ہی آواگون سے نجات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے ۔ اسی لئے وہ مہرشی دیانند اور گرونانک کے مشن سے متفق نظر آتے ہیں ۔ وہ چھوت چھات کو مذہب کا جزو نہیں سمجھتے بلکہ اس کو انسانیت کی توہین خیال کرتے ہیں ۔ گیتا کا فلسفہ اُن کی نظر میں زندگی کا سب سے اونچا فلسفہ ہے اور وہ کرشن کی بھگتی میں دنیا کے دُکھ درد کا ناش پاتے ہیں ۔ فلسفۂ گیتا کو یوں نظم کے سانچے میں ڈھالتے ہیں ؎

نادان کے لئے مایۂ آفات ہے دنیا
دانا کے لئے جلوہ گہ ذات ہے دنیا
نیرنگ نظر عکس خیالات ہے دنیا
کچھ بھی نہیں اور دارِ مکافات ہے دنیا
دیکھ اسکے تماشوں کو تو شاہد کی نظر سے
ہوش اپنے نہ کھو خواب پریشاں کے اثر سے

جو مکرو مایا کا ہے یہ ہستیٔ موہوم — اگیان میں موجود ہے او گیان میں معدوم
درپردہ یہ اسرارِ حقیقت کا ہے مفہوم — پابندِ علائق نہ ہو رہ صورتِ معصوم
دانا ہے تو رکھ بے غرض افعال سے مطلب
بھولے سے نہ ہو ثمرۂ اعمال سے مطلب

نشکام کا آدرش اگر پیشِ نظر ہو — دامن ترا آلائشِ عصیاں سے نہ تر ہو
وادیدۂ حق میں ہو، حقیقت کی خبر ہو — بازیچۂ فانی میں دوبارہ نہ گذر ہو
پھر قطرہ و دریا میں نہ پردہ رہے باقی
مٹ جائے دوئی ایک ہی جلوہ رہے باقی

جب تک ہے مگر سانس عمل کی ہے ضرورت — آزاد نہیں کرم سے مٹی کی یہ مورت
نشکام سے لیکن رہے یہ کام کی صورت — آئینۂ دل کو نہ لگے زنگ کدورت
بے لوث کنول بن کے تو رہ بحرِ جہاں میں
کثرت میں ہو وحدت کی تجلی دل و جاں میں

کوزہ میں دریا بند کر دینا اسے کہتے ہیں

یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ ہندو مت جس قدر وسیع ہے ہندو اس سے بھی زیادہ وسیع القلب اور وسیع النظر واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ برقؔ ہندو اور مسلمان میں کوئی تفریق نہیں کرتے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ادب سے شاہدِ یکتا کے ہیں سپاس گذار — پیمبروں کا بھی ہم احترام کرتے ہیں

ہے دل سے اُن کے تقدس کا اعتراف ہمیں — خیالِ عظمتِ خیرالانام کرتے ہیں
ہماری آنکھ میں یکساں ہیں ہندو و مسلم — اُسے سلام اُسے رام رام کرتے ہیں
یہ دونوں مادرِ ہندوستاں کی آنکھیں ہیں — وطن پرست کب اس میں کلام کرتے ہیں

برقؔ کے مذہب میں اوتار پرستی واجب ہے۔ وہ کثرت میں وحدت دیکھتے ہیں۔ مورتی پوجا کو حسن نہیں سمجھتے۔ قوموں کا اتحاد اُن کا نصب العین ہے۔ انسان انسان میں تمیز نہیں کرتے۔ بھگتی اور پریم کو ذریعۂ عرفانِ الٰہی سمجھتے ہیں۔ دوسرے مذاہب میں عیب جوئی کے قائل نہیں لیکن یہ بھی ضرور چاہتے ہیں کہ اُن کے عقائد کی توہین نہ کی جائے۔

اقبالؔ کی طرح برقؔ کے ذہن میں بھی ایک مکمل انسان کا تصور قائم ہو رہا تھا لیکن اُن کا انسان اقبالؔ کے انسان سے کچھ جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ افسوس ہے کہ اُنکی زندگی نے وفا نہ کی اور اُن کا یہ تصور پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر نہ ہو سکا۔ تو بھی اُسکی ایک جھلک ہم کو اُن کی مشہور نظم "سبزۂ بیگانہ" میں نظر آتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

وابستہ ہیں نہیں چمنِ روزگار سے — نا آشنا ہوں مگر خزاں و بہار سے
دلبستگی ہے گُل سے، نہ کانٹا ہے خار سے — آئینہ وار صاف ہوں گرد و غبار سے

موجِ جمالِ گُل ہوں نہ شیدائے بو ہوں میں
باغِ جہاں میں سبزۂ بیگانہ خو ہوں میں

کب تک خیال تھا رہے وہم و گماں میں — دو حرف میں نے ڈال دئے تیر کمان میں
پورا اُترنا چاہے اگر امتحان میں — بیگانہ وار تو بھی بسر کر جہان میں

نیرنگِ روزگار کا شائق نہ ہو کبھی
غافل اسیرِ دامِ علائق نہ ہو کبھی

ہرگز ستم نہ توڑ کسی ناتوان ... پر   بے فائدہ عذاب نہ لے اپنی جان پر
دارِ فنا میں بھول نہ تو عزّ و شان پر   او مشتِ خاک اُڑ کے نہ چل آسمان پر
ہشیار ہے تو دہر میں دیوانہ بن کے رہ
باغِ جہاں میں سبزۂ بیگانہ بن کے رہ

مجھے یہ کہتے ہوئے رنج ہوتا ہے کہ اتنی خوبیوں کا مالک تادمِ آخر اپنے لئے شعرِ اُردو میں کوئی مستقل جگہ نہ بنا سکا اور اسکا سب سے بڑا سبب ہے وہ غلط فہمی جسکا ہندوستانی ہندو اور مسلمان صدیوں سے شکار چلا آتا ہے اور مجھے ڈر ہے کہ زمانۂ عنقریب میں یہ غلط فہمی بآسانی دُور نہیں ہو سکتی۔ اس چیز کا احساس خود برقؔ کو بھی تھا اور یہی احساس اُن کے اس شعر کی شکل میں زندۂ جاوید ہو گیا ہے

کھل کے مرجھا بھی گیا آنکھ کسی کی نہ پڑی
میں چمن زارِ جہاں میں گُلِ صحرائی تھا

میں اپنا مختصر اور تشنۂ تکمیل مضمون جناب خواجہ حسن نظامی کے ان الفاظ کے ساتھ ختم کرتا ہوں "اگرچہ برقؔ آج ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن اُن کا کلام ہمیشہ اُن کی ہستی کو ہم میں قائم اور برقرار رکھے گا"

عظمتِ برق

(جناب پروفیسر آنند ناتھ ورما۔ ایم۔ اے)

حاضرینِ جلسہ! منشی مہاراج بہادر برق بی اے منشی فاضل کی کچھ ایسی ہستی نہ تھی جس سے دہلی کا بلکہ ہندوستان کا کوئی باشندہ جسے ذرا بھی علمی شوق یا ادبی ذوق ہو، ناواقف ہو۔ قدرت نے اُن کی فطرت ہی میں شاعری کا مادہ کُوٹ کُوٹ کر بھرا تھا۔ گرچہ اکتسابِ علوم میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے لیکن طبیعت موزوں پائی تھی۔ ماحول کا بھی انسان پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ برق صاحب کی ولادت و تربیت ایسے خاندان میں ہوئی تھی جو شعر و سخن سے پوری طرح مانوس تھا اور جس کے ارکان اُدبائے نکتہ سنج کی شمار میں تھے۔

برق صاحب اس خاکسار کے دوست اور کرم فرما تھے۔ تقریباً تیس سال سے نیازمند کا اُن سے اختلاط و ارتباط چلا آتا تھا۔ اکثر جلسوں میں اور مشاعروں میں اُن سے ملنا جلنا رہتا تھا۔ اُن کی دلی خواہش یہ تھی کہ ڈی اے جی کے دفتر کے زہدِ خشک کے حلقے سے نکل کر اپنی جولانی طبع کی بہار سے طالبانِ سخنوری کو فیض پہنچائیں۔ چنانچہ کئی دفعہ اُنھوں نے ارادہ کیا کہ میعاد مقررہ سے پہلے ہی بارِ ملازمت سے سبکدوش ہو کر کسی ادبی ماحول میں داخل ہو جائیں۔ ہندو کالج کے

اکثر طلباء ہندو کی ہدایت سے اپنی نظموں کی اصلاح کی غرض سے برق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ کالج کے سالانہ مشاعرہ میں وہ ضرور تشریف لاتے تھے اور اپنے کلام معجز نظام سے ارباب جلسہ کو محظوظ کیا کرتے ہندو کالج کے ارباب حل و عقد کی بھی یہ تمنا تھی کہ مسند اُردو ادب اُن کی ذات والا صفات سے مزین ہو۔ یوں تو ہر ملک میں شاعر پیدا ہوتے آئے ہیں اور ہندوستان میں بھی لکیر کے فقیر نظم نگاروں کی کچھ قلت نہیں۔ وہی گل و بلبل کا ذکر۔ وہی لیلےٰ مجنوں کا تذکرہ۔ وہی فرسودہ استعارات وہی پُرانی تشبیہات لیکن حسنِ تخیل اور جدت آفرینی کچھ اور ہی چیز ہے۔

برق صاحب نے مناظرِ قدرت کی تصویر کھینچنے میں بڑا کمال دکھلایا ہے معمولی سے منظرِ فطرت کو جس کو ہر فرد و بشر ہر روز دیکھتا ہے، وہ ایک بالکل نئے پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ آپ کی ایک نظم کے اشعار جس کا عنوان 'بہارِ شفق' ہے گوش گزار کرتا ہوں:۔

ہے جلوۂ بہارِ شفق آسمان پر | صہبائے سُرخ یا یہ خمِ نیلگوں میں ہے
پردے سے مہر جلوہ فگن ہے جہان پر | یا برقِ بیقرار تڑپ کر سکوں میں ہے

لایا ہے رنگ خونِ شہیدانِ نامراد | یا آگ لگ رہی ہے کسی لالہ زار میں
یا مشتعل فرشتوں میں ہے آتشِ فساد | یا گرم کارزار ہے یہ نور و نار میں

کیا آسماں کو لال کئے ہیں خدا کی شان
پھیکا ہے جن کی آب سے رنگ گلاب سُرخ
یا ہے نظر کو شعلۂ جوالہ کا گمان
یا دامن فلک پہ گری ہے شراب سُرخ

پہنچا ہے اُڑ کے تا فلکِ اخضری گُلال
ہولی کا یہ کاسۂ گردوں میں رنگ ہے
یا روئے مہر پہ ہے یہ سُرخیٔ انفعال
غصے سے لال روئے حسینِ فرنگ ہے

ہر چیز کو نظر غائر سے دیکھنا اور اس کی تہ کو پہنچنا شاعری کا ایک جزو اعظم ہے محض کلمات موزوں اور مقفیٰ کے جمع کرنے کو اصطلاح عام میں تک بندی کہتے ہیں۔ شعر کے لئے خیال بمنزلہ روح ہے اور طرز ادا جسم سے مشابہت رکھتی ہے۔ برق صاحب کی نظموں میں روح اور جسم دونوں دلفریب ہیں چنانچہ اشعار مندرجہ بالا سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں تشبیہات کا سمندر اُمنڈا چلا آتا ہے۔ جذبات کا تلاطم ہے کہ قابو ہی میں نہیں آتا۔ عقل قاصر ہے، فکر عاجز ہے کہ کونسی تشبیہ کو دوسری سے فائق سمجھے۔ خواہ اس کو طلسم کاری کہئے، خواہ سحر کاری مانئے سب کچھ بجا ہے۔ یہ وہی شاعری ہے جسکی بابت کہا گیا ہے سے

شاعری جزویست از پیغمبری

برق صاحب کی ہر ایک نظم تبصرے کے لائق ہے لیکن اگر ایسا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوجائے لہذا بمصداق مقولہ مشتے نمونہ از خروارے۔ اتنی ہی سمع خراشی پر اکتفا کرتا ہوں +

مہاراج بہادر برق دہلوی

(جناب پنڈت بالمکند عرش ملسیانی بی اے)

ماخوذ از آجکل ۱۵ جون ۱۹۴۳ء

میر و مرزا کی دلّی جو حکومت کا دارالسلطنت ہونے کے علاوہ مرکز علم و ادب کہلاتی تھی وہ دلّی نہ رہی۔ صاحب کمال رفتہ رفتہ اُٹھ گئے، اور اس کے بعد اس اُجڑے ہوئے گلشن کا یہ حال تھا جیسے یہاں بہار کبھی آئی ہی نہ تھی۔ بقول علامہ کیفی برق صاحب ایسے عبوری دور میں پیدا ہوئے، جب نہ وہ لال قلعہ، لال قلعہ اور نہ وہ دلّی دلّی تھی۔ ایسے حالات میں پیدا ہو کر دلّی کی سُتھری اور نِتھری زبان کے علمبرداروں میں پیش پیش رہنے والوں میں سے برق ایک خاص درجہ رکھتے تھے۔

رئیسوں کی شب بیداری اور اُس کے ساتھ شاعری کے رہینِ چنگ و رباب ہونے کا ماحول اپنے ناپائدار نقوش چھوڑتا ہوا دھوئیں کے فرضی بادلوں کی طرح ہٹ رہا تھا، اور اس کے ساتھ شعر کی دنیا نئے مناظر اور نئے عالم پیش کرنے میں مصروف کار تھی۔ انگریزی بلکہ مغربی علم و ادب سے بہرہ اندوز ہو کر اہلِ علم و ادب وسعتِ معلومات کے تحت شعر کی فرسودہ تنگ خیالیوں اور قدامت پسندیوں کو خیرباد کہنے کا تقاضا کرنے لگے۔ برق ان محرکات نو سے بہت متاثر ہوئے۔ کچھ

ارادی طور پر اور زیادہ فطری طور پر۔ گو آپ نے غزل اور نظم دونوں میدانوں میں داد سخن دی ہے لیکن غزل میں بھی آپ جدید خیالات اور جدید رجحانات پیش کرنے میں پیش پیش ہیں اور آپ کا ذوقِ سخن پاکیزگی کے معیارِ خاص کا آئینہ دار ہے۔ مطلع انوار حقیقت میں مطلع انوار ہے، جس کی ضیا پاشیوں سے فضائے شعر سعدؔ پُر نور ہو گئی کہ باید و شاید۔ آپ سینے میں ایک دردمند دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اور اس جذبۂ فطری کی جھلک آپ کے کلام میں ہر جگہ ملتی ہے۔ پُرانی ڈگر سے ہٹ کر آپ نے اپنے لئے نئے موضوعاتِ نظم تلاش کئے اور حق یہ ہے کہ وہ دادِ سخن دی جس کی مثال بہت کمیاب ہے۔ آپ کی طبیعت رسا تھی۔ الفاظ اور تراکیب کا ذخیرہ کافی موجود تھا۔ کلام میں انفرادیت کا عنصر نمایاں ہے۔ تصوف کے خارزار کو گلستانِ معنی بنانا آپ کا معمولی سا کام ہے ؎

جسم فانی، جہان فانی ہے
نشۂ زلیست سرگرانی ہے
نقش بر آب زندگانی ہے
ٹوٹتے ہی حباب پانی ہے

بحرِ ہستی سے تو کنارا کر
ساحل و موج کا نظارا کر

مسئلہ خودی کی بہت سی تفسیریں ہوئیں، اسرار و رموز کی گلکاریوں سے اس باغ کی زینت ہوئی۔ بیگانہ رو دوستوں نے زمانے کے طرزِ عمل پر تنقید کے نشتر سے کام لیا تاکہ ناحق پرستی کا پھوڑا زیادہ نہ پک سکے۔ ؎

بُت پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے   یا بس کس دن کے لئے ناحق پرستی کیجئے

اسی خود پرست شاعر کا ایک شعر ہے ؎

خضرِ منزل اپنا ہوں اپنی راہ چلتا ہوں   میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

آیئے برقؔ کے ہاں خود پرستی کی محبوبہ کی عروسانہ شان اور اسکا حُسنِ ظاہر باطن دیکھئے ؎

مائلِ جلوۂ مجاز نہ ہو   غافلِ چشمِ امتیاز نہ ہو
ناشناسِ نوائے راز نہ ہو   حُسنِ معنیٰ سے بے نیاز نہ ہو

حق رسی مدعا شناسی ہے
خود شناسی خدا شناسی ہے

حُسنِ فطرت، ستارۂ صبح، جلوۂ سحر، بہارِ شفق، لبنت زرت، تاروں بھری رات، ماہِ تاباں، شبِ ماہتاب، قوسِ قزح، برسات کی شام، ٹیسو کے پھول، چمپے کی کلیاں، شام، گلِ تر، ابرِ کرم برس، جوشِ بہار، برسات اور مناظرِ کوہ، عروسِ کوہسار کرمکِ شب تاب۔ یہ وہ موضوعات ہیں جن پر برقؔ نے طبع آزمائی کی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ وہ ایک کامل نقاش، ایک صاحبِ فن عکاس اور ایک فطرت نگار شاعر ہیں منتخب کلام تو منتخب ہونے کی حیثیت سے اچھا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو یہ فریب نہ دیتا ہو آپ کی ایک پوری نظم کی طرف توجہ دلاتا ہوں جسکا عنوان کرمکِ شب تاب یا جگنو ہے مرحوم کو یہ نظم بہت عزیز اور

پسند تھی۔ شملہ کے ایک مشاعرے میں، جہاں مجھے پہلی اور آخری دفعہ مرحوم کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی، میں نے یہ نظم خود آپ کی زبانِ مبارک سے سُنی۔ نظم پڑھتے ہوئے آپ کا لہجہ، آپ کا پُریقین انداز زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ خود آپ کو اس نظم پر فخر ہے اور حق تو یہ ہے کہ یہ نظم اُردو زبان کا ایک قیمتی سرمایہ ہے اور اس سلکِ مرصع کا نہایت تابندہ گوہر۔ نادر تشبیہوں کے دریا ہیں کہ چڑھے آتے ہیں حسنِ تراکیب کی سیل ہے کہ اُمڈی چلی آتی ہے، زورِ بیان کے بادل ہیں کہ چھائے چلے جاتے ہیں۔ سنئے ؎

پرتوِ نور ہے یا شمعِ شب افروز ہے تُو
آتشِ حسن کا یا پارۂ دلسوز ہے تُو

یا ہے غلطیدہ ہوا میں دُرِ شبنم کوئی
شررِ آتشِ گُل یا ہے مجسم کوئی

خندۂ جامِ بلوریں ہے ہوا میں پرّاں
گرمِ پرواز ہے یا پرتوِ شاخِ مرجاں

محوِ پرواز یہ لعلِ یمنی ہے شاید
اُڑتی پھرتی کوئی ہیرے کی کنی ہو شاید

شمعِ رخسارِ گُلِ تر کا جو دیوانہ ہے
پیرہن نور کا پہنے ہوئے پروانہ ہے

آتشِ حسن کی اُڑتی ہوئی چنگاری ہو
شبِ تاریک میں جو محوِ ضیا باری ہے

چشمکِ برق کا یہ نقشِ توہّم تو نہیں
غنچۂ نیم شگفتہ کا تبسّم تو نہیں

برقِ رخسار کا یا جلوۂ بیتاب کہوں
اس کو اُڑتا ہوا اک قطرۂ سیماب کہوں

کسی ناشاد کی آہوں کا شرارا تو نہیں
آسماں سے کوئی ٹوٹا ہوا تارا تو نہیں

تجھ میں اے کرمکِ شب تاب چمک نور کی ہو
چشمکِ برق کو نسبت ہی مگر دُور کی ہے

لیلیٔ شب کا چراغِ تہِ داماں ہے تو
یا کہ چھوٹی سی کوئی مشعلِ روشن ہے تو

شوخیوں میں ہیں تری برقِ نظر کے انداز
تیری پرواز میں ہیں رقصِ شرر کے انداز

کمسنوں کے لئے معشوقِ دل آرا ہے تو
دیدہ بازوں کے لئے آنکھ کا تارا ہے تو

برقِ ایمن کو جو منظور ہوئی اپنی نمود
ڈھل گیا نور کے سانچے میں ترا نقشِ وجود

حسن میں تیرے عجب نازِ دل آرائی ہے
تیرا جلوہ کبھی پنہاں کبھی پیدائی ہے

تیری تنویر میں ہے فاسفرس کا جلوہ
جس کے آگے ہے خجل شعلۂ خس کا جلوہ

جلوۂ حسن ترا پردے سے مانوس نہیں
تو ہے وہ شمع جو شرمندۂ فانوس نہیں

شبِ تاریک میں صد مایۂ تابش بن کر
محوِ پرواز ہے پرکالۂ آتش بن کر

میہماں صحنِ گلستاں میں ہے تو رات کی رات
مایۂ عیش ہے تیرے لئے برسات کی رات

تیری پرواز نے کھینچی وہ طلائی جدول
جس سے زرتار ہوا لیلیٔ شب کا آنچل

تیرے جلوے سے منور ہوا صحنِ گلشن
تو ہے وہ شمع جو ہے موجِ ہوا پر روشن

تابش افزائے نظر تیری شرر باری ہے
پھر چمک! برق کے لب پر یہ سخن جاری ہے

اور اگر میں برق سے مخاطب ہو کر کہوں

پھر چمک! عرش کے لب پر یہ سخن جاری ہے

اس نظم کی داد کا کچھ تو حق ادا ہو جائے۔

اس نظم کو دیکھئے اور برق صاحب کا طبع مواج کا اندازہ لگائیے تشبیہوں کی

ندرت خیالات کی گوناگونی، اور اندازِ بیان کی بوقلمونی۔ ہر رنگ کے پھول اس گلدستے کی زینت ہیں۔

مناظرِ فطرت کے ان عنوانات کے علاوہ کرشن بھگوان، بانسری، پدمنی کا جوہر، میراں بائی بھیلنی کے بیر، راجکماری تپا، دسہرہ، بھرت ملاپ، گرو نانک، دان ویرکرن، کرشن سداما، مہارانا پرتاپ کی تلوار،

یہ چند عنوانات آپ کے حسنِ مذاق کے ساتھ حسنِ عقیدت کے مظہر ہیں۔ خالد و فاروق کی مدح سرائی، اندلس کی نوحہ خوانی، خاکِ بطحا کی تقدیس کا بیان، اگر ہمارے جلیل القدر شعراء کے حکیمِ ملت اور شاعرِ مشرق بننے میں مانع نہیں تو میرا خیال ہے برق صاحب کا یہ رجحان بھی انھیں کسی طرح سے ان کے مراتب سے نیچے نہیں لا سکتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ برق اپنے اس رجحان کی بنا پر اور بھی ممتاز ہیں۔ ہندوستان میں پیدا ہو کر ہندوستان کی تاریخ اور ہندو ہوتے ہوئے ہندو تاریخ اُن کی نظم کا موضوع خاص رہی۔ اس لحاظ سے ان کے شعر میں ایک بصیرت افروز اور بصارت افروز جھلک سے سامانِ نظارہ بہم کیا۔ اُن کی بھگتی کا جذبہ آبائی عظمت کا غرور، اسلاف کا تقدس، اجداد کی شوکتوں کا جلال، القصہ چمکتے ہوئے ماضی کی درخشندگی اُن کی آنکھوں میں اس طرح سمائی کہ جس خیال پر پڑی، وہ بھی حسین الفاظ کا لبوس زیب تن کر ناظرین کے سامنے ایک عفت مآب عروس نو کی صورت سے جلوہ گر ہو گیا۔

دانِ ویر کرن کا ایک بند سنئے

ارجن کے جو بانوں کے چھد اقلب و جگر ہے — صد زخم رسیدہ کرنِ سینہ سپر ہے
غرقاب لہو میں ہے، بدن خاک بسر ہے — الجھا سرِ دامانِ مژہ تارِ نظر ہے

نخچیرِ زبوں حال کا دم ٹوٹ رہا ہے
ہر زخم سے فوارۂ خوں چھوٹ رہا ہے

دمِ آخر جب کچھ بھی پاس نہیں تو یہ مہا دانی یہ دان پیش کرتا ہے

سونے کی مرے دانت میں اک کیل جڑی ہے
لیجاؤ وہی تم کہ مصیبت کی گھڑی ہے

شاعری میں واقعیت ... ایک فردی عنصر ہے، اور یہ شعر اسکی زندہ مثال دنیا کے مشہور سخی مشاہیر کی مدح کا خیال نہ جانے برق کو آیا یا نہیں، ہاں ہندستان کے اس عدیم المثال سخی کو وہ نہ بھولے۔

مذہب اور عقیدت کی نسبتاً خشک دنیا میں بھی آپ گلِ خوش رنگ کی طرح جلوہ افروز ہیں، اور عنبر کی طرح مشک فشاں۔

کرد نارس یا سوز و گداز کا عالم دیکھنا ہو تو ہجومِ یاس، شمع کشتہ، دلِ درد آشنا حبیب النساء کی قبر، دورنگیٔ زمانہ، نالۂ بیوہ، یتیموں کی فریاد پڑھئے۔

تصوف، درسِ خودی، پیغامِ مساوات کا مطالعہ مقصود ہو تو جلوۂ حق، سکارِ خیر، رضی برضا، ہمہ اوست، اچھوتوں سے نفرت فضول ہے۔ وغیرہ نظموں میں آپ کی

برق پاش طبیعت کو سکون اور شانتی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے ملاحظہ فرمائیے اور اصغر گونڈوی مرحوم کے الفاظ میں قدرے تصرف کے ساتھ اس بات پر اتفاق کیجئے کہ یادش بخیر دلی نے اپنے عہدِ ماضی میں کیا کیا بلند مرتبت ہستیاں تیار کی تھیں۔ ایک مدت کے بعد اس کی خاک سے پھر ایک شرارہ بلند ہو کر ستارے کی طرح افقِ شاعری پر نمودار ہوا تھا اور آفتاب بنا ہی تھا کہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

علامہ کیفی کے قول کو پیش کرتا ہوں۔ جنابِ برقؔ کے متعلق فرماتے ہیں "صلاحیت گرطراری کے ساتھ۔ ذوقِ سخن کلاسیکل مگر نو آئینی کے ساتھ، بڑوں کا ادب مگر خودداری کے ساتھ، یہ اُن کے مزاج کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے"

آپ کا دوسرا مجموعہ حال ہی میں آپ کے سعادتمند فرزندِ معنوی جنابِ طالبؔ کی کوششوں سے "حرفِ ناتمام" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں نظموں کے علاوہ چند غزلیں اور منتخب اشعار بھی درج کئے گئے ہیں آپ کی ایک سالم غزل پیش کرتا ہوں ؎

تجھے نخلِ بندِ حیات نے تری کاوشوں کے یہ پھل دئے
کیا خلق باغِ جہاں میں جب تو ثمر بھی حسبِ عمل دئے

کوئی ڈھونڈے لے کے چراغ بھی نہ ملیگا انکا سُراغ بھی
کہیں ان کا نام و نشاں نہیں جو عدم کو قافلے چل دئے

جو کسی نے ہمتیں صرف کیں تو دلی مُرادیں اُسے ملیں
جو شکم میں خاک کے تھے نہاں وہ دفینے اس نے اُگل دئے

یہ طلسم خانۂ دہر ہے وہ نظر فریب کہ قہر ہے
ہمیں کیا حیات دوروزہ دی جو ہزار اس میں خلل دئے

یہ رواردی کا مقام ہے، یہ اجل کا شیوۂ عام ہے
جو لباس زیست کہن ہوئے تو وہ دم زدن میں بدل دئے

نہ غرض متاع جہاں سے کچھ نہ ہمارا مال ہے لقدر جاں
تہی دست آئے تھے ہم یہاں تہی دست دہر سے چل دئے

جو مآل کار یہ ہے نظر، دل و جاں سے خدمت خلق کر
کہ یہ عقل و ہوش یہ دست و پا تجھے ہر حسن عمل دئے

یہ گلہ ہے رب کریم سے، ملا کچھ نہ فیض عمیم سے
جو دئے یاں چند نفس ہمیں وہ برائے نذر اجل دئے

تو ہی شش جہت میں ہے ضو فشاں نہیں ماسوا کا کہیں نشاں
پس پردہ ہو کے عبث نہاں یہ فریب حسن ازل دئے

اس غزل کو دیکھئے اور فیصلہ کیجئے کہ جناب برق نظم کے میدان کے مرد تھے
بلکہ غزلگو شاعر ہی کہنا پڑے گا کہ آپ قادر الکلام سخن گو تھے اور آپ کے
رس فکر نے جدید میلان کا سہارا لے کر ریاض علم و ادب کو نئے مضمون اور
عنوانات سے مزین کیا۔

مفسر تہذیب ہنود ہونے کے علاوہ وہ ایک ہمہ گیر شاعر تھے اور انکے کلام میں

وہ تمام باتیں ملتی ہیں جنھیں انسان کے احساسات کی متاعِ مشترک کہا جاتا ہے۔ درد
اشتیاق کی کسک، سوز و گداز کی جلن، کیف و سرمستی، آشفتگی و سراسیمگی، واہ کی طرب
افزائیوں کے ساتھ آہ کی جگر دوزیاں۔ الغرض آپ کے ہاں یہ سب کچھ اپنی اپنی جگہ
نمایاں ہے۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے شبلی، حالی، اور اقبال سے دین پرستوں کی
صف بنا کر برق کو بھی اُن کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔ اول تو شاعر فطری طور پر تنگ نظر
نہیں ہو سکتا اور اس کے باوجود اگر وہ فطری طور پر یا ماحول کے زیرِ اثر اگر مذہب اور
تاریخ کا سہارا لے کر کچھ کہہ جائے تو یہ اس کے محض دین پرست ہونے کی دلیل نہیں
بلکہ اُس کے دیگر افکار کے ساتھ شامل کر کے اُس کے ایک قادر الکلام شاعر ہونے کا
ثبوت ہے۔ ڈاکٹر دیوانہ حرفِ ناتمام کا دیباچہ یا مقدمہ لکھتے ہوئے نہ جانے کس
عالمِ ہوش میں تھے کہ اُنہوں نے اپنی تمام فضیلت صرف اسی بات پر صرف کر دی
کہ برق ہندو قوم کا ایک بے بدل سرمایہ ہیں، اور شاید جو کچھ آپ نے فرمایا وہ ان ادباء
کی تعالی یا تتبع میں فرمایا جو اقبال اور حالی کو محض شعرائے اسلام سمجھتے ہیں، میرا
نظریہ ان سب سے مختلف ہے، اور میں شاعر کو کائناتِ بسیط کا ایک ضروری جزو
سمجھتا ہوں اور ہر قید و بند سے آزاد۔ ماحول کے زیرِ اثر وہ جو کچھ بھی کہہ جائے غنیمت
ہے اور اہلِ نظر تو اس کے دریائے سخن میں ہر طرح کے گہر ہائے آبدار دیکھ ہی لیں گے
عوام کے لئے بھی اس کے ہاں وہ باتیں موجود ہوں گی جن کے وہ طالب ہیں۔ کیف و سرور
بھی ہوگا، کربِ اضطراب بھی، آہِ پُر درد بھی اور نعرۂ مسرت بھی۔ خود دیوانہ صاحب کے

برق کے ہاں سے جو شعر پسند آئے ان میں سے کچھ شعر پیش کرتا ہوں ؎

جب آنکھیں پھیر لیتے ہو تو کوئی رخ نہیں کرتا
گراتے ہو نظر سے تم جسے مشکل سے اٹھتا ہے

اشک ریزی اس کی فطرت ہے بدل سکتی نہیں
قبر بیکس پر جلے یا شمع محفل میں رہے

جب سے میں کنج قناعت میں ہوا ہوں گوشہ گیر
ہے بساط خاک اورنگ سلیمانی مجھے

دل تری زد پر نگاہ فتنہ ساز آہی گیا
بچتے بچتے بھی تہ شمشیر ناز آہی گیا

آخر میں دیوانہ صاحب فرماتے ہیں "میں شعر برق سے انصاف نہیں کر پایا۔ اسکا مجھے احساس ہے"۔ بے بضاعتی کا یہ اعتراف اور اسکے ساتھ حقیقت کا یہ اظہار قابل داد ہے۔ واقعی شعر برق سے انصاف جبھی ہو سکتا ہے جب اس کو تمام فرسودہ قیود سے آزاد سمجھا جائے۔ خود برق ہی اپنے آپ سے انصاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

معجزہ عالم امکاں میں ہے شاعر کا وجود
اس کی اعجاز بیانی سے سخن کی ہے نمود

اس کی تخیّل فلک تاز ہے آزادِ قیود
ہیچ ہیں اس کے لئے عالمِ بالا کی حدود
یہ وہ ہے یار جسے جلوہ گہِ ناز میں ہے
اس کے لب پر ہے وہ نغمہ جو نہاں ساز میں ہے
موقلم ہے اسے درکار نہ پرکار سے کام
لے سے محتاج نہیں ہے یہ مغنّیِ کلام
غیب سے ہوتا ہے، ہوتا ہے جو اسکو الہام
لبِ گفتار سے دیتا ہے یہ قدرت کا پیام
بحرِ معنی کا شناور ہے گہر پاشِ سخن
حسنِ فطرت کا مصوّر ہے یہ نقاشِ سخن

وقت کوتاہ و قصہ طولانی والی بات ہے اور اس کے ساتھ اپنی کوتاہ علمی کا احساس بھی بدرق قبل از وقت ہم سے جدا ہو گئے۔ اُردو ادب کے آئندہ مؤرّخ آپ کو اُردو کے محسنوں کی صفِ اوّل میں جگہ دیں گے اور یہی ان کا مقام ہے۔

شردھانجلی

(جناب لالہ انوپ چند صاحب آفتاب پانی پتی)

آج سرشار[1] و افق[2] سے ہیں کہاں معجز بیاں
اب سرور[3] و سحر[4] کو پائیں گے اہلِ دل کہاں

ڈھونڈتی پھرتی ہیں نظریں ساحر[5] و چکبست[6] کو
کیوں نہیں سننے میں آتا نغمۂ مہر[7] و رواں[8]

دم غنیمت آج بھی محروم[9] اور کیفی[10] کا ہے
دب رہی ہے جن کے احسانات سے اردو زباں

ہیں بہت اہلِ سخن یوں تو جہاں میں آفتاب
نظم میں لیکن کہاں اب برق کی بے تابیاں

---

(۱) فخر الملک پنڈت رتن ناتھ سرشار مصنف فسانۂ آزاد (۲) ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی (۳) شاعرِ جوانمرگ منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی (۴) شاعرِ فطرت منشی اقبال ورما سحر ہتگامی بی اے (۵) ادیب روزگار پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی (۶) شاعرِ قوم پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی (۷) ویدانت رتن منشی سورج نرائن مہر دہلوی
(۸) مصورِ فطرت جناب چودھری جگت موہن لال رواں ایم اے ایل ایل بی آنادی
(۹) فاضل اعظم منشی تلوک چند محروم (۱۰) علامۂ عصر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، دہلوی

افتخار الشعرا حضرت برقؔ مرحوم کترین کے دیرینہ مہربان اور محسنوں میں سے ایک آزاد خیال قوم پرست شاعر تھے۔ فی الواقع آپ کی ذاتِ والا صفات مجموعہ محسنات تھی ۱۹۵۱ء میں جب میرا مجموعہ کلام جلوہ آفتاب کے نام سے شائع ہوا تو آپ نے تاریخ فرمائی ملاحظہ ہو۔

ضیا خیز ہے جلوۂ آفتاب۔ کیا اس سے بہتر تاریخ ممکن ہے؟

پنجاب کے ایک مشہور اخبار نے رام نمبر نکالا۔ کارکنانِ اخبار کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ بہترین نظم پر انعام دیا جائیگا۔ یہ انعام آپ ہی کے حصہ میں آیا البلد نمونہ مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

رام بن باس کی مدت قریب الختم ہے۔ بھرت ہمہ تن انتظار ہیں۔ اُنکی نفسیاتی یعنی Psychological کیفیات میرے محبوب آنجہانی حضرت برقؔ کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

امید و بیم سے دل میں عجب تلاطم ہے — کچھ انبساط میں ہیں کچھ اداس بیٹھے ہیں
کبھی خیال یہ آتا ہے کچھ قصور ہوا — مجھے بھلائے ہو وہ حق شناس بیٹھے ہیں
کبھی یہ سوچتے ہیں خوش نصیب ہیں لچھمن — کہیں تو دور ہوں، وہ انکے پاس بیٹھے ہیں

نہ آئے رام تو ہم بھی پران تج دینگے
یہ دل میں ٹھانے ہوئے بے ہراس بیٹھے ہیں

لیکن یہ نوبت نہیں آنے پاتی کہ رام آجاتے ہیں۔

رام کا دیدار نصیب ہونے پر جس مد و جزر کے عالم سے بھرت دو چار

ہوتے ہیں، قلم میں اُس کی سمائی کہاں تاہم درج ذیل اشعار پر نظر ڈالئے اور شاعر کی اعلیٰ جذبات نگاری کی داد دیجئے۔

حیاتِ تازہ ملی سُن کے مژدہ جاں بخش — بھرت کی جان میں جان آگئی جو رام آئے
گلے لگانے کو یوں آئیں تینوں ماتائیں — کہ جیسے پیاس بجھانے کو تشنہ کام آئے
بھرت نے دوڑ کے خاک قدم رکھی سر پر — ہجومِ شوق کا آنسو لئے پیام آئے
نہ نکلی بات بھی پوری برائے پرسشِ حال
لبوں تک آئے تو کچھ لفظ ناتمام آئے

تُلسی کے بیر، بھگتی رس کی بہترین تفسیر ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو

بھگوان نے اخلاص و مدارات کو دیکھا — وارفتہ دیدار کے جذبات کو دیکھا
کچھ ذات کو دیکھا نہ کچھ اوقات کو دیکھا — دیکھا تو فقط پریم کی سوغات کو دیکھا
ڈوبے ہوئے تھے بحرِ محبت کے جوش میں
خود پریم کے ساگر بھی ہوئے پریم کے بس میں

ہر اُردو داں اور انگریزی سے واقف کرشن سدا ماں ملن کے درج ذیل بند کو دیکھ کر بے ساختہ کہہ اُٹھے گا کہ Short and Sweet کا اس سے زیادہ برمحل استعمال ممکن نہیں اور جذباتِ نگاری کا تو کیا ہی کہنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دریا کوزہ میں بند کر دیا ہے

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

سنا جب لکشمی پت نے تو ہو کر بے قرار اُٹھے
طلائی تخت سے چشم سراپا انتظار اُٹھے
رہی چوسر کے پانسوں کی نہ سُدھ بے اختیار اُٹھے
فدا ہونے کو روئے یار پر پروانہ وار اُٹھے
جھپکتے ہی پلک سیراب نظارہ نگاہیں تھیں
سداماں کے گلے کا ہار منموہن کی باہیں تھیں

کتنا پاکیزہ اور پُر تاثیر کلام ہے۔ شاعر کے لئے سب سے مشکل کلام یہ ہے کہ جس مضمون کو لے، بامحاورہ، سلیس، موثر اور دلکش زبان میں اُس کی ایسی تصویر کھینچ دے جو دل میں گھر کر جائے۔ اس کسوٹی پر بھی برق مرحوم کا کلام کھرا کس دیتا ہے۔ آپ کے کلام پر غور کرنے سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ آپ کا لفظ لفظ آپ کے محسوسات اور دلی جذبات کا بہترین آئینہ دار ہے۔

عالم شباب کی یاد، آپ کی اُس ذہنی کیفیت کا پتہ دیتی ہے جو آپ کی دختر نیک اختر کے ناگہانی موت سے متعلق ہے۔ اختصار مدِ نظر ہے، اسلئے محض دو بند پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

نہ شوق گرمیٔ محفل، نہ ذوقِ بزمِ سخن دماغ جلوۂ گل ہے، نہ لطفِ سیرِ چمن
بجائے خندۂ لب خامشی ہے مُہرِ دہن شگفتگی کی جگہ ہوں فسردگی ہمہ تن
ہے دورِ عیش کو نسبت خیال و خواب کے ساتھ
گئیں شباب کی رنگینیاں شباب کے ساتھ

نہ وہ غمِ عشق و غمِ جاں نواز کی باتیں فسردگی میں کہاں سوز و ساز کی باتیں
نہ دل سے اب نگہِ مستِ ناز کی باتیں نہ وہ کنائے، نہ راز و نیاز کی باتیں

کہاں وہ حسنِ طلب سعیٔ کامیاب کے ساتھ
گئیں شباب کی رنگینیاں شباب کے ساتھ

کتنی صاف ستھری پاکیزہ زبان ہے اور کیسے پُر اثر الفاظ میں غم انگیز جذبات کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اہلِ درد ہی کچھ اسکا مزا اٹھا سکتے ہیں۔ سچ ہے ؎

آپ کیا جانیں غمِ عشق کسے کہتے ہیں
درد کا اس کو مزا کیا جو دل افگار نہ ہو (برقؔ)

آئینۂ جذبات

(جناب پروفیسر بھگوت سروپ ایم اے)

چار پانچ روز ہوئے جناب طالبؔ کالج میں تشریف لائے اور مجھے یومِ برقؔ میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ تقریر کرنا ہوگی۔ دعوت نامہ پاکر جو خوشی کی لہر اٹھی تھی، وہ وہیں کی وہیں بیٹھ گئی۔ دعوت نامہ کے لئے شکریہ ادا کرنے کی بجائے معذرت پیش کرنے لگا۔ آجکل کالج میں کام کی بھرمار ہے۔ پڑھائی کا زور اور دیگر مصروفیات کی کثرت۔ ڈرامہ، مباحثہ، کنسرٹ Concert کھیل کود، غرض یہ کہ دم مارنے کی مہلت نہیں۔ مجھے طالبؔ صاحب سے بڑی شکایت ہے۔ جہاں جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مدظلہٗ جیسے عالم جیّد، فاضل اجل، ادیب بے مثل، نقّاد پختہ مشق کو ہفتوں پہلے اطلاع دی گئی، اس ہیچمدان کو صرف چند روز کا نوٹس ملا لیکن عدول حکمی کی ہمت نہ ہوئی۔ طالبؔ صاحب ہمارے کالج کے پرانے طالب علم ہیں اس محلہ میں کئی سال آپ کے زیرِ سایہ بھی رہ چکا ہوں۔ اور پھر برقؔ مرحوم سے

(ط) ڈاکٹر عبدالحق صاحب اس جلسے کے صدر تھے اور پروفیسر صاحب کو محض ایک تقریر کرنا تھی۔ یوں بھی پروفیسر صاحب لیکچر بازی کے عادی ٹھیرے۔ یہ شکایت اگر اظہارِ کسر نفسی نہیں تو اور کیا ہے۔ (۲-۳) عدول حکمی، اور زیرِ سایہ کی بھی ایک ہی رہی ــــ طالبؔ دہلوی

آپ کا حسنِ عقیدت بکس منہ سے انکار کرتا؟ لیکن آپ مشکلات کا اندازہ لگائیں
برقؔ مرحوم سے کبھی نیاز حاصل نہ ہوا۔ چند بار انہیں مشاعروں میں پڑھتے ضرور سنا
لیکن مشاعروں میں کسی شاعر کے کلام کو تنقید کے کانوں سے سننے کا موقعہ نہیں
ملا کرتا۔ وہاں تو سامعین شعرا کی جادو بیانی سے مسحور ہو کر سر دھنتے ہیں۔ اتنی فرصت
کسے کہ محاسن و معائب پر غور کرے۔ شعر و شاعری پر تنقید و تبصرہ تو آرام کرسی پر
بیٹھ کر کیا جاتا ہے۔

جہاں تک مرحوم کی ذاتی خوبیوں، اُن کے حسنِ اخلاق اور عادات و خصائل کا
تعلق ہے، اُن کے احباب، تلامذہ اور ہمعصر شعرا ہی کچھ فرما سکتے ہیں۔ مجھے صرف
اتنا یاد ہے کہ وہ بہت متین، سنجیدہ اور کم سخن تھے مگر جب اپنا کلام پڑھ کر سناتے تو
آپ کی کراری آواز، رنگینیٔ بیان اور شوکتِ الفاظ کے شامل کر ایک خاص کیفیت
پیدا کر دیتی۔

کسی شاعر کے کلام کے محاسن کو سمجھنے کے لئے اُس کے کلام کا غائر مطالعہ
کرنا ضروری ہے۔ جن حضرات کو برقؔ مرحوم سے عقیدت ہے اور جو اربابِ ذوق
اُن کی شاعرانہ عظمت کے قائل ہیں، اُن کا فرض ہے کہ اس بات کی کوشش
کریں کہ اُردو نواز پبلک جس کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے آپ کے کلام سے
بیش از بیش مستفید ہو سکے۔ یہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے شاعر کا کلام
وہ مقبولیت حاصل کرتا ہے جس کا وہ [illegible] حقیقی معنوں میں مستحق

میں آج برق مرحوم کے کلام پر تقریر کرنے حاضر نہیں ہوا ہوں۔ مجھے آپ سے ایک اپیل کرنی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سب اس بارے میں ضرور متفق ہوں گے کہ برق مرحوم کا بقیہ کلام جلد از جلد شائع کیا جائے۔ اس کی صرف ایک صورت ہو سکتی ہے۔ ایک فنڈ قائم کر دیا جائے جس کا مقصد مرحوم کے دیوان اور مجموعۂ نظم کی اشاعت ہو۔ ہر صاحبِ استطاعت اپنے مقدور بھر اس فنڈ میں چندہ دے۔ اگر قوم کے متموّل طبقہ کی نظرِ عنایت شاملِ حال ہو تو یہ کام ناممکن نہیں ہے۔ مل کر دنیا کا ہر کام ہوتا ہے۔ طالب صاحب بھی ہر سال یومِ برق پر کچھ نہ کچھ خرچ کرتے ہیں۔ کاش کہ یہ روپیہ کلامِ برق کی طباعت اور اشاعت پر صرف ہوتا۔ اب ہر سال مرحوم کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اس جلسہ کے انعقاد کی صورت ہوتی ہے۔ یہ مطبوعہ کلام بجائے خود ایک مستقل یادگار ہوتا۔

یہاں ایک اور امر کی طرف اشارہ کروں گا۔ ایک سبھا قائم کی گئی ہے جس کا نام "کائستھ اُردو سبھا" ہے۔ یہ سبھا میرے برادرِ بزرگ پروفیسر منموہن لال صاحب کی تحریک سے عمل میں آئی۔ امرتسر میں اس کا ہیڈ آفس ہے۔ اربابِ ذوق کی مالی امداد نے اس بیل کو پروان چڑھایا۔ اس سبھا کا مقصد کائستھ برادری کے اُن بلند پایہ شعرا کا کلام جزوی یا کلی صورت میں شائع کرنا ہے جو اب تک قعرِ گمنامی میں پڑا ہوا تھا لیکن زمانہ کی دستبرد سے محفوظ تھا۔ سبھا کی مطبوعات درج ذیل ہیں:-

۱۔ نغمۂ قیصر۔ منشی گوری شنکر صاحب قیصر کے نغمات کا مجموعہ

۲۔ کلام مشتاق۔ اس میں منشی بہاری لال صاحب مشتاق کی پہیلیاں، غزلیں، نظمیں اور دیگر متفرق کلام شامل ہے۔

۳۔ کلام رونق۔ ممتاز الشعرا منشی پیارے لال رونق کی غیر مطبوعہ نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔

۴۔ کلام عاصی۔ منشی گھنشام لال صاحب عاصی کی کلیات۔

آپ شاہ نصیر کے مایۂ ناز شاگرد اور خاقانی ہند استاد ذوق کے ہمعصر تھے۔
اس سبھا کو کایستھوں کے علاوہ دیگر اردو نواز حضرات کی سرپرستی کا بھی فخر حاصل ہے
برق کے کلام کی خصوصیات، شوکت الفاظ، رنگینی بیان اور بلندی تخیل ہے۔
جو زبان ذوق نے قصائد میں استعمال کی ہے، وہ آپ نے نظموں اور غزلوں میں برتی ہے
غالب کی طرح آپ کی طبیعت بھی مشکل پسند واقع ہوئی تھی۔ کسی مضمون کو سادگی کے ساتھ ادا کرنا آپ کو مرغوب نہ تھا۔ بسنت رت کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

کھلے ہیں ٹیسو کے پھول بن میں، ضیا فگن ہے شفق زمیں پر
چنے ہیں قدرت نے سبز شاخوں پہ شیشہ ہائے شراب احمر
جب ان پہ پڑتی ہے ہلکی ہلکی شعاع سیمین ماہ انور
مرقع شان دلفریبی دکھاتا ہے جاں فسوز منظر

لگائے صحرا کو لعل اس نے جو وجہ زیبائش چمن ہے
نہال فطرت کے فیض سے ہے زمین گلزار ہر کہ بن ہے

ہماری زبان میں نیچرل شاعری کے بہترین نمونے انیس اور دبیر کے مرثیوں میں ملتے ہیں۔ یہ دونوں شاعر علیحدہ علیحدہ طبیعت اور طرز کے مالک تھے۔ انیس کا کلام فصاحت اور سادگی کے لئے مشہور ہے۔ دبیر کے کلام کا طرۂ امتیاز رنگینی اور بلاغت ہے۔ برق کے کلام میں یہ اربعۂ عناصر اعتدال کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ نسیم صبح کی اٹکھیلیاں ملاحظہ ہوں:-

تو چمن میں آئی عشق گل کا دم بھرتی ہوئی
چھاؤں میں تاروں کی گن گن کر قدم دھرتی ہوئی
پہلے آہستہ چلی اٹکھیلیاں کرتی ہوئی
پھر وہی برتیں ادائیں روز کی برتی ہوئی
گل کو چھیڑا، طرۂ سنبل پریشاں کر دیا
غنچۂ نوخیز کا صد چاک داماں کر دیا

کرمک شب تاب کا انداز پرواز ملاحظہ ہو:-

چشمک برق کا یقیں تو تم تو نہیں | غنچۂ نیم شگفتہ کا تبسم تو نہیں
برق رخسار کا یا جلوۂ بیتاب کہوں | اس کو اڑتا ہوا اک قطرۂ سیماب کہوں
کسی ناشاد کی آہوں کا شرارا تو نہیں | آسماں سے کوئی ٹوٹا ہوا تارا تو نہیں

محوِ پرواز یہ لعلِ یمنی ہے شاید
اڑتی پھرتی کوئی ہیرے کی کنی ہے شاید
آتشِ حسن کی اڑتی ہوئی چنگاری ہے
شبِ تاریک میں جو محوِ ضیاباری ہے
جلوۂ حسن ترا پردے سے مانوس نہیں
تجھ سے وہ شمع جو شرمندۂ فانوس نہیں
تیرے جلوہ سے منور ہوا صحنِ گلشن
تو ہے وہ شمع جو ہے موجِ ہوا پر روشن

شاعری محض مناظرِ قدرت کی نقاشی نہیں۔ شاعر محض البم Album نہیں بناتا۔ وہ ایک نئی دنیا تعمیر کرتا ہے جس میں جیتے جاگتے انسان چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ شاعر جذبات کے ذریعہ کاغذی پیکروں میں زندگی پھونکتا ہے۔ برق کا کلام جذبات سے لبریز ہے۔

نالۂ بیوہ کی شرر باری دیکھئے :-

ہجر میں ہوتا ہے تکیہ آرزوئے دید پر
صبر آئے مجھ سی قسمت کو کس امید پر
غم دامنگیر ہے دل بھر کے رو سکتی نہیں
آنسوؤں سے اپنے دل کے داغ دھو سکتی نہیں
شمع سوزاں ایک شب ہے تیرے جلنے کے لئے
اور میں آٹھوں پہر غم سے پگھلنے کے لئے
مشغلہ کوئی نہیں دل کے بہلنے کے لئے
رات دن ہوں میں کفِ افسوس ملنے کے لئے

سوز اک تازہ ستم ہے خاطر ناشاد پر
تل رہا ہے آسمان فتنہ گر بیداد پر

"اچھوتوں سے نفرت فضول ہے" کے زیر عنوان فرماتے ہیں

مثل حباب کب ہر لازم ہوا ہیں بھرنا — بحر جہاں میں سب کو اک گھاٹ ہو اترنا
زیبا نہیں کسی سے بے جا سلوک کرنا — منھ سے اچھوت کہنا، نفرت سے نام دھرنا

تذلیل دوسروں کی تحقیر ہے خود اپنی
اپنوں کو غیر کہنا تشہیر ہے خود اپنی
اس خاک کے ہیں پتلے بھارت سپوت ہیں سب
گر یہ اچھوت ہیں تو ہم بھی اچھوت ہیں سب

یتیموں کی فریاد کا ایک دردانگیز شعر دیکھئے

غربت نصیب ہیں ہم خود اپنے ہی وطن میں — جل جائیں شاخ پر جو وہ پھول ہیں چمن میں

فلسفیانہ رنگ کی جھلک 'فلسفۂ گیتا' میں ملاحظہ ہو:۔

ناداں کیلئے مایۂ آفات ہے دنیا — دانا کیلئے جلوہ گہہ ذات ہے دنیا
نیرنگ نظر عکس خیالات ہے دنیا — کچھ بھی نہیں اور دار مکافات ہے دنیا
دیکھ اس کے تماشوں کو تو شاہد کی نظر سے — ہوش اپنے نہ کھو خواب پریشاں کے اثر سے

غرضکہ قدرے تصوف کے ساتھ سے

ہر رنگ کی شراب پیالے میں ہے ترے

جنابِ برقؔ اور میرے جذباتِ عقیدت

(بلبلِ ہزار داستاں جناب محمد احسن صاحب آسمان دہلوی)

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کیلئے

آہ! وہ دلّی وہ دلّی نہیں رہی۔ دلّی والے چل بسے۔ اُن کی جگہ غیروں نے لے لی۔ شہر پر قبضہ، زبان پر تصرّف۔ زمانے نے وفا نہ کی، آسمان نے دیدے پھیر لئے۔ اُردو کی مدوّنہ جن گودوں میں پلی بڑھی اب نہ وہ گود رہے نہ گود والے۔ آسمان نے دنیا کی دار و گیر کے لئے چکر کھایا، بساطِ دنیا پر ایک نیا دَور آیا، سلطنت مٹی، مٹنی تھی۔ دولت حشمت نہ سہی بلا سے کِس کے پاس سدا رہی ہے جو یہاں رہتی۔ ستم تو یہ ہے کہ دلّی کا تمدن، دلّی کی زبان، یہاں کی پوشش، یہاں کا رکھ رکھاؤ، اب کسی کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ سیکڑوں عیب نکالے اور ہزاروں کیڑے ڈالے جاتے ہیں۔ رہے سہے اگلے زمانے کے جو لوگ باقی ہیں، ٹکُر ٹکُر دیدم دم نہ کشیدم۔ دیکھتے ہیں اور چُپ ہیں۔ اللہ، اللہ وہ دن بھی تھے کہ دلّی والے زبان والے کہلاتے تھے۔ اور یہ دن بھی دیکھنے مقدر میں تھے۔ بھانت بھانت کی بولیاں کانوں میں پڑتی ہیں۔ مگر کمبخت اس دل کو کیا کریں۔ وہ چاشنی، وہ مزہ، وہ لذت، وہ حلاوت، پھڑکتی ہوئی ترکیبیں۔ مچلا دینے والی تشبیہیں مُنہ سے

بے ساختہ نکلے ہوئے تھے ناز و نیاز کی گفتگو، قلعہ معلیٰ کی اُردو، سب سے نیا رنگ، سب سے جُدا ڈھنگ۔ انوکھی ادا، نرالی شان، نہیں دیکھتا اور نہیں پاتا۔ ورد ہوتا ہے مگر اُف تک نہیں کرتا سینے میں دل مچلتا ہے، کچھ کہنا چاہتا ہے، موقعہ اور محل نہیں دم بخود ہے۔ مجھے جناب برقؔ سے محبتِ عقیدت کیوں نہ ہو۔ برقؔ دلی والے تھے۔ بزرگوں کی یادگار، اُن کے نقشِ قدم پر چلنے والے، اُن کے نام لیوا، اُن کی آن اور اُن کی شان کو قائم و برقرار رکھنے والے ہیں کیا، ہر دلی والے کا دل اُن کی محبت سے لبریز ہو۔ اور جذباتِ عقیدت سے معمور۔

دل کی گہرائیوں میں جذبات پیدا ہوتے ہیں، اُن کے ظاہر کرنے کے لئے خدا نے زبان دی۔ زبان کی زینت کلام ہے اور کلام کا حُسن اشعار۔ جیسے ہر عورت جاذبِ فطرت، عورتوں میں دُلہن۔ دُلہنوں میں چوتھی کی دُلہن، دیکھنے دکھانے کے لائق مشہور و مقبولِ خلائق ہوتی ہے، اسی طرح کلام زبانِ شعر میں منظورِ گوشِ ہر ذی ہوش کے لئے ہے۔ اگر زبان میں چاشنی ہے تو صرف گوش نواز ہی نہیں۔ سحر ہے، جادو ہے۔ مست و بیخود بنا دیتا ہے۔ جناب برقؔ کے کلام میں دلی کی ستھری اور پاکیزہ اُردو کے برجستہ محاورات کی بہتات ہے۔ اُردو کتابوں کی مروّجہ اُردو نہیں بلکہ وہ اُردو جو دلی میں دلی والوں کے گھروں میں عورتیں روزمرہ بولا کرتی تھیں اور اب بھی کہیں کہیں بولتی ہیں۔ جناب برقؔ کے بزرگ ددھیال میں بھی اور ننھیال میں بھی بہت بلند پایہ اور گراں مایہ ادیب و شاعر تھے۔ شاعر کے بیٹے،

شاعر کے نواسے، شاعروں میں پرورش پائی، شاعروں کی گود میں کھیلے، شاعری خانہ زاد تھی، بقول شخصے کہ شاعری گھٹی میں پڑی تھی۔ ہر شاعر کامیاب شاعر نہیں ہوتا۔ شاعری کا تعلق اکتساب سے ضرور ہے لیکن اس کی اصل وہب الہیہ ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست　　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جناب برقؔ فطری اور وہبی شاعر تھے۔ موزونیت۔ جدت۔ بلند پروازی خداداد تھی۔ خیالات کا بے پناہ تموج جو وراثتاً اُن کو حصے میں ملا تھا، اُن کی زبان پہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بن کر اُبل پڑا۔ بندش کی صفائی۔ برجستہ الفاظ کی موزونیت دل موہ لینے والی تشبیہات، کنایہ اور استعارات، قلعہ معلی کی روزمرہ میں پھڑکا دینے والے محاورات، سونے پر سہاگا بن کر چمکے۔ کلام کا ہر شعر شعر کا ہر مصرعہ، مصرعہ کا ہر لفظ، چٹکیاں لیتا ہوا نکلا۔ اہل نظر اور صاحب ذوق سے پوشیدہ نہیں کہ محض الفاظ کا مجموعہ تصنّع اور بناوٹ کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہتا۔ جناب برقؔ کا کلام اِن حوائش اور زوائد کی بھرمار سے پاک اور صاف ہے۔ مجھے دنیا سے غرض نہیں میں تو مسرور و مسحور ہو جاتا ہوں۔ میرا دل سینے میں ٹھمکتا اور مزے لیتا ہے۔ دلّی کی ٹکسالی زبان۔ روزمرّہ کے محاورات میں بات چیت غزل کی جان ہیں۔ کسی کو ہوں نہ ہوں مجھے تو یہ شعر بہت پسند ہیں۔

....

نقاب اُلٹی صبا نے سامنے میرے تو فرمایا
کہ اب تو ہر طرح تیری "بن آئی" دیکھنے والے

'بن آنا' اور 'بن جانا' مغائر معنے رکھتے ہیں۔ دلّی کی ٹکسالی اُردو ہے۔

ہمارے خون کی مہندی لگا لو دستِ خنجر میں
قسم ہے 'ایک ہو گے' 'تم ہی تم' نکلو گے محشر میں

'ایک ہونا'، 'تم ہی تم'۔ ثانی کے معنے ہیں ...... دلّی کی زبان ہے۔

کرے عرضِ تمنّا خاک کوئی اُس ستمگر سے
'زباں کٹتی' ہے اب تو بات پر خنجر نکلتے ہیں

'زبان کٹنا'۔ خاک بندش اور بے فائدہ کے معنی میں محاورہ ہے۔

سوا ہے فتنۂ محشر سے بھی طولِ امل اُن کا
ترے گیسو ترے قامت سے بھی گز بھر 'نکلتے' ہیں

'نکلنا' زیادہ کے معنی میں۔ دلّی کی زبان ہے۔

کسی کے سامنے دستِ طلب کیوں برقؔ پھیلائیں
سوا ہیں 'خوانِ نعمت' سے، ہمیں توقیر کے ٹکڑے

'خوانِ نعمت' سے سوا، بڑھ کر کے معنی ہیں 'توقیر کے ٹکڑے' یعنی عزت کی روٹی۔ دلّی کی زبان ہے۔

دفن ہیں زیرِ زمیں 'چاند سے ٹکڑے' کیا کیا
ناز ہے گنبدِ گردوں کو عبث تاروں پر

'چاند کے ٹکڑے'۔ گردوں اور تاروں کے تلازمے پر ڈولتا ہوا شعر ہے۔

ہمارے بزرگ مشکل زمینوں اور مشکل ترکیبوں کے ساتھ غزل کے محدود دائرے میں خیالات کی وسعت کو ظاہر کیا کرتے تھے۔ جناب برقؔ اُنہی کے نام لیوا اور اُنہی کی یادگار ہیں۔ اُن پابندیوں کے ساتھ طبع آزمائی کی۔ اہلِ ذوق مزہ لیں۔

پھر کچھ خراشِ ناخنِ غم نے کھلائے گُل
پھر ہو گئی ہری مرے زخمِ کہن کی شاخ

بوٹے سے قد پہ اُن کے نمودِ شباب ہے
اب کے پہلی بہار میں سروِ کہن کی شاخ

ہے انکی سادگی میں قیامت کی سادگی　　　　ہے ادا ادا سے ہے اک بانکپن کی شاخ

گلشن میں گُل کھلاتے ہیں فیضِ بہار نے

پھولوں میں تُل رہی ہے اب اک اک چمن کی شاخ

سچ کہنے میں باک کیا۔ ہم بھی پہلوں پر سبقت لے گئے یا نہیں؟ آنے والے زمانے میں پیدا ہونے والی پود ترقی کر جائے تو عجب کیا۔ آنکھوں سُکھ کلیجے ٹھنڈک۔ عرب اور ایران کے شاعروں کی تقلید ہمارے بزرگوں نے کی کیوں نہ کرتے؟ یہ لوگ اُس زمانے کے ترقی یافتہ تھے۔ اب زمانہ اور بڑھا مغرب والے اُٹھے، زمانے نے ساتھ دیا۔ نصیبے کی یاوری، مغرب، مشرق پر چھا گیا۔ سلطنت، دولت، حکومت اب اُن کے حصے میں آئی۔ اُن کا طوطی بولنے لگا وہ بادشاہ ہوئے ہم رعیت بنے۔ وہ آزاد کہلائے اور ہم غلام۔ خدا کی دین، اِسمیں کسی کا کیا اجارہ؟ حکومت کے ساتھ عقل و دماغ آسمان پر پہنچے اور وہ تارے توڑ کر لائے کہ دنیا حیران رہ گئی۔ علم بڑھا، ایجادات ہوئیں۔ زمین نے خزانے اُگل دئے۔ آسمان نے نعمتوں کا مینھ برسایا۔ خدا کی شان، مغرب والے مشرق والوں کے منہ آنے لگے۔ مشرقی تمدن و معیشت، نشست و برخاست نظروں سے گر گئے۔ جسکو پیا چاہے وہی سہاگن کہلائے۔ عشق و نیاز کی گفتگو بُری ٹھیری۔ غزل کا دائرہ تنگ سمجھا جانے لگا۔ مشرقی محبوب نظر کا چھپا نہ جلے مرد نہ جائے عورت یا اپنی اپنی جگہ۔ اظہارِ محبت کے سلئے جو جا ہو سمجھ لو۔ دلّی اُجڑی شاعری

بکمشتی یعنی سول بکمشتی نے بنافسی چوٹی اور انگیا کے استعمال سے نسائیت کے ساتھ محبوب نما تعین کیا۔ مغربی تہذیب دلوں میں جگہ پکڑ چکی تھی۔ اثر پذیر طبائع نے قہقہا لگایا اور فرمایا محبوب کس کو ٹھیراتے ہو کس سے محبت کا اظہار کرتے ہو؟ مجنوں سے اظہار عشق کی قید ترقی کے راستے میں روک ہے۔ ہم حیران و پریشان الٰہی ہم جنس سے نہیں تو کس سے عشق کریں؟ جواب ملا۔ کتے سے، طوطے سے، مینا سے، چڑیا سے، جنگل سے، بیابان سے، وادی سے، پہاڑ سے، ندی کے چشمے سے۔ مغرب کے عاشقوں کو دیکھا ڈاڑھی مونچھ دونوں غائب۔ عاشق و معشوق کی تمیز گم۔ سبزہ آغازی کا قصہ ہی ختم۔ غدار کے ہمارے ہاں کے نوجوانوں نے پلٹا کھایا۔ طبیعتوں کو گرمایا۔ داڑھی مونچھ منڈا عاشقوں کے زمرے میں جا براجے اور کہنے لگے "غزل کی وسعت کم ہے"۔ ان نقاروں سے مشرقی شاعروں کے رہے سہے ہوش و حواس گم ہوئے ہکا بکا ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور لگے سرگوشیاں کرنے۔ ایک دوسرے سے کہتا تھا ارے بھئی معشوق ایک ہو تو غزل کافی۔ جب معشوق کئی ہو گئے تو غزل بیچاری کب تک کفایت کرے۔ میں کہوں گا، ایمان نگلا نہیں جاتا۔ بات کی تہہ کہاں تک کی جائے۔ حقیقت سے انکار کیونکر ہو۔ اللہ پاک نے انسان کے دماغ کی ساخت ہی ایسی بنائی ہے کہ عافیت کی گھڑیوں میں نت نئی ایجاد کرتا ہے آج کچھ ہے تو کل کچھ اور یہی ارتقائی منازل ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان غاروں میں زندگی بسر کرتا۔ یہ عیش، یہ آرام کے سامان کیونکر میسر آتے۔ ریل، تار برقی

ہوائی جہاز۔ ریڈیو۔ غرض ہر قسم کی ترقی نے انسانی تمدن کو بدل دیا ہے۔ زمانہ قیامت کی چال چلا۔ پہلے لوگ تو قبروں میں جا سوئے۔ آنے والی نسلیں گودوں سے نکل کر کہیں سے کہیں جا پہنچیں۔ زبان ترقی کیوں نہ کرتی۔ مغربی اور مشرقی آپس میں ملے جلے۔ سلسلۂ ربط و اختلاط قائم ہوا۔ معلومات میں وسعت ہوئی۔ دوسری قوموں کے حسنِ بیان اور اسلوبِ کلام کا اثر اردو پر بھی ہوا۔ ہونا لازمی تھا۔ اس پھیلاؤ کے مقابلے پر غزل کی زمین واقعی تنگ تھی۔ شہنشاہِ سخن حضرت غالب نے اس کا اقرار سب سے پہلے کیا ہے

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز۔ زمانہ کا مقابلہ شعارِ فرزانگی نہیں۔ مولانا آزاد اور مولانا حالی کی دُور رس نگاہیں بھانپ گئیں۔ سب سے پہلے اُنھوں نے ہی مقتضائے زمانہ کے راز کو سمجھا۔ اب شاعری میں نئے نئے خانے قائم کر کے ہندوستان والوں کو اُبھارا۔ نئی زمین میں نئے عنوانات کے ساتھ جولانیاں دکھانے کی ترغیب دلائی۔ ملک کے ہر گوشے سے نوجوان نکلے۔ اقبال پیش پیش تھے اور پیش پیش رہے۔ پھر شوق قدوائی۔ نظم طباطبائی۔ شاد۔ محروم۔ تمکین۔ جوش۔ اصغر۔ چکبست، سرور، عزیز، آسمانِ شاعری پر درخشاں ستارے بن کر چمکے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کی روشنی ہے۔ شاہجہاں آباد ہندوستان کے دل، دلّی سے جنابِ برق کی۔

واحد شخصیت ہے جنھوں نے اس میدان میں قدم بڑھایا۔ تخیل کی غیر محدود وسعت میں طبقات الارض۔ اجسام فلکیہ۔ فضا اور خلا۔ عناصر اربعہ متعلق فلسفہ کے لاینحل مسائل۔ ذرّہ کی حالتِ اولین۔ جزو لایتجزیٰ۔ اسلاف و قدماء کے جانبازی و شجاعت کے کارنامے اخلاقیات۔ تمدن معاشیت، سائنس، حکمت، مذہب ان سب کو جگہ دی۔ ہر مقام پر پہنچے، ہر میدان میں توسنِ طبع کو دوڑایا۔ جرأت و جسارت سے بڑھے۔ کامیاب گئے اور کامیاب لوٹے۔ قبولیت کا تاج پہنا۔ شہرت کے آسمان پر مہتابِ عالمتاب بن کر چمکے۔ ایشیائی مبالغہ نہیں یہ حقیقت ہے کہ جنابِ برق کو بندشِ الفاظ، جدّت طرازی۔ جذبات نگاری، سرعتِ انتقال ذہانت۔ زبان پر قدرت موہبت کے رنگ میں خداداد عطیہ تھیں میں مختلف نظموں میں سے جستہ جستہ بند پڑھتا ہوں جس سے اہلِ ذوق، شوکتِ الفاظ، سلاست، روانی اور زبان کی چاشنی کا مزہ لیں گے ؎

گھر آیا ابرِ فلک جو ابرِ قطرہ بار ہے   خزاں پہ اوس پڑ گئی چمن چمن بہار ہے
گلوں کے روئے صاف پر کمال کا نکھار ہے   ورق ورق پہ خوشنما نظر نظر شکار ہے
جمی تھی برگ برگ پر جو گرد اب وہ دھل گئی
کلی کلی نکھر گئی، گرہ دلوں کی کھل گئی

گرمی کی شدت اور آفتاب کی تمازت کے مسلسل اثرات سے بے چین و مضطرب دل کے جذبات برسات کے آغاز میں ان سے بہتر کیا ادا ہو سکتے ہیں انتخابِ الفاظ

ملاحظہ ہو۔ بندش و ترکیب میں شوکت ہے۔ اس پر طرہ ٹکسالی اردو ہے۔ چمن چمن۔ ورق ورق۔ گلی گلی۔ نظر نظر کی تکرار نے اثرِ عالمگیر کو اس رنگ میں ظاہر کیا ہے کہ استثناء کا خیال تک نہیں آتا۔

ہوا کی جنبشوں سے گل برس رہے ہیں پے بہ پے
شگوفہ ریز ہیں شجر کہ ڈھل رہے ہیں جامِ مے
سُرور خیز کس قدر چمن کی ہے ہر ایک شے
ترانہ ہے ہزار ہے مجلِ کُن نوائے نے
چٹک میں غنچے کی اثر صدائے جانفزا کا ہے
تبسمِ لطیف میں یہ شائبہ حیا کا ہے

تشبیہات میں کمال دکھایا ہے عالمِ خیال میں چمن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے ایسا کھینچکر رکھدیا ہے جیسے کہ ہم خود گلستاں میں بیٹھے ہوئے ان نظاروں سے لُطف اندوز ہو رہے ہوں غنچے کے چٹکنے کی صدا سے مسیحی نفس یا قُم باذنِ اللہ کا خیال تشبیہ کے سطحی پہلو پر اچٹتی نظر سے دیکھنا مسرت انگیز ہے۔ غوامض پر فکر کی نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا تخیل بہت بلند ہے۔ عرش پر پہنچ گیا کلامِ الٰہی سے مملو ہوا انما من حق کما ذہن کیف تحی الارض بعد موتہا کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں گریہ کا پیارا انداز سراہنے کے قابل ہے۔ سب سے آگے لعزا تبسمِ لطیف میں حیا کی جھلک اہلِ ذوق کے لئے مسرتوں کا خوانِ یغما ہے۔ پروازِ تخیل

باید وشاید۔

مغرب کے اختلاط اور ارتباط کا نتیجہ علم ادب میں تبادلۂ خیالات سے ہوا۔ معلومات میں وسعت اور خیالات میں نیرنگی آئی۔ شاعر کا منصب، شاعر کے فرائض، ملک و قوم کا تعلق، آیندہ نسل کے میدانِ عمل۔ یہ مسائل زیرِ غور ہوئے۔

جناب برق نے شاعر کے عنوان سے خیالات کا اظہار کیا ہے

آشنا رنگِ تبدل سے ہی یہ فلسفہ داں — اسکی نظروں میں ہی نیرنگ گلستانِ جہاں
خندۂ گل پہ ہے شبنم کی روش اشک فشاں — بے ثباتی کا مرقع ہی اسے برگِ خزاں

پھول مرجھائے تو یہ شعلہ بجاں ہوتا ہی
رازِ تخلیق و فنا صاف عیاں ہوتا ہی

جذبۂ حبِ وطن سے ہے سراپا لبریز — بر ربطِ دل سے نکلتی ہے صدا درد انگیز
جوش میں آکے جو پڑھتا ہی رجز ولولہ خیز — رن میں یہ آگ لگا دیتا ہی ہنگامِ ستیز

خاک اُفتادوں کو پیغامِ عمل دیتا ہے
آن میں قوم کی تقدیر بدل دیتا ہے

حسن و عشق، زلف و گیسو کے تنگ دائرے میں اپنی نازک خیالیوں سے شیشے سے پتھر کو توڑ دینے والا شاعر قومی میدان میں ایسا قادر الکلام ثابت ہو رہا ہے کہ بے اختیار دل سے صدائے تحسین نکلتی ہے۔ شیلے، گرے، شیکسپیر اور ٹنی سن کے کلام نے اگر یورپ کی کایا کو پلٹ دیا تو اسکی وجہ یہ بھی تھی کہ ملی تناسب کے بڑھ جانیکی وجہ سے

نوجوانوں میں صلاحیت پیدا ہو چکی تھی۔ ہندوستان علمی تناسب کے لحاظ سے آزاد ممالک کے مقابلے میں ابھی بہت پیچھے ہے۔ آج نہیں تو کل جب ہندوستان اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوگا تو اس زمانے کے نونہال اپنے قومی شعرا کے مداح ہوں گے اور میں اس رائے کے ظاہر کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتا کہ جناب برق اس قبیل کے شعرا کی صف اوّل میں شمار ہوں گے۔

میں اور جناب برق ایک ہی دفتر میں ملازم رہے۔ وہ سب اکاونٹ سروس کا امتحان پاس کرکے سپرانٹینڈنٹ ہو گئے تھے۔ میرا اُن کا تعلق ماتحتی اور افسری کا تھا۔ اُن کے تبحّرِ علمی سے فیضیاب ہونے کے اکثر مواقع بلاوقت مجھکو میسّر ہوتے رہتے تھے۔ مذہبی گفتگو بھی ہوتی رہتی تھی۔ آریہ سماج مذہبی مناظروں میں پیش پیش تھا۔ میرا مذہبی شغف جنون کی حالت تک پہنچا ہوا تھا۔ سماج میں میرے سیکڑوں مناظرے ہوئے۔ مناظرہ سننے کے لئے وہ بھی اکثر شریک ہوتے تھے۔ دَور تسلسل اور حدوث روح مادّہ ایسے مسائل زیرِ بحث رہتے۔ میرا خیال ہے کہ ذیل کا بند انہی مناظرات کے سننے کا نتیجہ ہے۔

جلوہ گاہ شش جہت کی علّت غائی ہے کون؟

پردے پردے میں یہ دھوکا کارفرمائی ہے کون؟

فلسفہ کہتا ہے نیچر کا ہے یہ سارا ظہور
عقل کہتی ہے کہ خلاقِ دو عالم ہے ضرور
نقش بندِ بزمِ امکاں ذات برحق ہے کوئی
برتراز وہم و گماں ہستیٔ مطلق ہے کوئی

ہر شاعر کو حسن کلام کا بہرہ ودیعت الٰہیہ ہے۔ اس سے استفادہ حاصل کرنا زندہ قوموں کا طرۂ امتیاز۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب کے شعرا حسن کلام کی برکت سے جانباز بہادروں کو گرمانے کے لئے رجز پڑھتے تھے۔ ہنگامۂ کارزار دنوں بلکہ مہینوں کھنچ جاتا تھا۔ اہلِ مغرب نے امن کی گھڑیوں میں شیکسپیر اور ٹینی سن پیدا کئے جنہوں نے اس حسن کلام کی برکت سے نونہالوں کی طبیعتوں میں روشن خیالی۔ استقلال۔ اخلاقیات، ترقیات کی حقیقی تگ و دو کا جذبہ پیدا کیا۔ اربابِ علم تاریخ سے مخفی نہیں کہ مغربی اقوام میں جذباتِ ترقی کی علتِ اولیٰ وہاں کے شعرا کا کلام ہے۔ اے کاش ہمارے ملک کے شعرا قوم و ملک کی اس رنگ میں خدمت کو اپنا فرضِ اولین سمجھیں

جناب برقؔ اپنی فرض شناسی سے غافل نہیں۔ بسنت میں جہاں مناظر قدرت اور موسمی تغیرات کے اثرات سے شجر و حجر اور کل کائنات میں نمو کی کیفیت کو ظاہر کر کے کمزور اور کمھلائی ہوئی طبیعتوں میں مسرت کے جذبات پیدا کرتے ہیں،

دیں بھارت کے نوجوانوں کو ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے لئے مخاطب فرماتے ہیں

خوابِ گراں سے جاگو بھارت کے نونہالو — ہیں تازہ دم تجرِ تیکہ ہوش اپنے تم سنبھالو
مُردہ دلی کو چھوڑو، گھر سے قدم نکالو — قومیں جو بڑھ چلی ہیں رستے میں اُنکو جالو

منزل پہ سب سے پہلے پہنچے قدم تمہارا
مقصود سامنے ہے، ٹوٹے نہ دم تمہارا

فیلقوس نے سکندر کی غیر معمولی جرأت وجسارت کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ مقدونیہ کی چھوٹی سی ریاست اس اولوالعزم شہزادہ کے لیے کافی نہیں۔ اسی طرح جنابِ برقؔ کی غزل کے محدود چشمے میں پیراکی کے ابتدائی ہاتھ دیکھ کر بھانپنے والے بھانپ گئے تھے کہ یہ نوجوان آگے چل کر بحرِ محیط کا شناور بننے والا ہے لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ فی الواقعی جنابِ برقؔ کی موت بھارت دیش کے نوجوانوں کے لئے صدمۂ عظیم ہے۔

کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جب تک اخلاق کے فلسفے سے آشنا نہ ہو۔ جو قوم اخلاق کے لحاظ سے پست ہے وہ حقیقتاً مُردہ کہلانے کی مستحق ہے۔ قوموں کا عروج وزوال، اخلاقیات کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔ اخلاق کیا ہے؟ اس کی تعریف میں سلف نے بہت بڑے بڑے مقالے لکھے ہیں مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ قدرت کی ودیعت کردہ خواہشوں اور قوّتوں کا برمحل استعمال کرنا

اخلاق ہیں۔ رحم، غصہ، شجاعت و ایثار، ہمدردی، مساوات فطری جذبات ہیں۔ ملک اور قوم کے نوجوانوں میں اُن کی صحیح تربیت بالفاظِ دیگر جادۂ ترقی پر گامزن ہونے کے مترادف ہے۔ ہندوستان کی مختلف اقوام میں آزاد ممالک کی طرح جذباتِ ترقی کا پیدا ہونا اقتضائے فطرت ہے۔ افرادِ مختلف الخیال مذہب میں اختلاطِ مساوات و ارتباطِ یگانگتِ حصولِ مقصد کے لئے ارباب عقل کے نزدیک جزوِ لازم ہے۔ ملک کی اقوامِ مختلفہ میں ایک دوسرے سے نفرت کا جذبہ اتحادِ حقیقی کے منافی ہے اور اتحاد بامِ ترقی کا پہلا زینہ ہے۔ تاریخ اقوام پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے، میں مسلمانوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ نسلی امتیاز کے قطعاً خلاف ہیں کیونکہ ان کی اصولی تعلیم یہ ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقکم اے مسلمانو تم میں افضل وہی ہے جس کے اعمال اچھے ہیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ جو حضرت رسالت مآب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد تختِ خلافت پر بیٹھے تو تمام اکابرینِ مکہ اور شرفائے قریش نے اُن کے ہاتھ پر بیعتِ اطاعت کی۔ ابو قحافہؓ ان کے والد اُس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ وہ یہ سُن کر رو دیئے کہ اُن کے بیٹے کے ہاتھ پر عرب کے تمام قبائل نے اطاعت کرنے اور اپنا سردار ماننے کا اقرار کیا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب آزاد غلام کے مسئلہ کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ بلال یک حبشی غلام تھے۔ حضرت عمرؓ دوسرے

خلیفہ ہیں۔ ان کو قیصر و کسریٰ کی معلومہ دنیا کی سب سے زبردست طاقتوں کے فاتح ہونے کی حیثیت حاصل تھی۔ باوجود اس ہیبت اور سطوت کے بھرے دربار میں حضرت بلال کو اپنا سردار کہہ کر پکارتے ہیں۔ ماحصل مدعا آزاد اور غلام میں حقیقی اتحاد ہو گیا تھا پھر دیکھو تو اسوقت کی معلومہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں مسلمان نہ پہنچے ہوں اور کوئی کڑی سے کڑی قوم ایسی نہ تھی جس سے اُنھوں نے ٹکر نہ لی ہو اور اسکو اپنا مطیع و منقاد نہ بنا لیا ہو۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہندوستان کی اقوام مختلفہ میں ایسا اتحاد قائم ہو جائے۔ جناب برقؔ کی وسعت نظری سے یہ مضامین باہر نہ تھے۔ چنانچہ اچھوت اقوام کی حمایت میں وہ رقم طراز ہیں :-

قبل حباب کب ہے لازم ہوا میں بھرنا | پھر جہاں میں سب کو اک گھاٹ ہے اترنا
زیبا نہیں کسی سے بے جا سلوک کرنا | منہ سے اچھوت کہنا نفرت سے نام دھرنا
تذلیل دوسروں کی تحقیر ہے خود اپنی | اپنوں کو غیر کہنا تشہیر ہے خود اپنی

جو ان کا مستقر ہے وہ ہے وطن ہمارا | ہے وجہ ناز ان کو ذکر کہن ہمارا
تہذیب ایک سی ہے یکساں چلن ہمارا | بیگانہ ان کو سمجھیں دیوانہ پن ہمارا
اس خاک کے ہیں پتلے بھارت سپوت ہیں سب | گر یہ اچھوت ہیں تو ہم بھی اچھوت ہیں سب

اُردو زبان کی تشکیل کی بنا تو حضرت امیر خسروؒ کے مقدس ہاتھوں سے قائم ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں زمانے نے کئی رُخ بدلے تحریکیں آئیں اور چلی گئیں۔ عربوں نے کچھ نقوشِ تمدن چھوڑے۔ پھر تاتاریوں نے ہندوستان سے رشتے جوڑے۔ اُن کی زبان، اُن کے خیالات کا اثر کم و بیش پڑتا ضرور تھا پراکرت۔ سنسکرت دیوناگری۔ بھاشا۔ عربی۔ فارسی۔ تامل۔ تلنگری۔ دکھنی زبانوں کے میل جول سے زبانِ اُردو کا قوام تیار رہا۔ کچھ اردو نے دیا کچھ ہندو نے دیا۔ ہندی کا کام چل پڑا۔ زمانے کی موافقت، بادشاہِ وقت کی حمایت، پھلنے پھولنے چڑھنے کے لئے سامان ملا۔ حکومت کی زبان فارسی تھی۔ ہندوستان کے علم و ادب سے اہلِ فارس نے استفادہ حاصل کیا۔ فارسی فضلاء اور شعرا کے کلام کو ہندی کویوں نے کبت اور دوہوں میں جذب کیا۔ بادشاہ وقت کے ایما پر سنسکرت کی کتابیں ترجمہ کی گئیں فیضی نے گیتا کا ترجمہ نظم میں کیا ہے بھگوان کرشن کا وہ پیارا اشلوک کہ جب جب دھرم کی نندا دنیا میں ظاہر ہونے لگتی ہے تو ہم دنیا کے شدھار کے لئے جنم لیتے ہیں اس شعر میں ظاہر کیا ہے

چو بنیادِ دیں سست گردد بسے … شما بیم خود را بشکلِ کسے

حاصلِ کلام دونوں قوموں کے تہذیبِ علم و ادب کے ملنے سے معلومات کا نیا باب مرتب ہوا اور یہی زبان اُردو کی تشکیل کا موجب تھا۔ ہماری زبان اُردو کو خود کئی ارتقائی دوروں سے گذرنا پڑا ہے جیسے کہ ہوتی۔ ہوتی کا

سالہا ہمیشہ سرسبز رہا۔ قدماء نے چمنستانِ اُردو کی بنا ڈالی تو بعد میں آنے والے ادیبوں نے اپنے بزرگوں کے لگائے ہوئے پودوں کو خونِ جگر سے سینچا۔ دوسری زبانوں کے محاورات، ضرب الامثال ترکیبیں، تشبیہیں صاف ستھری کر کے اسمیں داخل کیں۔ نئی نئی ترکیبیں، نئے نئے الفاظ وضع کئے۔ جیسے انگشتری میں نگینہ اُس کی زینت ہوتے ہوئے الگ نظر آتا ہے؛ اسی طرح ہمارے بزرگوں کے وضع کئے ہوئے محاورات کلام میں حسن و دلربائی پیدا کرتے ہیں مگر صاف جتلاتے ہیں کہ ہماری تخلیق کسی کی گراں مایہ کدو کاوشوں کی مرہونِ منت ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ میرے خسر کی پرورش رنگ محل میں سیتی بیگم کے ہاتھوں ہوئی جس کی وجہ سے قلعہ معلیٰ کی زبان کا کچھ رنگ، کچھ جھلک میری سسرال میں نظر آتی تھی۔ میری مرنے والی بیوی کی زبان سے بے ساختہ ایسے محاورات نکل جاتے تھے جنھیں سُن کر میں اکثر از خود رفتہ ہو جاتا تھا۔ ایک کام کسی ہاتھوں سے انجام پذیر ہونا تھا۔ مجھکو یاد ہے اور مرتے دم تک یاد رہیگا وہ بے ساختہ بول اُٹھیں "اُیا بیوی میں تم سے کہوں۔ تم علی سے کہو، علی نبی سے کہیں، نبی اللہ سے کہیں۔ تب جا کر میری مراد ملے" میں تڑپ گیا۔ اب نہیں کہا جا سکتا کہ فارسی میں یہ ضرب المثل کے طور پر داخل ہوا اور ہمارے بزرگوں نے جوں کا توں اپنی زبان میں داخل کر لیا ہو یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعد میں اُردو والوں نے ہی اس کو وضع کیا ہو۔ یہ قیاس بعید از عقل نہیں۔ تاریخ

بتاتی ہے کہ بیوی کی نیاز امیر کماری شہنشاہ جہانگیر کی ملکہ بیگم کی ایجاد ہے ۔ مقام غور ہے ہمارے پہلے بزرگوں نے اُردو کی شان کو قائم و برقرار رکھا تو کیا یہ ہمارا فریضہ نہیں کہ ہم ان روایاتِ قدیمہ کو ان کی اصلی شکل میں قائم رکھیں۔ زمانہ ترقی کرے گا۔ زبان بھی ترقی کرے گی۔ جیسے آجکل اُردو زبان انگریزی زبان کے اثر کو قبول کر رہی ہے۔ بہت سی گراں مایہ اور قابلِ قدر یورپ کے مصنفین کی کتابیں اُردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ ہمارے ہاں کے قابل نوجوان شاعروں نے انگریزی نظموں کا ترجمہ اُردو میں نظم کیا۔ جناب نظم طباطبائی نے انگریزی کی مشہور نظم Elegy کا ترجمہ کیا اور خوب کیا جناب برق نے والٹر سکاٹ کی نظم لیکمنز ہال کا ترجمہ اس شان سے کیا ہے کہ انگریزی شاعر کے کلام کی روح کو گویا اُردو نظم کے قالب میں داخل کر دیا ہے۔ نفسِ مضمون میں فرق نہیں آیا۔ اُردو کے حسن اور دلربائی کو قائم و برقرار رکھا۔ میں دو بند پیش کرتا ہوں۔ اہلِ علم اور ذوق اندازہ لگائیں کہ جناب برق اپنی قادر الکلامی کی برکت سے کس درجہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

I rose up with the Cheerful Morn,
No lark more blithe, No flower more gay;

تاروں کی چھاؤں اُٹھتی تھی نورِ سحر کے ساتھ
ہنستی ہنساتی خندۂ گلہائے تر کے ساتھ

And like the bird that haunts the thorn,
So merrily sung the live long day.

رہتی تھی محوِ نغمہ سرائی تمام دن
میں گلعذار بلبلِ خستہ جگر کے ساتھ

Cheerful Morn کا ترجمہ تاروں کی چھاؤں کرنا یہ جناب برقؔ کے اہلِ زبان ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ قریب قریب لفظی ترجمے کے ساتھ زبان اُردو کے محاورات کا شعروں میں استعمال کرنا جناب برقؔ کا ہی حصہ تھا۔

And you first to me made suit,
How fair I was you oft would say!
And proud of Conquest, pluck'd the fruit
Then left the blossom to decay.

جناب برق ترجمہ کرتے ہیں :-

کیوں حرفِ آرزو میرے کانوں میں ڈال کے
دکھلائے سبز باغ فریبِ جمال کے
میری بہارِ حسن کو وقفِ خزاں کیا
گلچیں عیش وصل کی مرادیں نکال کے

ترجمے کے ساتھ ساتھ زبانِ اردو کی اصلی شان کو قائم و برقرار رکھنے میں جناب برقؔ نے کمال کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

حرف آرزو۔ سبز باغ۔ فریب جمال۔ بہارِ حسن۔ وقفِ خزاں۔ گلچینِ عیش۔ دل کی مرادیں نکالنا۔ یہ بندش، یہ ترکیب بایدو شاید ہے۔

آہ! جناب برقؔ آج ہم میں نہیں۔ وہ شاعر جس کا قلم سحر رقم تھا۔ جس کی زبان جادو بیان تھی۔ جس کا خیال برق مثال تھا۔ جس کی نظم رونقِ بزم تھی، جس کا کلام مقبولِ انام ہے، اپنے کام کو ادھورا چھوڑ کر دنیا سے چل دیا۔

غنیمت ہے طالبؔ صاحب کا دم، جن کے دم سے برقؔ صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ برقؔ دنیا میں نہ رہے مقدراتِ الٰہیہ میں کسی کا چارہ نہیں۔ لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ برقؔ کا کلام زندہ ہے، زندہ رہے گا۔ رہتی دنیا تک اہلِ دل اور اہلِ ذوق ان کے خیال پر قبولیت اور خوشنودی کے نام مہکنے والے پھول ہمیشہ ہمیشہ نچھاور کرتے رہیں گے۔

• میں یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ مجھ پر وارفتگی کا عالم طاری ہو گیا جناب برقؔ کی یاد چٹکیاں لینے لگی۔ خیال آیا کہ جناب برقؔ کی قبر پر چلیں۔ دل نے کہا وہ تو ہندو تھے بے ساختہ فارسی کا یہ

شعر زبان پر جاری ہوا جو جناب برقؔ پر صادق آتا ہے ؎

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے عارفاں باشد مزار ما

باب پنجم

مشاعرے (طرحی و غیر طرحی)، یومِ برق، کا جزوِ لاینفک رہے ہیں۔ یہاں چند طرحی مشاعروں کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ باب تشنہ کامانِ شعر و ادب کے حق میں آبِ حیات ثابت ہوگا۔

طالب دہلوی

انتخاب مشاعرہ ۱۹۲۹ء

مصرع طرح :- فریب خوردۂ نیرنگیٔ مجاز ہوں میں

درج ذیل انتخاب کیلاش ہوشیارپور کی مختلف جلدوں سے ماخوذ ہے

جناب منشی گوپی ناتھ صاحب امن لکھنوی

میں جانتا ہوں زمانہ کی رائے کی قیمت
اسی لئے تو ستائش سے بے نیاز ہوں میں

یہ جائے فخر نہیں جائے شکر ہے اے امن
اگر کسی کا زمانہ میں چارہ ساز ہوں میں

جناب منشی گیان پرکاش صاحب اختر بریلوی

سرشکِ غم کی طرح ترجمانِ راز ہوں میں
سبز شرہ ہوں مگر محو سوز و ساز ہوں میں

کمالِ شوق میں وارفتگیٔ شوق نہ پوچھ
نیاز مند ہوں اتنا کہ بے نیاز ہوں میں

شریکِ راز بنا کر فریبِ راز نہ دے
یہ کیا کہ تو بھی وہی راز ہے جو راز ہوں میں

تصورات سے آگے، مشاہدات سے دور
بجائے خود جو حقیقت ہے، وہ مجاز ہوں میں

ملی ہیں آکے جہانِ ہستی و عدم کی حدیں
جبینِ راز پہ وہ خطِ امتیاز ہوں میں

نظر کے سامنے رکھتا ہوں اک اک پردہ
ستم ہے اپنے لئے خود کرشمہ ساز ہوں میں

کسی کو اپنی حقیقت بتاؤں کیا اختر
جو مجھ پہ بھی نہ کھلا آج تک وہ راز ہوں میں

جناب کالی چرن صاحب اخگر دہلوی

جو آ سکے نہ حدِ عقل میں وہ راز ہوں میں
نہیں حجاب سے نسبت جسے وہ ساز ہوں میں

کہاں ہے بیخودیٔ شوق میں خبر اتنی
امینِ راز ہوں یا ترجمانِ راز ہوں میں

کبھی تو لے گی حقیقت بھی مجھ میں انگڑائی
جو آج صورتِ خمیازۂ مجاز ہوں میں

جناب سید عبد العلی صاحب اظہار سہوانی

نہ کھایا چشمِ حقیقت شناس نے دھوکا
تمہارا حسن یہ کہتا رہا مجاز ہوں میں

جناب منشی اقبال درما سحر ہنگامی بی اے

[illegible] جلوۂ تغیرِ امتیاز ہوں میں
کبھی ہوں ناز سراپا کبھی نیاز ہوں میں

عیاں ہے مجھ پہ تعلق ہے کل نظام کا حال
جو ایک راز ہے دنیا تو ایک راز ہوں میں

مرو بندگی حق ہے یہ نہیں معلوم
کہ بت پرست ہوں یا بندۂ نماز ہوں میں

ہے یہ بھی کوئی کرشمہ مری حقیقت کا
فریب خوردۂ نیرنگیٔ مجاز ہوں میں

[illegible] عجب جہل کا لطیف احساس
ترا سپاس گزار نسبتِ راز ہوں میں

کسی میں بھی تو نہیں کوئی اپنی اصلیت
شکیب کی ہے کہ ہر واقفِ فراز ہوں میں

جناب پنڈت رگھوندر راؤ جذب۔ عالم پوری

یہ حسن و عشق مری معنوی ادائیں ہیں
میں غزنوی ہوں کہیں اور کہیں ایاز ہوں میں

ہے تیری یاد میں مصروف ہر نفس میرا
یہی سبب ہے کہ مستغنیٔ نماز ہوں میں

نہ ہو کہیں مری آوارگی سے تو بدنام
تو اپنے دل میں جگہ دے کہ تیرا راز ہوں میں

کہاں عروجِ محبت کنارِ حسن کہاں؟
ابھی تو سجدہ گزارِ حریمِ ناز ہوں میں

خفا ہے کیوں مرے سجدے پہ تو، سمجھتا ہوں
ازل سے فرق شناسِ غرور و ناز ہوں میں

جناب شام لال صاحب روشن دہلوی

کہیں ہوں عشقِ حقیقی کہیں مجاز ہوں میں
نگہ کا پھیر ہے، دراصل جلوہ ساز ہوں میں

جناب کیلاش ورما شائق۔ بی۔ اے

کبھی ہوں رنگِ حقیقت کبھی مجاز ہوں میں
جہاں راز ہیں دراصل ایک راز ہوں میں

ہیں غم ہوں مگر غم سے بے نیاز ہوں میں
کہ خود ہی درد ہوں اور خود ہی چارہ ساز ہوں میں

نیاز ختم ہوئی مجھ پہ تمام ناز ہوں میں
جو اپنا آپ ہے محمود وہ ایاز ہوں میں

قبول ہو کے رہا رنگِ ناتمامیِ عشق
نذرِ حسنِ مکمل کے سرفراز ہوں میں

نفس نفس پہ ہے آہنگِ زیست کا نغمہ
ہزار راز کے پردوں کا ایک ساز ہوں میں

کشیدگی بھی تعلق میں کارفرما ہے
تمام ناز ہیں وہ سر بسر نیاز ہوں میں

عجب ہے کیا جو حقیقت سے دور ہوں شائق
(نصیب خوردہ نیرنگیِ مجاز ہوں میں)

جناب مہر لال سونی ضیا۔ ایم۔ اے

ترے لیے بس اب احسن غم نواز ہوں میں
نیاز مند ہوں اتنا کہ بے نیاز ہوں میں

ترے تصور پیہم کی مستیاں، توبہ
شراب و ساقی و ساغر سے بے نیاز ہوں میں

اسی مقام پہ ہوتی ہے عشق کی تکمیل
پکارتا ہے دل غزنوی ایاز ہوں میں

ترے تغافل بیجا کا کیا کروں شکوہ
اب التفات سے بھی تیرے بے نیاز ہوں میں

ضیا زمانہ مجھے کس طرح سمجھ جائے
کھلا نہ مجھ پہ بھی جو آج تک وہ راز ہوں میں

طالب دہلوی

تمام کیف ترنم بغیر ساز ہوں میں
جو بے نیاز حقیقت ہے، نہ مجاز ہوں میں

مرے نیاز کی عظمت کسی کو کیا معلوم
خراج ناز ہے مجھ سے، دماغ ناز ہوں میں

تجھے گمان کہ پردہ بہ پردہ تیرا وجود
مجھے یقین کہ رازِ درونِ راز ہوں میں

بدل گیا ہے تخیل ہی عشق کا ورنہ
نیاز مند ہے تو اور بے نیاز ہوں میں

مری خطا تھی نہ دیتے اگر نگاہ مجھے
نگاہ دی ہے تو مجبورِ امتیاز ہوں میں

مجاز اپنی جگہ مظہرِ حقیقت ہے
حقیقتوں کو جو پیدا کرے وہ مجاز ہوں میں

ہنوز روزِ ازل سے زباں پہ جاری ہے
نہیں جو ختم وہ افسانۂ دراز ہوں میں

ملا کے آنکھ ذرا اس طرف ہو محوِ کلام
یہ کیا کہا کہ حقیقت ہے تو مجاز ہوں میں

بہت لطیف ہیں میری حقیقتیں طالبؔ
حجابِ ساز میں گویا نوائے ساز ہوں میں

جنابؔ نارائن داس طالبؔ۔ پانی پتی

عبودیت کے لئے بیخودی ضروری ہے
یہی نہیں ہے تو کیا قائلِ نماز ہوں میں

مری نگاہ نے مجھ کو تباہ کر ڈالا
ہلاک کردۂ آشوبِ امتیاز ہوں میں

سمجھ کے بھی نہ مجھے کوئی آج تک سمجھا
جو آشکار بھی پنہاں بھی ہے وہ راز ہوں میں

مری حیات میں دخلِ نشاط کیا معنی ؟
الم رفیق ہے میرا، الم نواز ہوں میں

ہے میری ذات سراپا بیک کرشمہ دو کار
بقا کی شکل ہے مجھ سے فنا کا راز ہوں میں

نہ پوچھ مجھ سے محبت کی داستاں طالبؔ
قتیلِ تیغِ ادا ہوں، شہیدِ ناز ہوں میں

جناب رامچندر صاحب ماتھر غافلؔ (علیگ)

صدائے ساز نہیں ہے وہ ہائے ساز ہوں میں
رہے جو دل میں نہاں وہ نوائے راز ہوں میں

رہینِ درد نہ ممنونِ چارہ ساز ہوں میں
یہ حال اب ہے کہ دونوں سے بے نیاز ہوں میں

نثارِ ضبط کہ منت شناسِ غیر نہیں
خود اپنے دردِ محبت کا چارہ ساز ہوں میں

نکل سکے نہ خم و پیچ میری ہستی کے
یہ کس کا سلسلۂ گیسوئے دراز ہوں میں ؟

نہ پوچھ مجھ سے مرا مقصدِ حیات نہ پوچھ
نہ جانے کس لئے سرگرمِ سوز و ساز ہوں میں

یہ بیخودیٔ محبت نے حوصلہ بخشا
خدا کی شان خلائق سے بے نیاز ہوں میں

کرے مقام کو میرے سلام کعبہ بھی
تمام پیکر محویت نماز ہوں میں

خدا کی یاد ذرا اور رنگ لے آئے
شراب پی کے اگر شامل نماز ہوں میں

بدل سکا نہ کبھی رنگِ بیخودی غافل
تغیّراتِ زمانہ سے بے نیاز ہوں میں

جناب منشی چندربھان صاحب کیفی دہلوی

اسی شرف سے زمانہ میں سرفراز ہوں میں
نیاز مند بدرگاہِ بے نیاز ہوں میں

ادا شناس مساوات و امتیاز ہوں میں
جو حق نما ہے وہ آئینہ مجاز ہوں میں

صدائے ساز نہ سمجھ شکستِ ساز ہوں میں
خموشیوں میں فنا کی نوائے راز ہوں میں

وضو شراب سے ہی پائے خم پہ سجدہ ہے
جو یہ نماز قضا ہو تو بے نماز ہوں میں

جوابِ حشر ہو ظلمت مرے گناہوں کی
سیہ نفس روشِ کاکلِ دراز ہوں میں

نظر نظر کو ہے سکتہ جمالِ یکتا سے
جو حیرتی ہے وہ آئینہ مجاز ہوں میں

ہے سازِ حسن سے اس طرح عشق ہم آہنگ
کہ جاں نواز جو تم ہو تو غم نواز ہوں میں

جہاں میں آگ لگاتی ہے گرمیٔ گفتار
مثالِ شعلۂ سرکش زباں دراز ہوں میں

حضرت کیفی ۲ فروری ۱۹۵۱ء کو انا اللہ ہوئے۔

مری خراب حقیقت فروز ہے کیفی
کہے نہ کوئی کہ مستِ مئے مجاز ہوں میں

جناب منشی لچھمیشور پرشاد صاحب منوّر لکھنوی

کمالِ ضبط ہے، مصروفِ سوز و ساز ہوں میں
خموش مثلِ چراغِ نفس گداز ہوں میں

مریضِ غم تبقاضائے چارہ ساز ہوں میں
ہر ایک قسم کے درماں سے بے نیاز ہوں میں

چھپا لیا ہے مجھے میری خود نمائی نے
حجاب جس کا ہے بے پردگی وہ راز ہوں میں

نفس نفس سے ٹپکتا ہے زیر و بم میرا
جو ارتعاش میں ہے، وہ حجابِ ساز ہوں میں

کھنچی رہے جو مصوّر سے حیف وہ تصویر
جو مجھ پہ ناز کرے، اُس سے بے نیاز ہوں میں

مری سرشت ترنّم ہے، کیا غرض اس سے
حجابِ ساز ہوں میں یا نوائے ساز ہوں میں

فضول زخمہ و مضراب کا تکلف ہے
جو بے نیازِ حجابات ہے، وہ ساز ہوں میں

نہیں تو خاک بتانے سے مجکو مطلب ہے
یہ کیا ضرور کہ معروفِ سوزِ دساز ہوں میں

بھرا ہے رنگ حقیقت نے جس میں خود اپنا
وہ ایک نقش سرِ دامنِ مجاز ہوں میں

مری نگاہ سے ظاہر ہے کیفیت دل کی
امین راز ہوں، پھر بھی حریفِ راز ہوں میں

بہار کس سے چمن میں بنی ہوئی ہے بہار
وہ رنگ و بو ہے کہ معذورِ امتیاز ہوں میں

عیاںؔ اُنھیں پہ منوّر ہے مرتبہ میرا
وہ سرفراز جو سمجھیں تو سرفراز ہوں میں

انتخاب مشاعرہ سنہ ۱۹۴۰ء

مصرعِ طرح

جو آنکھیں دیکھ لیتی ہیں اُسے دِل یاد رکھتا ہے

درجِ ذیل انتخاب کا کچھ حصہ "کیلاش" ہوشیار پور کی مختلف جلدوں سے ماخوذ ہے۔

اس مشاعرے میں شعرا قافیہ کے انتخاب میں آزاد تھے۔ چنانچہ بعض شعرا نے 'دِل' اور بعض نے 'یاد' کو قافیہ قرار دیتے ہوئے طبع آزمائی فرمائی اور بعض حضرات نے دونوں طرحوں میں دادِ سخن دی۔

اربابِ ذوق کی خاطر سے وہ تمام غزلیں دی جا رہی ہیں جو اَب تک موصول ہوئی ہیں۔

طالب چھلوی

بقافیہ۔ دل، ساحل، وغیرہ

جناب گیان پرکاش صاحب اختر بریلوی

غلط کیا ہے اگر کچھ نقشِ باطل یاد رکھتا ہے
مسافر راستہ منزل بہ منزل یاد رکھتا ہے

شناور کھیلتا ہے یوں تو اک اک موجِ دریا سے
مگر لطفِ ہم آغوشیِٔ ساحل یاد رکھتا ہے

وہ جنت ہی سہی لیکن نہ دے تکلیفِ نظارہ
ترا گوشہ نشیں ہر رنگِ محفل یاد رکھتا ہے

ستم ہے اس طرح رنگِ تمنا کا بکھر جانا
دل اپنا مُدعا بھی اب بمشکل یاد رکھتا ہے

ترا دیوانہ لطفِ خاصِ زنداں سے نہیں منکر
مگر بے مہریِٔ طوق و سلاسل یاد رکھتا ہے

یہاں آوارگی ہی مصلحت ہے، ورنہ اے ناصح
دلِ گم کردہ منزل اپنی منزل یاد رکھتا ہے

توقع ہوش کی اک ناتوانِ غم سے کیا اختر
غنیمت ہے جو پیمانِ وفا دل یاد رکھتا ہے

حضرت بسمل شاہجہانپوری

سرِ محفل مآلِ عیشِ محفل یاد رکھتا ہے
وہ انساں ہے جو آسانی میں مشکل یاد رکھتا ہے
مرے طوفانِ گریہ کو مرے اشکِ تمنا میں
سفینے غرق ہو جاتے ہیں، ساحل یاد رکھتا ہے
یہ منزل ہے کہ خود کھنچ کر چلی آئی یہاں ورنہ
کہیں گم گشتۂ الفت بھی منزل یاد رکھتا ہے؟
رُخِ روشن پہ میں خود گیسوئے مشکیں بکھیر دوں گا
مزاج آشنا دل حق باطل یاد رکھتا ہے
یہ وجہ کس مپرسی ہے کہ شانِ بیکسی بسمل
مجھے برسوں مرا مدِ مقابل یاد رکھتا ہے

منشی محمد صدیق حسن صاحب صدیق دہلوی

جفائیں اپنی کب وہ حسن کامل یاد رکھتا ہے
گزرتی ہے جو دل پر عشق میں دل یاد رکھتا ہے
بقدرِ ظرف دیتا ہے ہر اک کو ماپ کر ساقی
ہجومِ خلق میں بھی رنگِ محفل یاد رکھتا ہے

ڈبویا ہو جسے اے رشکِ یوسف تیری اُلفت نے
وہ غرقِ چاہ کب دامانِ ساحل یاد رکھتا ہے؟
چھُری، تکبیر پڑھ کر، پھیرتا ہے میری گردن پر
خدا کو بھی ستم کے وقت قاتل یاد رکھتا ہے
دمِ آخر پھریں صدیق مجھ سے خود مری آنکھیں
جہاں میں کون کس کو وقتِ مشکل یاد رکھتا ہے

جناب مہر لال سونی ضیا۔ ایم۔ اے فتح آبادی

ابھی اس کو ہوس پر فتح پانے کی ضرورت ہے
محبت میں بھی جو آدابِ محفل یاد رکھتا ہے
تلاش اس کارواں سالار کی پائے خجستہ کر
پہنچ کر اپنی منزل پر جو منزل یاد رکھتا ہے
گذر جاتے ہیں جو طوفان آکر سطحِ دریا پر
اُنھیں موجیں بھُلا دیتی ہیں، ساحل یاد رکھتا ہے
مجھے کچھ بھی نہیں معلوم سُنتا ہوں کہ کشتی کو
سپُردِ موجِ طوفاں کر کے ساحل یاد رکھتا ہے
ملی تھی چاندنی راتوں میں معراجِ جنوں مجھکو
مری بربادیوں کو ماہِ کامل یاد رکھتا ہے

تلاشِ حُسن تاروں سے بھی آگے لے گئی مجھکو
کوئی کب بے خودی میں حدِ فاصل یاد رکھتا ہے؟
ہر آنسو شمع گریاں کا دلیلِ ناتمامی ہے
ستارہ صبح کا انجامِ محفل یاد رکھتا ہے

طالبؔ۔ دہلوی

پسِ ترکِ جہاں ہر نیک و بد دل یاد رکھتا ہے
جُدا محفل سے ہو کر رنگِ محفل یاد رکھتا ہے
زمانہ شدتِ بیتابیِٔ دل یاد رکھتا ہے
یہ ہے وہ موجِ دریا جس کو ساحل یاد رکھتا ہے
بُھلا دیتے ہیں جس کو ہوش والے زعم میں اپنے
اُسے گر یاد رکھتا ہے تو غافل یاد رکھتا ہے
بہر صورت جسے رہتا ہے مطلب کام کرنے سے
نہ آساں یاد رکھتا ہے، نہ مشکل یاد رکھتا ہے
نہ یوں رسوا کریں ذوقِ تجسس کو جہاں والے
کہ وہ گُم کردہ منزل ہے جو منزل یاد رکھتا ہے
کسی کے آج پھر ہیں منتظر ویرانہ و صحرا
کسی کو آج پھر ناقہ و محمل یاد رکھتا ہے

جنابِ برقؔ کی ہستی، وہ ہستی تھی، جسے طالبؔ
ہر اک اہلِ نظر، ہر صاحبِ دل یاد رکھتا ہے

جناب نارائن داس طالبؔ۔ پانی پتی

تصوّر میں سمو کر جذبِ کامل یاد رکھتا ہے
کسی کو یاد رکھنے کی طرح دل یاد رکھتا ہے

گزرتا ہے جو دل پر حادثہ، دل یاد رکھتا ہے
تلاطم خیزیٔ دریا کو ساحل یاد رکھتا ہے

فسانہ غیر کا، کیفیت اُن کی، سرگزشت اپنی
کسی سے کیا کہوں کیا کیا مرا دل یاد رکھتا ہے

یہ اندازِ خموشی مانعِ اظہار ہے، ورنہ
روش ہر موجِ مضطر کی ساحل یاد رکھتا ہے

مآل کار کی جانب سے کیوں ہے بے خبر اتنا
مسافر ہے وہی جو اپنی منزل یاد رکھتا ہے

جناب منشی چند بھان صاحب کیفیؔ۔ دہلوی

طریقِ عشق میں کامل کو کامل یاد رکھتا ہے
میں دل کو یاد رکھتا ہوں مجھے دل یاد رکھتا ہے

مجازی حسن کے جلوے تو آنکھیں دیکھ لیتی ہیں
سرورِ ذات کی کیفیتیں دل یاد رکھتا ہے
طلسمِ عشرتِ فانی سے وہ دھوکا نہیں کھاتا
جو اسبابِ شکستِ رنگِ محفل یاد رکھتا ہے
ہوئے سب بے نشاں موجِ فنا میں ڈوبنے والے
نہ دریا یاد رکھتا ہے، نہ ساحل یاد رکھتا ہے
جوانی دل میں اب کیفی ترنگیں ہی نہیں لیتی
مگر پھر بھی مجھے ہر رندِ محفل یاد رکھتا ہے
(جناب منشی بشیشور پرشاد صاحب منور لکھنوی)
عبورِ بحر کی ایک ایک مشکل یاد رکھتا ہے
شناورِ ہر ادائے موج و ساحل یاد رکھتا ہے
طریقِ عشق کا ہر پیچ و خم دل یاد رکھتا ہے
سفر کا تجربہ منزل بہ منزل یاد رکھتا ہے
اثر اندازیٔ جذباتِ کامل یاد رکھتا ہے
جسے کہتے ہیں دل کی داستاں دل یاد رکھتا ہے
یہ مانا ہم نے رہ جاتے ہیں محفوظِ دماغ اکثر
کچھ ایسے بھی فسانے ہیں جنھیں دل یاد رکھتا ہے

بھلا دینے میں بھی تجھکو ہے قائم یاد کا پہلو
تری صورت کو اس صورت سے بھی دل یاد رکھتا ہے

کہاں تک دیکھئے رو داد رہتی ہے محبت کی؟
کہاں تک دیکھئے اس درد کو دل یاد رکھتا ہے؟

کہیں تو نقش ہو جاتا ہے خمیازہ تلاطم کا
جو دریا بھول جاتا ہے تو ساحل یاد رکھتا ہے

دلوں میں نقش ہو جاتے ہیں سب پہلو تعلق کے
مقابل کو بہر صورت مقابل یاد رکھتا ہے

لئے جاتا ہے ارمانوں کی اک دنیا کو ساتھ اپنے
دمِ آخر بھی پیمانِ وفا دل یاد رکھتا ہے

محبت سے بدل دے آدمی جذبِ عداوت کو
اسے دل بھول جاتا ہے اُسے دل یاد رکھتا ہے

کہاں ہے ہمّتِ مردانہ؟ آکر کچھ سہارا دے
منوّر اک تجھی کو وقتِ مشکل یاد رکھتا ہے

چونکہ حضرات غافل، اختر اور گوہر کا کلام دیر سے موصول ہوا لہٰذا ان حضرات کا کلام خلاف ترتیب یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔

طالب۔ دہلوی

جناب راجیندر صاحب ماتھر۔ غافل (علیگ)

جہاں کی کشمکش میں بھی تجھے دل یاد رکھتا ہے
بہر صورت مسافر اپنی منزل یاد رکھتا ہے

تری صورت سے پیدا ہیں یہ کیوں پہلو تغیر کے
کبھی دل بھول جاتا ہے، کبھی دل یاد رکھتا ہے

رسائی کی دلیل صاف ہے وارفتگی میری
پہنچ کر تا بہ منزل کون منزل یاد رکھتا ہے

جناب کالی چرن صاحب آثر۔ دہلوی

کیا ہے ڈوب کر یہ ڈوبنے والے نے اندازہ
کہاں تک ڈوبنے والے کو ساحل یاد رکھتا ہے

یہ خود داری کا جذبہ ہے کہ رعب حسن کا غلبہ
زباں پہ آ کے رک جاتا ہے جو دل یاد رکھتا ہے

بہا جاتا ہے اپنی رَو میں دیوانہ محبت کا
نہ دریا یاد رکھتا ہے، نہ ساحل یاد رکھتا ہے

ترے مشتاقِ نظارہ نے کر رکھی ہیں بند آنکھیں
نظر کا اس پہ کیا دعویٰ جسے دل یاد رکھتا ہے

اُبھر کر ڈوبنا پھر ڈوب کر اُس کا اُبھر آنا
یہ وہ منظر ہیں کشتی کے جو ساحل یاد رکھتا ہے

جناب دگمبر پرشاد صاحب گوہرؔ دہلوی

تری محفل میں رہ کر رنگِ محفل یاد رکھتا ہے
جو آنکھیں دیکھ لیتی ہیں اُسے دل یاد رکھتا ہے

جہاں تارِ نفس ٹوٹا، وہیں دم دے دیا دم نے
یہ دیوانہ مسافر اپنی منزل یاد رکھتا ہے

فغانِ عاشقِ دلگیر سن کر ہر کلی چٹکی
ہر اک گُل فطرتاً شورِ عنادل یاد رکھتا ہے

غلط ہے دل کو سمجھے حسرتِ دل سے گریزاں ہو
وہ لیلےٰ سے بھی واقف ہے جو محمل یاد رکھتا ہے

ابھی تک لذتِ غم کا ہے طالب یہ جہاں گویا
جنابِ برقؔ کو گوہرؔ ہر اک دل یاد رکھتا ہے

انتخاب مشاعرہ ۱۹۴۲ء

مصرع طرح :- پرتوِ حسنِ ازل برق کی تنویر میں تھا

ماخوذ :- از اتالیق لاہور- اپریل ۱۹۴۲ء

جناب منشی گوپی ناتھ صاحب امن لکھنوی

جن دنوں زور مرے ناخنِ تدبیر میں تھا
داغِ محکومئ پیہم کا نہ تقدیر میں تھا

کوئی غفلت، کوئی وعدہ کوئی دھمکی سمجھا
لطف کل رات یہ اُس شوخ کی تحریر میں تھا

دمِ آخر بھی رہی مجھ کو رہائی کی اُمید
ایسا دھوکا مرے صیاد کی تقریر میں تھا

آج ہر قسم کی جھنکار سے خوش ہوتا ہے
وہی دیوانہ جو کل بندشِ زنجیر میں تھا

ہائے کیا پوچھتے ہو مجھ سے کہ برقِ مرحوم
کتنا ذی مرتبہ اُردو کے مشاہیر میں تھا

جناب انوار الدین صاحب انوار دہلوی

کبھی ہم تم میں محبت بھی تھی یکجائی بھی
ایک ساغر تھا جو ہم دونوں کی تقدیر میں تھا

برق کے دیکھنے والوں کا ہے انوار یہ قول
پرتوِ حسنِ ازل برق کی تنویر میں تھا

جناب شگن چند صاحب روشن پانی پتی

پرتوِ حسنِ ازل برق کی تنویر میں تھا
حسنِ دلکش کا مرقع اسی تصویر میں تھا

ابوالمعظم جناب نواب سراج الدین احمد صاحب سائل دہلوی

یہ نہ وہ تیر تھا جو سینۂ نخچیر میں تھا
دل وہ میرا تھا جو پیوستہ ترے تیر میں تھا

جوشِ بحرِ غمِ دل کی نہ حقیقت پوچھو
ایک طوفان بپا دیدۂ دلگیر میں تھا

کہہ گیا ہے کہ ہوئی سوزشِ پیہم سے نجات
رشتۂ سوختۂ شمع جو گلگیر میں تھا

اس نتیجے پہ نصیحت ہوئی ناصح کی تمام
مدعا کوئی نہ تقریر کا تقریر میں تھا

لوگ سائل بھی سمجھ کر مجھے رکھتے ہیں عزیز
لفظِ تحقیر بھی تقدیر سے توقیر میں تھا

جناب منشی بشیشور پرشاد صاحب منور لکھنوی

شوقِ تکمیلِ جنوں خانۂ زنجیر میں تھا
مری شہرت کا بھی پہلو مری تشہیر میں تھا

اب دعا کام جو کرتی ہے تو شرمندہ ہوں
نقص گویا مرے اندازۂ تاثیر میں تھا

لینے والے نے لیا جائزۂ دل ہر چند
فرق پھر بھی مرے جذبات کی تفسیر میں تھا

خود بخود میری طرف کوئی کھنچا آتا ہے
یہ تعلق نہ کبھی جذبہ و تاثیر میں تھا

کر دیا تھا مجھے زنداں میں جنوں نے خاموش
کون پھر سلسلہ جنباں مری زنجیر میں تھا

قید بھاری تھی خود اپنی ہی طبیعت کے سبب
نہ گراں طوق تھا کچھ بوجھ نہ زنجیر میں تھا

کر دیا نذرِ ستم دِل کو بھی تصویر کے ساتھ
عیب کیا دل کی بنائی ہوئی تصویر میں تھا

دمِ پرسش لبِ گُفتار کو جنبش نہ ہوئی
عذرِ تقصیر بھی شامل مری تقصیر میں تھا

یاد اُس وقت کی آتی ہے تو رو دیتا ہوں
جب مرا نخلِ منوّر مری تقدیر میں تھا

طالب۔ دھلوی

قابلِ دید تھا جو رنگ بھی تغیّر میں تھا
لطفِ دُنیا کی بدلتی ہوئی تصویر میں تھا

مری تقصیر نے انسان بنایا مجھ کو
مری اصلاح کا پہلو مری تقصیر میں تھا

خاکِ دُنیا پہ اسیری کی لگائیں تہمت
پاؤں پہلے ہی سے اُلجھا ہوا زنجیر میں تھا

سب سے مرے حُسنِ تخیّل کی فسوں کاری تھی
خواب میں تھا نہ اثر خواب کی تعبیر میں تھا

اور رودادِ الم کیسے مکمل ہوتی؟
غمِ اُستاد بھی طالبؔ تری تقدیر میں تھا

جناب شیر سنگھ صاحب ناز دہلوی

رنگ و روغن سے بھی یہ راز چھپایا نہ گیا
خود تصوّر ہی سرِ پردۂ تصویر میں تھا

مل گئی دل میں اُترتے ہی فنا کی لذت
اس سے پہلے نہ مزا کچھ خلشِ تیر میں تھا

خونِ تازہ کی روانی تھی رگوں میں جس وقت
مجھ میں کیا رنگِ جوانی مری تصویر میں تھا

جناب رائے سدھ ناتھ بلی فراقی دریا بادی

کون کہتا ہے خطا کاتبِ تقدیر کی تھی
بگڑ گیا حرف بحرف آپ جو تقدیر میں تھا

جناب دیوان بدری ناتھ صاحب کامل ماچھیواڑی

سچ تو یہ ہے نہ تھا شمع میں نہ پروانوں میں
بزم آرائی کا انداز جو گلگیر میں تھا

رشکِ صد طور بنا اس سے مرا خرمنِ دل
"کہ تو حسنِ ازل برق کی تنویر میں تھا"

جناب رامچندر صاحب غافل (علیگ)

خارِ پیوست بُنِ ناخنِ تدبیر میں تھا
سعئِ ناکام کا ماتم مری تقدیر میں تھا

پڑھنے والے قسمت کا نوشتہ سمجھے
راز سا راز تری شوخیٔ تحریر میں تھا

آپ اگر توڑ بھی دیتے تو نہ بنتی کچھ بات
سلسلہ میری وفا کا مری زنجیر میں تھا

آپ کے حسنِ جہاں کا تھا اشارہ، ورنہ
ظلم ڈھانے کا سلیقہ فلکِ پیر میں تھا؟

میرا مٹنا ہی تھا غافل مرے مٹنے کی دلیل
رنگ تخریب کا ہر کوششِ تعمیر میں تھا

جناب سید سبط احمد صاحب غافل امروہوی

ہم نہیں سمجھے وہ غافل تھا کہ وہ تھا مزدور
اک مسلمان جو میخانے کی تعمیر میں تھا

جناب پنڈت آنند ناتھ صاحب گلزار دھلوی

نقشِ ثانی بتِ لاثانی کی تفسیر میں تھا
حسنِ فطرت کا مرقع کھنچی تصویر میں تھا

عشق کی خاک میں آمیز ہوئی حسن کی آگ
جزوِ اعظم یہ ترکیب مری تخمیر میں تھا

بت پرستوں کو کسی ترک نے یوں ذبح کیا
ان کے ایماں کا خلل نعرۂ تکبیر میں تھا

چینِ پیشانی، خمِ ابرو سے کھیلا برسوں
دل کہ بچپن سے پلا سایۂ شمشیر میں تھا

قدرِ گلزار کی ہونے لگی گلبانگوں میں
سنتے ہیں آج گیا بزمِ مشاہیر میں تھا

باب ششم

سخن ہائے گفتنی

یومِ برقؔ کے مقالے اور منتخب مشاعرے تو آپ نے باب چہارم اور باب پنجم میں ملاحظہ فرمائے، اب ان تقاریر پر بھی ایک نظر ڈالیں۔ جو ان مواقع پر علم دوست کرمفرماؤں نے کیں۔
تسلیم کہ یہ رپورٹس ایک طائرانہ نگاہ سے زیادہ

حیثیت نہیں رکھتیں لیکن اِن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے مطالعے سے پڑھنے والوں کے روبرو ہمارے جلسوں اور مشاعروں کا پورا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے

یوں تو اس باب کی تکمیل کے لئے 'ہماری زبان' 'اتالیق' اور بالخصوص "تیج" کا دل سے سپاس گزار ہوں لیکن اس ضمن میں جناب منشی گوپی ناتھ صاحب امن خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

طالب۔ دہلوی

یادگارِ برقؔ کا جلسہ

ماخوذ از تیج روزنامہ دہلی۔ مورخہ ۱۹ فروری ۱۹۳۶ء

دہلی۔ ۱۸ فروری۔ اتوار کے روز مسٹر ششیش چندر صاحب طالبؔ بی۔اے کے دولت خانہ پر ۲ بجے دن کے جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسہ کی صدارت منشی چتربہاری لال صاحب نے فرمائی۔ شروع میں مسٹر ششیش چندر صاحب طالبؔ نے رائے بہادر رام بابو سکسینہ ایم۔اے، جناب روشنؔ پانی پتی، حضرتِ جگرؔ بریلوی، مولانا قابلؔ گلاؤٹھی وغیرہ کے پیغامات سنائے اور حضرتِ قابلؔ کی ایک نظم برقؔ مرحوم کے متعلق پڑھی۔ اس کے بعد جناب منشی گوپی ناتھ صاحب امنؔ لکھنوی نے ایک مختصر تقریر میں جنابِ برقؔ کی خوبیاں بحیثیت ایک شاعر اور ایک انسان کے بیان کیں۔ اس کے بعد حضرات آفتابؔ پانی پتی، زارؔ دہلوی سعیدؔ بریلوی وغیرہ نے ماتمی نظمیں پڑھیں اور جنابِ طالبؔ نے حضرتِ برقؔ کی نظم گوئی کے متعلق ایک طویل اور پُرمغز مقالہ پڑھا۔ آخر میں چتربہاری لال صاحب صدرِ جلسہ نے ایک مختصر تقریر میں جنابِ برقؔ کا ذکر کیا۔

جلسہ ختم ہونے کے بعد مشاعرہ شروع ہوا جسکی صدارت

۱؎ آپ ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء کو صبح ۷ بجے رحلت فرما گئے۔

افسر الشعرا حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی نے فرمائی۔ ابتدا میں جناب منشی گوپی ناتھ صاحب امن نے ''یک ماتمی بہار'' کے عنوان سے نظم پڑھی اور اس کے بعد طرحی مشاعرہ شروع ہوا جس میں حضرات ساحر، معجز، نزار، غوث شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی، ماہر اکبر آبادی، منور لکھنوی، اختر بریلوی، بہزاد لکھنوی، اثر، صوفی، تمنا، روشن، شاد، طالب پانی پتی، طالب دہلوی، خار، مدان، صدیق وغیرہ نے شرکت فرمائی۔

حضرت برق مرحوم کی دوسری برسی

(ماخوذ از تیج روزانہ۔ مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۳۸ء)

دہلی۔ ۲۱ فروری۔ کل دو بجے دن کے وقت مسٹر شیش چندر طالب بی اے تلمیذ منشی مہاراج بہادر صاحب برق مرحوم کے مکان واقع گلی تماشان چاوڑی بازار میں برق مرحوم کی دوسری برسی منائی گئی۔ جلسہ کی صدارت مسٹر سدانند سکسینہ ایم۔ اے۔ بی ٹی۔ ہیڈ ماسٹر شمبھو دیال ہائی اسکول غازی آباد نے فرمائی۔ شروع میں جناب اشرف صبوحی نے حضرت برق مرحوم کے متعلق ایک مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے مرحوم کا حسب و نسب، ابتدائی تعلیم اور عام سوانح حیات بیان کرنے کے بعد ان کی نظموں کے چند نمونے پیش کئے

ط: - باد اجل نے آپ کا چراغ حیات ۲ مارچ ۱۹۳۶ء کو گل کر دیا۔

اس کے بعد جناب خشگن چند روشن وکیل، پانی پتی نے اپنی نظم سنائی۔ زاں بعد حضرتِ قابل گلاوٹھی نے جنابِ برق مرحوم کے کلام کے مختصر حصے پیش کرتے ہوئے اُن کے کلام کی فصاحت، بلاغت، گہرائی اور وسعت کو بیان کیا۔ منشی گرسرن لال صاحب ادیب ایم۔ اے نے حضرتِ برق کی نشو و نما کا ذکر کرتے ہوئے اُن کے رنگِ کلام کے نفسیاتی اور ادبی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ آخر میں جنابِ صدر کی مختصر سی تقریر کے بعد جلسہ ختم ہوا۔

جلسہ ختم ہونے کے بعد مشاعرہ شروع ہوا جس کی صدارت جناب آزاد انصاری صاحب نے فرمائی۔ اس مشاعرہ میں مقامی شعرا کے علاوہ بیرونجات کے شعرا بھی شریک ہوئے۔ مشاعرہ شب میں ختم ہوا۔

[illegible]

حضرت برق کی تیسری برسی کا جلسہ

بابو موہن لال سکینہ کی صدارتی تقریر

ماخوذ از تیج روزانہ۔ دہلی مورخہ ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء

دہلی ۱۰؍ فروری۔ کل تین بجے سہ پہر سے سات بجے شام تک جناب نیش چندر صاحب طالب بی۔ اے کے مکان واقع گلی تباشہ، چاوڑی بازار میں افتخار الشعراء منشی مہاراج بہادر صاحب برق کی برسی منائی گئی جلسہ کی کارروائی جناب بابو موہن لال سکینہ ایم ایل اے کی صدارت میں ہوئی

جلسہ کی کارروائی:۔ جناب منشی ایشور پرشاد صاحب منور کی تجویز اور منشی چندی پرشاد صاحب شیدا کی تائید سے بابو موہن لال سکینہ صدر جلسہ منتخب ہوئے۔ آپ نے رسمی شکریہ کے بعد کارروائی جلسہ کا آغاز کیا شروع میں لالہ انوپ چند صاحب آفتاب پانی پتی نے برق مرحوم کے متعلق ایک نظم پڑھی۔ اس کے بعد مسٹر کرشن بہاری لال آئی۔ سی۔ ایس کا ایک پیغام پڑھا گیا جس میں انھوں نے طالب صاحب کو یہ لکھا تھا

"میں جلسہ میں حاضر ہونے سے معذور ہوں لیکن برق مرحوم سے اپنی

عقیدت کا اظہار کرتا ہوں "

جناب طالب صاحب نے حضرتِ برقؔ کی مذہبی نظموں سے متعلق ایک مقالہ پڑھا جس میں اُن نظموں کی دلآویزی، رنگینی، اثر اندازی، چُستی بندش، جدّتِ ادا وغیرہ کے نمونے پیش کئے گئے تھے۔

مسٹر کرشن گوپال نے حضرتِ برقؔ کی سوانح عمری مختصر الفاظ میں بیان فرمائی۔ بعد ازاں منشی گوپی ناتھ امنؔ نے 'لطائف برقؔ' کے عنوان سے چند منٹ تقریر کی۔

صدارتی تقریر:۔ بابو موہن لال سکسینہ نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا "میں ذاتی طور پر برقؔ مرحوم سے واقف نہیں اور نہ مجھے شعر و شاعری میں چنداں دخل ہے۔ اس لئے بہتر ہوتا اگر کسی اور صاحب کو آج کے جلسے کا صدر منتخب کیا جاتا۔

نثر میں جو بات بہت لمبے چوڑے پیرایہ میں کہی جاتی ہے، وہی بات شاعر بہت تھوڑے الفاظ میں ادا کر دیتا ہے۔ لیکن وہ بہت تھوڑے سے الفاظ اس لمبی چوڑی عبارت یا تقریر کے مقابلے میں کہیں زیادہ اثر رکھتے ہیں۔ نثر کی تقریر یا تحریر ایک خاص موقعہ پر اثر رکھتی ہے اور وقت گذر جانے کے بعد اس میں وہ اثر باقی نہیں رہتا لیکن نظم میں اپنا اثر ہر موقعہ پر قائم رہتا ہے مثال کے طور پر وارن ہیسٹنگز پر جب پارلیمنٹ نے مقدمہ چلایا تو اسوقت

برک (Burke) وغیرہ نے جو تقریریں کیں، وہ اس زمانہ میں بہت اثر رکھتی تھیں۔ آج ان میں وہ اثر باقی نہیں ہے اصلی شاعر کا کلام زندۂ جاوید ہوتا ہے۔

گذشتہ پچاس سال میں اُردو میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی ہے۔ پہلے اُردو شاعری عام طور پر گل و بلبل تک محدود سمجھی جاتی تھی لیکن اب اس میں جوشؔ جیسے شاعر پیدا ہوگئے ہیں جن کے کلام میں انقلابی اثر ہے۔

آج ہم لوگ برقؔ صاحب کی برسی منانے جمع ہوئے ہیں جو اُردو شاعری میں ایک خاص پایہ رکھتے تھے۔ آپ لوگوں کا فرض ہے کہ اُن کے مشن کو زندہ رکھیں۔ آج ملک میں زبان کے بہت سے جھگڑے اُٹھ رہے ہیں جن میں سے ایک اُردو ہندی کا جھگڑا ہے۔ آپ لوگ اس کو فراخدلی سے حل کرنے کی کوشش کریں۔ ایک زمانہ تھا کہ چین میں لکھنے کی زبان اور تھی اور بولنے کی زبان اور۔ جو شخص بولنے کی زبان لکھنے میں استعمال کرتا تھا، وہ زیادہ لکھا پڑھا نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن انقلاب چین کا ایک اثر یہ ہوا کہ وہاں لکھنے اور بولنے کی زبان ایک ہوگئی اور آج چین میں جو زبان بولی جاتی ہے، وہی لکھی جاتی ہے۔ اسطرح بنگال میں بھی پہلے بولنے اور لکھنے کی زبان الگ الگ تھی لیکن بنکم بابو اور ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے اثر سے اب وہاں بولنے اور لکھنے کی زبان ایک ہوگئی ہے۔ ہمیں علم و ادب کو عوام تک پہنچانا ہے تو ایسا ہی کرنا ہوگا۔

میں ایک ایسی جماعت سے تعلق رکھتا ہوں جسکا عقیدہ ہے کہ جو کچھ دل میں ہو

یہی زبان پر ہو۔ اس لئے میں نے صفائی سے اپنے خیالات آپ حضرات کے سامنے پیش کئے ہیں۔ اگر اسمیں میں نے کوئی سخت بات کہی ہے تو اُسے آپ معاف کریں لیکن جو باتیں میں نے قابل عمل پیش کی ہیں اُن پر آپ لوگ وچار کریں اور عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔

مشاعرہ: جلسہ ختم ہونے کے بعد منشی چندی پرشاد شیدا کی صدارت میں مشاعرہ ہوا جس میں مصرع طرح حسب ذیل تھا:۔

'فریب خوردۂ نیرنگیٔ مجاز ہوں میں'

مصرع طرح مشکل ہونے کے باوجود مشاعرہ نہایت کامیاب رہا۔ مشاعرہ میں حضرت کیفی، منوّر، محسن اعظم گڈھی، شعری بھوپالی، نہال، وفا، امن، سحر، حکیم مدن لال، آفتاب، اثر، شائق، طالب دہلوی، حیرت شملوی، سالک، طالب، پانی پتی، اختر، اظہار، غافل، شاد، روشن وغیرہ نے شرکت فرمائی اور مشاعرہ نہایت کامیابی کے ساتھ ۶ بجے ختم ہوا۔

آخر میں منوّر صاحب نے صدر اور معزز میزبان کا شکریہ ادا کیا۔

افتخار الشعرا منشی مہاراج بہادر برق کی برسی کا جلسہ و مشاعرہ

مولوی عبدالحق صاحب کی صدارتی تقریر موثر مقالے اور نظمیں

(ماخوذ از پیج روزانہ "دہلی" مورخہ ۱۴ فروری سنہ ۱۹۴۰ء)

دہلی۔ ۱۲ فروری۔ کل بوقت دو بجے جناب ستیش چندر صاحب طالب بی اے کے مکان واقع گلی تاشان، پہاڑی بازار دہلی میں یوم برق کا جلسہ زیر صدارت ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو، شروع ہوا۔ جناب منشی لبتیشور پرشاد صاحب منور لکھنوی نے مولوی عبدالحق صاحب کا نام صدارت کے لئے تجویز کیا اور جناب ستیش چندر صاحب طالب نے اُن کی تائید کی۔ اس موقع پر متعدد مقالے پڑھے گئے اور تقریریں اور نظمیں ہوئیں۔ جناب پنڈت بالمکند صاحب عرش ملسیانی۔ بی اے اور علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی تشریف نہ لا سکے۔ اُنھوں نے اپنے مقالے بھیج دیئے تھے جو بہت دلچسپی سے سُنے گئے۔ جناب عرش ملسیانی نے اپنے مقالے میں افتخار الشعرا منشی مہاراج بہادر صاحب برق دہلوی کی اپنی ملاقات اور تعارف کا ذکر نہایت موثر انداز میں کیا تھا۔ علامہ کیفی نے برق مرحوم کی شاعری سے علم بحث کی تھی اور اردو شاعری میں انکا پایہ ظاہر کیا تھا۔

جناب پروفیسر بھگونت سروپ صاحب نے حضرت برق کے کلام کے شائع ہونے کے متعلق اپنے مقالہ میں ذکر کیا۔ جناب اشرف صبوحی نے اپنے بلند پایہ مقالہ میں یہ بیان کرنے کے بعد کہ شاعری میں کن کن عناصر کی ضرورت ہے، برق مرحوم کے کلام کے نمونے پیش کر کے یہ دکھایا کہ وہ ایک مکمل شاعر تھے۔

جناب مجاز بی۔ اے (علیگ) نے اپنی تقریر میں فرمایا "برق صاحب جتنے اچھے شاعر تھے، اُتنے ہی اچھے انسان تھے۔ آپ نے برق صاحب سے ملاقات کے چند حالات بھی بیان فرمائے اور یہ اپیل کی کہ یوم برق کو محض اُن کی یاد تک محدود نہ کیا جائے بلکہ اُن کی تقلید کی جانب قدم بڑھایا جائے۔

جناب لالہ انوپ چند صاحب آفتاب، رئیس پانی پت اور مسٹر کالیچرن صاحب اثر نے حضرت برق مرحوم کے متعلق نظمیں پڑھیں۔ حضرت آغا شاعر کا پیغام، اُن کے صاحبزادے جناب آغا آفتاب بی اے نے پڑھ کر سُنایا

مولوی عبدالحق صاحب کی تقریر

جناب مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی مختصر تقریر میں فرمایا "انسان پر دو طرح کے اثرات پڑتے ہیں۔ ایک تو وراثت سے اور دوسرے ماحول سے یعنی کچھ تو ہمیں پچھلی نسلوں سے ترکہ ملتا ہے اور کچھ ہمیں اپنے امور گرد و پیش سے سبق حاصل ہوتا ہے۔ تہذیب، تمدن اور ادب و شاعری پر بھی یہی اصول عائد ہوتا ہے۔ ہمیں جو ورثہ ملا ہے اس کو محفوظ رکھنا ہی ہمارا فرض نہیں ہے بلکہ اُسے

ترقی دینا بھی ہمارا فرض ہے جو فنا کی نشانی ہے۔ اگر ہم نے اس ذخیرہ یا سرمایہ کو ترقی نہ دی جو ہم نے حاصل کیا ہے تو یقیناً وہ فنا ہو جائے گا۔ ترقی زندگی کی علامت ہے۔ جوانمرگ شاعر برق مرحوم نے جو نقش چھوڑا ہے، اُسے آپ لوگ ترقی دیں۔ برق صاحب کا مجموعہ غزلیات ضرور شائع ہونا چاہیے

اس تقریر کے بعد منشی گوپی ناتھ صاحب امن لکھنوی نے صدر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور ساڑھے تین بجے مشاعرہ شروع ہوا۔

بزم مشاعرہ :۔ مشاعرہ کی صدارت کے لئے جناب طالب صاحب نے ڈاکٹر سعید احمد صاحب سعید بریلوی کا نام تجویز کیا اور عوام نے اس کی تائید کی۔ ڈاکٹر صاحب کے کرسئ صدارت پر رونق افروز ہونے کے بعد میزبان جلسہ جناب طالب صاحب کی غزل سے مشاعرہ کی ابتدا ہوئی۔ تقریباً دو گھنٹے تک صدارت کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنی نظم پڑھ کر تشریف لے گئے اور بقیہ مشاعرہ جناب منشی گوپی ناتھ صاحب امن کی صدارت میں ہوا۔ مشاعرہ میں مقامی شعرا کے علاوہ باہر سے بھی کئی شعرا بغرض شرکت تشریف لائے تھے جنھوں نے اپنا کلام پڑھکر سنایا۔ جناب مجاز صاحب بوجہ علالت اپنا کلام سنائے بغیر چلے گئے۔

باہر سے شریک ہونے والوں میں جناب آفتاب پانی پتی، جناب شکر پانی پتی، اور جناب موہن لال صاحب شفق ہاپوڑی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مقامی شعرا میں حضرات شیدا، منور، کیفی، نہال، نسیم، وفا، اختر، سنبل، ماہر، غافل، آذر، بسمل، اظہار، ظریف، ناز، سحر، ناظم، روشن، تمنا وطاہر وغیرہ نے اپنے اپنے کلام سنائے۔ شام کے وقت چائے نوشی کے بعد صحبت پھر گرم ہوئی۔ سات بجے کے بعد تک مشاعرہ جاری رہا۔ آخر میں جناب منور لکھنوی نے صاحبِ صدر اور جناب طالب صاحب کا شکریہ ادا کیا اور مشاعرہ برخاست ہوا۔ اس بار جلسہ اور مشاعرہ پچھلے برسوں سے زیادہ کامیاب رہا۔

یوم برق

(ماخوذ از 'ہماری زبان' دہلی۔ مورخہ یکم مارچ ۱۹۴۱ء)

منشی مہاراج بہادر برق دہلوی اُردو کے ایک مشاق اور بڑے ہونہار شاعر تھے ۱۹۳۶ء میں اُن کا یکایک انتقال ہو گیا۔ اُن کے عزیز طالب دہلوی اُن کی یادگار میں ہر سال ایک جلسہ منعقد کرتے ہیں۔ امسال یہ جلسہ ۱۱ فروری۔ گلی تاشان بازار چاوڑی دہلی میں طالب صاحب کے قیام گاہ پر منایا گیا۔ محترمی مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو (ہند) نے صدارت فرمائی۔

برقی مرحوم کے کلام اور سیرت پر کئی مقالات پڑھے گئے جن میں پروفیسر

عہ: آپ کا جام حیات ۱۹۴۳ء میں لبریز ہو گیا۔

بھگوت سروپ ایم اے دہلوی اور حضرت اشرف صبوحی صاحب دہلوی کے مقالے بہت دلچسپ اور جامع تھے۔ اسرار الحق صاحب مجاز نے تقریر کی۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی اور پنڈت بالمکند عرش ملسیانی کے پیغام بھی پڑھے گئے۔ اخیر میں جناب صدر نے تقریر کی۔ اُنھوں نے حاضرین جلسہ کو بتایا کہ ہمیں نہ صرف اپنے بزرگوں کے ادبی ورثہ کو قائم رکھنا چاہئے بلکہ اُسمیں مناسب اضافہ بھی کرتے رہنا چاہئے کیونکہ اس کے بغیر کوئی زبان یا ادب زندہ نہیں رہ سکتا۔

جلسہ کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ طرحی اور غیر طرحی غزلیں پڑھی گئیں۔ نظم کا بھی دَور چلا۔ دلّی اور اطراف کے شعرا نے شرکت کی۔ مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔ منوّر لکھنوی، امن لکھنوی، ضیا فتح آبادی، نہال سیوہاروی، اور اختر بریلوی وغیرہ حضرات کی غزلوں پر خوب داد ملی۔

اس جلسہ میں یہ تجویز منظور کی گئی کہ برق کا غیر مطبوعہ کلام جلد سے جلد شائع کیا جائے۔ اس کے لئے عملی کوشش بھی شروع ہو گئی ہے۔

یوم برق کا جلسہ

(تیج روزانہ، دہلی، مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۴۱ء سے ماخوذ)

دہلی۔ ۱۲ فروری۔ کل ڈھائی بجے بعد دوپہر جناب ستیش چند صاحب طالب

بی۔اے کے مکان پر افتخار الشعراء منشی مہاراج بہادر صاحب برق کی پانچویں برسی منائی گئی جسکی صدارت علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے فرمائی۔ پنڈت جی کی تشریف آوری میں کچھ دیر ہوئی۔ اس عرصہ میں جناب ڈاکٹر سید احمد صاحب سعید بریلوی نے صدارت کے فرائض انجام دئے

سب سے پہلے جنابِ صدر کی اجازت سے حضرتِ طالب نے منشی چند بھان کیفی کی وفات پر حسب ذیل ریزولیوشن پیش کیا جو اتفاق رائے سے منظور ہوا:۔

تعزیتی ریزولیوشن

یوم برق کے یادگاری جلسہ میں اُردو زبان کے شاعروں اور ادیبوں کا یہ اجتماع دہلی کے مشہور و معروف شاعر منشی چند ربھان صاحب کیفی کی وفات حسرت آیات پر دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور افسوس کرتا ہے کہ جناب کیفی کی دائمی جدائی نے ہم سے اُردو زبان کا ایک نغزگو اور ندرت پسند شاعر چھین لیا ہے۔

اس اجتماع کی شائستہ سبھا دہلی سے یہ درخواست ہے کہ وہ جلد از جلد مرحوم کے کلام کی طباعت و اشاعت فرمائے۔

اس سبھا نے مرحوم کی زندگی میں آپ کا کلام شائع کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اظہارِ تعزیت کی اس تجویز کی ایک نقل مرحوم حضرت کیفی کے پسماندگان کی خدمت میں اور ایک نقل مقامی پریس کو بغرض اشاعت بھیجنا ضروری قرار دیا گیا۔

اس کے بعد جناب طالب صاحب نے جناب بالمکند صاحب عرش ملیانی، ابوالفصاحت جناب لبھورام صاحب جوش ملسیانی، جناب تشنہ رام موہن لال صاحب جگر بریلوی، جناب گوبرسرن صاحب ادیب لکھنوی اور جناب جگ جیون لال صاحب بھٹناگر کے پیغامات پڑھے۔

مقالے:- سب سے پہلے خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی نے اپنا مقالہ پڑھا جس میں اُردو زبان پر اور اس کے بعد اُردو شاعری پر تبصرہ کیا گیا تھا اور اُردو شاعری کے رُخ بدلنے والوں میں برق مرحوم کا مرتبہ ظاہر کیا گیا تھا

پروفیسر آنند ناتھ صاحب نے برق مرحوم کی شاعری کے متعلق ایک مقالہ پڑھا۔

ڈاکٹر سعید احمد صاحب نے اُن اعتراضات کا جواب دیا جو بد مذاق نقادوں نے برق مرحوم کے کلام پر کئے ہیں۔

آخر میں علامہ کیفی نے اپنی صدارتی تقریر فرمائی جس میں آپ نے فرمایا کہ برق صاحب کے کلام میں داخلی خارجیت پائی جاتی ہے۔

جناب آغا آفتاب کے مختصر مقالے کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔

مشاعرہ کا آغاز جناب طالب کی غزل سے ہوا۔ طرحی غزلیں پڑھنے والوں میں حضرت اثر، گوہر، کیلاش، آفتاب، شاد، روشن دہلوی، روشن پانی پتی، دفا، غافل، اظہار، امن، کشور، زار صدیقی، شاعر مستے طرحی غزلیں

ختم ہونے کے بعد حضرت ساحر دھلوی تشریف لے گئے۔ نواب سائل صاحب نے بوجہ محرم غزل نہ فرمائی لیکن تشریف آوری سے ممنون فرمایا۔

غیر طرحی کلام ہندی میں شری کرونیش جی نے سنایا اور اردو میں حضرات تاجور، سحر، منتظر بلند شہری، ارشد، حکیم ماہر، نہال، سعید و صاحب صدر نے اپنا کلام سنایا جلسہ ساڑھے سات بجے ختم ہوا۔

جلسہ میں شریک ہونے والے حضرات میں ایڈیٹر ساقی، پروفیسر عاقل، منشی شیونرائن بھٹناگر، جناب اشرف صبوحی اور پروفیسر بھگوت سروپ صاحب کے نام نامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

یوم برق

(اتالیق' لاہور۔ بابتہ ماہ اپریل ۱۹۴۲ء سے ماخوذ)

منشی مہاراج بہادر برق دہلوی مرحوم کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اُن کے نیاز مندان اور شاگردان رشید ہر سال دھلی میں یوم برق نہایت تزک و احتشام سے مناتے ہیں اور اس طرح نہ صرف وہ مرحوم کی یاد تازہ کرتے ہیں اور اردو علم و ادب کی بے لاگ خدمات کے لئے مرحوم کو خراج تحسین ادا کرتے ہیں بلکہ اوروں کے دلوں میں علم و ادب کی خدمت کے لئے جوش اور سرگرمی پیدا کرتے ہیں۔ امسال دہلی میں برق ڈے علامہ پنڈت برجموہن

دتاتریہ کیفی بی۔اے دھلوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔

حضرت بشیشور پرشاد صاحب منور لکھنوی، منشی گوپی ناتھ صاحب امن لکھنوی جوائینٹ ایڈیٹر روزانہ تیج دہلی اور جناب شاہد احمد صاحب بی اے آنرز ایڈیٹر ساقی دہلی نے حضرت برق کے متعلق پر از واقفیت مقالے پڑھے۔ اس کے بعد مشہور افسانہ نگار جناب جگجیون لال صاحب بھٹنا گر بی۔اے اور خواجہ محمد شفیع بی۔اے نے مختصر تقاریر کیں۔ حضرت شوق نے سہسوان اور جناب شگن چند صاحب روشن بی اے، ایل، ایل بی وکیل بے پانی پت سے اس موقعہ کے لئے خاص نظمیں ارسال فرمائیں۔

جلسہ کی کارروائی جو نہایت دلچسپ تھی قریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی اس کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ اس میں درج ذیل شعرا نے شرکت فرمائی

جناب پنڈت امرناتھ ساحر، منشی بشیشور پرشاد صاحب منور، منشی گوپی ناتھ صاحب امن، علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، پنڈت بالمکند صاحب عرش، جناب نہال سیوہاردی، جناب ضیا فتح آبادی، حضرت اسد ملتانی جناب حیرت شملوی وغیرہ۔

نواب سراج الدین صاحب سائل دہلوی اپنی علالت کے باعث تشریف نہ لا سکے لیکن انھوں نے مشاعرہ کے لئے طرحی غزل ارسال فرمائی جو پڑھ کر سنائی گئی۔

بیرونجات سے آنے والے حضرات میں سے جناب انوپ چند صاحب آفتاب پانی پتی اور حضرت پدم سین صاحب گوہر پانی پتی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

غیر طرحی کلام بھی پڑھا گیا۔

یہ پُر لطف نشست قریب اڑھائی بجے دن سے شروع ہو کر ½ ۸ بجے شب تک جاری رہی۔ حاضرین کی تعداد کا اندازہ تین صد اصحاب پر مشتمل تھا۔

ریویوز

چند اخبارات نے غالباً 'دیر آید درست آید' کے مقولے پر کاربند ہوتے ہوئے اب 'حرفِ ناتمام' پر زحمتِ تبصرہ فرمائی۔ یہ تبصرات شکریہ کے ساتھ درجِ ذیل کئے جاتے ہیں:-

طالب۔ دہلوی

"ریاست" ویکلی۔ دہلی مورخہ ۲۱ اگست ۱۹۴۴ء

یہ کتاب مرحوم منشی مہاراج بہادر برقؔ دہلوی کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ برقؔ بہت اچھے شعرا میں شمار کئے جاتے تھے۔ یہ مجموعہ پبلک کی قدردانی کا مستحق ہے۔ اسکی بعض قومی نظمیں ملک میں زندگی پیدا کرنیکا باعث ہو سکتی ہیں۔

"شانِ ہند" ویکلی ملتان چھاؤنی۔ مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۴ء

شعر و ادب سے کچھ بھی واقفیت رکھنے والا برقؔ مرحوم کے نام و کلام سے ضرور واقف ہوگا۔ برقؔ کا کلام تصوف کا سرچشمہ، حقائق و معارف کا گنجینہ، عشق و وفا کا پیغام، اور روحانیت کا لبریز جام ہے۔ 'حرفِ ناتمام' تراکیب و استعارات، تشبیہات اور صنائع لفظی و معنوی کا وہ دلفریب مرقع ہے کہ آنکھ دیکھکر سیر نہیں ہوتی۔ اسکے مطالعے سے زبان کا اصل لطف حاصل ہوتا ہے اور روح وجد میں آ جاتی ہے۔ فی الحقیقت یہ مجموعہ ادبی مذاق رکھنے والے اصحاب کیلئے نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔

برق مرحوم کی یاد میں

حضرت منیر

پھر برق کو اربابِ نظر روتے ہیں
دل روتے ہیں خلقت کے جگر روتے ہیں
سرچشمۂ انوارِ معانی تھا وہ
ہم ایک طرف شمس و قمر روتے ہیں

جناب باوا کرشن گوپال صاحب مغموم بی اے کیتھلوی

مجموعۂ کمالات کا ذات اُس کی تھی
دراصل سخن سنجوں میں بات اُس کی تھی
پُتلا تھا وہ اخلاص و وفا کا مغموم
سرمایۂ تفاخر کا حیات اُس کی تھی

دانندۂ اسرارِ معانی تھا برق
آگاہِ دیارِ ہمہ دانی تھا برق
نطق اُسکا تھا اسرار کُشائے فطرت
اسلافِ ہنر ور کی نشانی تھا برق

اک عمر سے برباد سکونِ دل ہے
افزائش غم و جبر جنونِ دل ہے
یاد آتا ہے یوں برق کا مرنا مغموم
جیسے کوئی ناسور درونِ دل ہے

درج ذیل طرحی غزلیں دیر سے موصول ہوئی ہیں، لہذا اب شائع کی جاتی ہیں۔ بقافیہ :۔ شاد، آباد۔ وغیرہ۔

جناب مہر لال سونی ضیا ایم اے فتح آبادی

توقع شادمانی کی دلِ ناشاد رکھتا ہے
اُمیدوں پر بنائے عشرت برباد رکھتا ہے

یہاں تُو نے یہ میں نے گیت آزادی کا کیوں چھیڑا
عداوت مجھ سے صرف اسبات پر صیاد رکھتا ہے

خدا کا شکر ہے کوئی کچل سکتا نہیں اسکو
ہمارا ذوقِ آزادی ہمیں آزاد رکھتا ہے

نہ جانے ابنِ آدم کب جہاں میں مطمئن ہوگا
جسے دیکھو وہ شغلِ نالہ و فریاد رکھتا ہے

نہ ہو مجبور کوئی یہ تو سب کہنے کی باتیں ہیں
نہ کوئی یاد رہتا ہے نہ کوئی یاد رکھتا ہے

یہی تیری سزا ہے مجھکو جا کر بھولنے والے
تجھے میرا دلِ محزوں ہمیشہ یاد رکھتا ہے

ضیا کی قدر کر اے پائمالِ نقصِ محکومی
کہ یہ بندہ خدا کا فطرتِ آزاد رکھتا ہے

جناب کوراج رگھنندن سنگھ صاحب طاہر دہلوی

نہ پوچھو کیا تمہارا عاشقِ ناشاد رکھتا ہے
جگر میں درد، دل میں حسرتِ فریاد رکھتا ہے

برائی گرچہ وہ کرتا ہے میری غیر کے آگے
مگر یہ پھر غنیمت ہے کہ مجھ کو یاد رکھتا ہے

کلیجہ چیر کر داغِ جگر دیکھے، یہاں آئے
اگر کچھ حوصلہ وہ بانیٔ بیداد رکھتا ہے

ہوس اس کی بشر کے دل سے جیتے جی نہیں جاتی
عجب نیرنگیاں کچھ عالمِ اسباب رکھتا ہے

جناب منشی سید عبدالعلی صاحب اظہرؔ سہوانی

ازل میں جس کو دیکھا تھا ابد میں اس کو پہچانا
یہ دل بھولا نہیں کرتا غضب کی یاد رکھتا ہے

وہ تالیفِ قلوبِ اہلِ الفت کر کے کیا لیتے
گذر جاتی ہے جو دل پر اسے دل یاد رکھتا ہے

محبت میں ہزاروں واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں
بھلانا چاہتے ہیں ہم مگر دل یاد رکھتا ہے

نگاہوں نے بنکر سیکڑوں نقشے مٹا ڈالے
وہی نقشہ نہیں مٹتا جسے دل یاد رکھتا ہے

باب هفتم

نگاہِ اولین

دہلی کے سکسینہ کائستھوں نے اپنے مورثِ اعلیٰ سری چترگپت جی مہاراج کے نام پر سنہ ۱۹۰۲ء میں سری چترگپت سبھا کا آغاز کیا۔ سبھا مذکور سوشل ریفارم کے کاموں میں پیش پیش رہی۔ اس کے ہاتھوں بیواؤں کی سرپرستی، مضر رسومات کا انسداد اور نونہالانِ قوم کی تربیت و تعلیم کے پروگرام کی تکمیل ہوئی۔ اس کی موجودہ سرگرمیوں میں اسکا سالانہ جلسہ و ڈرامہ، بھیا دوج کا پنکھا اور رام لیلا کے موقعے پر اہلِ برادری کے لئے خیموں کے انتظام کو نمایاں درجہ حاصل ہے۔

سبھا ایک قابلِ رشک عالیشان بلڈنگ کی مالک ہے۔ غالباً کسی دوسرے سماجی ادارے کو اس پایہ کی شاندار عمارت کی ملکیت کا فخر حاصل نہیں۔ یہاں سکسینہ برادری کی براتوں کو ٹھہرنے کی اجازت ہے۔ بیاہ شادی کے موقعوں پر طرفین کو فرش وفروش وظروف ودیگر متفرق سامان فراہم کیا جاتا ہے اور ہر امکانی سہولیت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ اسے گاہے گاہے بطور دھرم شالہ کے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ المختصر اس سبھا کا وجود قوم کے حق میں باعثِ غنیمت ہے۔

اُستاذی مرحوم افتخارالشعرا حضرت برق دہلوی اس سبھا کے سرگرم کارکنوں میں سے تھے۔ آپکا شمار سبھا کے قدیم ترین ممبروں میں ہے۔ سبھا کا سنگِ بنیاد

آپ اور آپ جیسے دیگر مخلص قوم پرست اصحاب کے ہاتھوں رکھا گیا۔ آپ کی قومی نظموں سے سبھا کے جلسوں میں نئی زندگی کی لہر دوڑ جایا کرتی۔ آپکی تقاریر کا سحر، وہ محفل پر چھا جانے والے انداز، وہ برمحل فقرے، وہ ساکت کردینے والے دلائل وہ میٹھی چٹکیاں، وہ حاضر جوابیاں اگرچہ آج محض خواب و خیال ہیں لیکن اپنے وسیع دامن میں ایسی ایسی شیریں اور ناقابلِ فراموش یادیں سمیٹے ہوئے ہیں کہ بے ساختہ دلوں کو تڑپا دیتی ہیں۔

آپ کی بے وقت دائمی جدائی کا سبھا والوں کو جسقدر بھی صدمہ ہو، کم ہے یہ وہ قومی نقصان ہے جو ناقابلِ تلافی ہے۔ یوں غیر متوقع طور پر آپکا یکایک ہم سے جدا ہو جانا قومی ادبار کی علامت ہے اور ایک ایسے خلا کے پیدا ہو جانے کے مترادف جسکے پُر ہونے کی بظاہر کوئی صورت نہیں۔ بقول

یہ ہے وہ زخم جو مرہم کا طلبگار نہیں (چکبست)

اُس عقیدت محبت اور عزو احترام کے ملحوظ خاطر جو ہر سبھائی آج بھی اُستادِی مرحوم کے لئے محسوس کرتا ہے، سبھا والوں نے برق لائبریری قائم کی، اعزازی سینما شو دئے جنکی آمدنی 'برق فنڈ' کو منتقل کردی گئی اور ۹ جنوری ۱۹۴۲ء کی شب کو علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی۔ دہلوی کے زیرِ صدارت اپنے محبوب و محسن قومی شاعر کو نذرِ عقیدت گذاری۔ مرحوم کی تصویر کی نقاب کشائی کی رسم پنڈت جی موصوف کے مبارک ہاتھوں ادا ہوئی۔ زاں بعد جلسہ اور پھر مشاعرہ ہوا۔ اس باب میں اس جلسہ و مشاعرہ کی تفصیلات درج ہیں۔ اہلِ ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ طالب دہلوی

صدارتی ایڈریس

(علامہ عصر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی)

سری چتر گپت سبھا کے کارکنوں کا میں دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے مجکو یہ امتیاز بخشنا مناسب سمجھا کہ آج اس معزز مجمع میں برق مرحوم کی تصویر کی نقاب کشائی کی رسم ادا کروں۔

برق! آہ برق! یہ پیارا لفظ زبان پر آتے ہی دل پر قبضہ کرنے کو مختلف جذبات مچل پڑتے ہیں۔ ایک طرف اسکی دائمی جدائی اور بے وقت موت کے غم کی آگ شعلے بھڑکاتی ہے۔ ایک طرف ادب اور شعر کا بین ماتم کا شور اٹھاتا ہے ایک طرف یہ دیکھکر کہ اہلِ ادب اور صاحبِ ذوق برق کی سخن سنجی۔ فصیح گوئی اور شاعری کے کمال کی سچے دل سے داد دے رہے ہیں اور اربابِ وطن کے سامنے زندۂ جاوید برق کے کلام سے اور اسکی مغفرانہ یاد سے یہ یقین دلا رہے ہیں کہ اگرچہ وہ نغز گفتار آج ہم میں نہیں لیکن اسکا کلام اور کمال اب بھی بشیر افروزی کر رہا ہے اور میں کہتا ہوں کرتا رہے گا۔

جیسا کہ میں پہلے ایک موقعہ پر کہہ چکا ہوں برق مرحوم صاحبِ طرز تھے ان کی زبردست انفرادیت تھی۔ غزل ہو یا نظم۔ کرشن لیلا ہو یا گوہاٹ کا معاملہ۔ رانا پرتاپ ہو یا شباب کی یاد۔ غرضکہ موضوع داخلی نوعیت کا ہو یا خارجی کچھ ہی ہو

تخئیل کو تغزل میں سمو دینا کلام کو موثر اور دلچسپ بنانا۔ اسلوب کو شستہ اور برجستہ رکھنا غرضیکہ موضوع کچھ ہی ہو فصاحت کے پھول کھلا دینا برق مرحوم کی سخن سنجی کا کمال تھا۔ اُن کی زبان دلّی کی زبان۔ اُنکی تنقید ادیبانہ تنقید اور ان کی غزل شاعرانہ اور متصوفانہ ہوتی تھی۔ ان کا کلام شعریت سے مالا مال اور ساحرانہ الہام سے سرفراز تھا۔

میں نے مرحوم کو اہلِ ذوق کی منتخب اور غیر رسمی صحبتوں میں بھی دیکھا ہے ان کی تیز فہمی اور ذکاوت۔ زود گوئی اور حاضر طبعی ایسی ہر صحبت کو چمکا دیتی تھی عام مشاعروں کی تو وہ روح رواں تھے۔

اُنھیں اس تھوڑی عمر میں مکروہاتِ زندگی کا بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن اُنھوں نے کبھی حوصلے کو ہاتھ سے نہ دیا اور زمانے کے گرم و سرد کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے کہا تو صرف یہ کہا:-

بیٹھا ہوں پردہ دارئے طوفاں کیے ہوئے
اشکوں کو ضبط تا سرِ مژگاں کیے ہوئے

ایک مرنجانِ مرنج متوکل اور شاکر ہستی سخت سے سخت سانحۂ حیات کے موقع پر یہی کہہ سکتی ہے جو اُنھوں نے کہا:-

یہ کیا نیرنگ ہے اے انقلابِ عالمِ فانی
کہ آزادِ ازل ہے گردشِ دوراں کا زندانی

ہستی بے بود اور واجب الوجود کے مسئلے پر برق کی نظر غائر تھی چونکہ خاص اور عام

دونوں ان کے مخاطب تھے۔ اور دونوں کو سمجھانے کا ایک ہی طریق کارآمد نہیں ہوسکتا اس لئے عام کو تو انھوں نے فلسفۂ ہست و عدم کا باریک مسئلہ اس طرح سمجھایا۔ فرماتے ہیں:۔

ہستئ قطرہ ہو جیسے بحرِ بایاں میں گم
یوں وصلِ شاہد و مشہود ہونا چاہیئے

یہ محض ایک مشورہ ہے اور مدعا جو اکثر متصوفانہ کلام کا عیب ہوتا ہے اس میں نام کو نہیں۔ لیکن یہی مسئلہ خواص کے سامنے اس استفہامی ادا سے پیش کرتے ہیں اور ان کے غور و فکر کو عمل کی دعوت دیتے ہیں:۔

کیوں حجابِ ماسوا ہے مانعِ ذوقِ نظر
فاش رازِ ہستئ بے بود ہونا چاہیئے

برقؔ مرحوم اگرچہ زمانے کے ساتھ مذاقِ سخن کے انقلابات سے بے خبر نہ تھے اور اپنے کلام میں ایسے جوہر چھوڑ گئے ہیں جو مستقبل میں ہمیشہ اپنی چمک دمک دکھلاتے رہیں گے لیکن وہ جدت کی دھن میں شعریت اور کلاسیکل لطافت و نغزیت کا ہر کہیں خیال رکھتے تھے۔ زمانہ اور بہت کچھ کروٹیں بدلے گا نئے نئے رنگ سخن کی سطح پر کھلائے گا۔ یہ سب کچھ ہوگا مگر برقؔ اپنے کلام سے ہمیشہ زندہ رہے گا کیونکہ وہ فطری شاعر تھا۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ حقیقی شاعری کا جو تحفہ برقؔ نے کیا ہے اور شاعر کے حق میں جو کچھ کہا ہے وہ خود برقؔ پر صادق آتا ہے:۔

پردہ بردارِ رُخِ شاہدِ فطرت ہے یہی — مظہرِ جلوۂ انوارِ حقیقت ہے یہی
رہبرِ منزلِ عرفان و طریقت ہے یہی — ساقیٔ کیف فروشِ مئے وحدت ہے یہی

اس کے وجد آفریں نغموں سے جہاں وجد میں ہے
رقص میں قلبِ تپاں، روحِ رواں وجد میں ہے

صدارتی نظم

علامۂ عصر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی۔ دہلوی

جمع ہم سب آج جس تقریب میں ہیں شام کو — ہے تعلق اسکا ایسے شخص کے اس نام سے
معترف ہے جسکے رشحاتِ قلم کا کل جہاں — جاگ اٹھا شعر جسکے جادوئے ارقام سے
کون وہ شخص؟ اہلِ محفل! ہے وہ جنت آشیاں — اک جہاں واقف ہے جسکے نام سے اور کام سے
تھا سخن جسکا فصاحت اور بلاغت سے بھرا — تھا تصنع سے بری۔ اور فیض یاب الہام سے
بجلیاں دل میں بھری تھیں سر میں تھا جوشِ وطن — حُب اُسے یکساں تھی ہندو دھرم سے اسلام سے
نظم کا انداز ایسا روح افزا دلپذیر — جو خراجِ داد لیتا خاص سے اور عام سے
شعر نے اسکے جو تازہ جاں ادب میں ڈالدی — دل پھڑک اٹھے وطن کے برق کے پیغام سے
اسکے اوصافِ حمیدہ یاد آجاتے ہیں جب — تو بھر آتا ہے دل اپنا شدتِ آلام سے
اسکی ہی تمثیل کی پردہ کشائی کی ہے رسم — آج آنا تھا یہ دن بھی گردشِ ایام سے
جسکی بہجت جسکے شعر و نثر سے محظوظ تھے — آج کو کچھ آئے تم اسکی یاد اسکے نام سے

چاہیے سب مل کے زندہ رکھو اسکے نام کو
نام سے مطلب نہ ہو اور کام رکھو کام سے

مشاعرہ

مصرع طرح :- برق بیتاب نشیمن سے گریزاں کیوں ہو

جناب خادم علی خاں اختر اکبرآبادی

خاک مشغوف ہو اور اس پہ چہرہ اغماں کیوں ہو
مٹنے والے کی یہ تصویر نمایاں کیوں ہو

کیوں ہو صیاد اسیروں پہ یہ احساں کیوں ہو
یہ قفس ہے تو پھر آنکھوں میں گلستاں کیوں ہو

خونِ ارماں نہ ہو جب تک کوئی ارماں کیوں ہو
جس پہ نشتر نہ ترا ہو، وہ رگِ جاں کیوں ہو

موت کی ہم نے محبت میں دعا مانگی تھی
تم محبت کا صلہ دے کے پشیماں کیوں ہو

جنھیں اب تعلق فلک کا ابھی ہوش نہیں
رہگذر اُن کی سرِ گورِ غریباں کیوں ہو

جس کا انجام سکوں ہو وہ قیامت کیسی
جو قیامت میں نکل جائے وہ ارماں کیوں ہو

زندگی درد کو کہتے ہیں محبت والے
درد کا نام محبت ہے تو درماں کیوں ہو

عشق کو حسن کے صدقے کیلئے رہنے دے
دل پریشاں ہو، تری زلف پریشاں کیوں ہو

ہم اگر جرمِ محبت کے سزاوار نہیں
تو یہ معصوم نظر حشر بداماں کیوں ہو

آدمیت ہی سے ہے قدرِ مراتب اختر
آدمیت نہ ہو جس میں وہ انساں کیوں ہو

جناب کالیچرن صاحب اختر دہلوی

رابطہ حسن و محبت میں ازل سے ورنہ — جو نہیں پیشِ نظر دل کا وہ ارماں کیوں ہو
یہ بھی معیار ہے کچھ بادیہ پیمائی کا — جذب تلووں میں ہر اک خار بیاباں کیوں ہو
اللہ ذوقِ نظر اللہ رے شوقِ نظر — جو ہے خود آئینہ وہ آئینہ ساماں کیوں ہو
خلشِ خار سے جینے کا مزا لیتا ہوں — تجھے گل باعثِ آزارِ دل و جاں کیوں ہو

اختیار ایک نئی راہ نہ کیوں کی جائے
جو زمانے کا ہے اپنا وہی ایماں کیوں ہو

جناب آفاق حسین صاحب آفاق دہلوی

یہ تفاوت مری قسمت سے نمایاں کیوں ہو — زندگی دے کے مجھے موت کا ساماں کیوں ہو
بیوفائی کی شکایت کسی عنواں کیوں ہو — خونِ ارماں نہیں منظور تو ارماں کیوں ہو

اشکِ خونیں سے عیاں جذبۂ پنہاں کیوں ہو
دل کا جو راز ہو آنکھوں سے نمایاں کیوں ہو

جناب انوپ چند صاحب آفتاب پانی پتی

ہائے سینہ کی بھی اغیار کے بیحد قیمت — ہم غریبوں کا مگر خون بھی ارزاں کیوں ہو

جناب رشی رام صاحب تمنا۔ دہلوی

گردش چرخ ہی کافی ہے مٹا دینے کو
چار تنکوں کیلئے برق پریشاں کیوں ہو

جناب رام نرائن صاحب جگر۔ دہلوی

خون پینے میں اسے بھی تو مزا آتا ہے
تیر کیلئے سرِ جدا آپ کا پیکاں کیوں ہو
ضبط نے روک دیا اشکوں کی طغیانی کو
رازِ پنہاں مری آنکھوں سے نمایاں کیوں ہو

ادیب الملک رئیس التحریر جناب نواب خواجہ محمد شفیع بی۔ اے دھلوی

گلشن دہر میں کچھ اور نواسنج بھی ہیں
ہم صفیرو مری قسمت ہی میں زنداں کیوں ہو
جبکہ گلزار میں نذر گل کا نشاں تک بھی نہیں
پھر مرے باغ پہ فرہنگ نگہباں کیوں ہو
چھوڑ دو مجھکو مرے حال پہ بس جاؤ بھی
میرے باوشے مری جان پریشاں کیوں ہو

جناب شگن چند صاحب روشن بی۔ اے ایل ایل بی پانی پتی

زندگی درد ہے اس درد کا درماں کیوں ہو
تم سلامت رہو مشکل مری آساں کیوں ہو
آج کیا یاد کوئی چاک گریباں آیا
آج مرقد پہ مری سرگریباں کیوں ہو

جناب محمد اسحٰق صاحب صابر دہلوی

عشق سے حسن کی رسوائی کا ساماں کیوں ہو — دل میں جو درد ہو چہرے سے نمایاں کیوں ہو
میرا دل آپ کے جلوے سے پریشاں کیوں ہو — آئینہ آئینے کو دیکھ کے حیراں کیوں ہو
آؤ اور حملۂ بے ہوشیِ جنوں کر جاؤ — میرے ہاتھوں سے مرا چاک گریباں کیوں ہو
شوق وہ ہے کہ جو چھا جائے تجلی بن کر — شعلۂ عشق چراغِ تہِ داماں کیوں ہو

اس کی بے مہری کا افسوس نہ کر اے صابر
بے غرض دوست بھلا صاحبِ ایماں کیوں ہو

جناب مہر لال صاحب ضیا ایم اے فتح آبادی

غم ہو یا عیش کسی کو نہیں دنیا میں ثبات — آدمی گردشِ دوراں سے پریشاں کیوں ہو
حسن کی شان کے شایاں نہیں اندازِ فریب — ہو سکے جس کی نہ تکمیل وہ پیماں کیوں ہو
میں تو خود مانگ کے لایا ہوں ازل سے اس کو — دل میں جو درد ہے اس درد کا درماں کیوں ہو
یہ معمہ نہ کسی کی بھی سمجھ میں آیا — زیست جب کچھ بھی نہیں پھر زیست کا ارماں کیوں ہو

یہی آغازِ جہاں ہے یہی انجامِ جہاں
تم ضیا کشمکشِ غم سے گریزاں کیوں ہو

جناب منشی لشیشور پرشاد صاحب منور لکھنوی

میری ہر سانس ہے اک شرطِ وفا کی تکمیل — عمر نے ساتھ دیا ہے تو گریزاں کیوں ہو
دل خود اپنے ہی لہو رنگ نہ دکھلائے یہ بہار — رنگ نے ہی کیلئے ممنونِ گلستاں کیوں ہو
جسکو اُٹھنا ہو کسی روز، وہ پردہ کیسا — جسکو پنہاں نہیں رہنا ہو، وہ پنہاں کیوں ہو
توڑنا عہدِ ازل ہم سے منظور نہیں — ترکِ ارماں سے وہ شرمندۂ ارماں کیوں ہو
کوئی تو عرضِ دعا کیلئے پنہاں رہ جائے — میری قسمت کا ہر اک حرف نمایاں کیوں ہو
مرمٹے شوق سے پروانۂ جانباز، مگر — وجہِ افسردگیٔ شمع فروزاں کیوں ہو

دلِ حسّاس پہ احساس کی تہمت تو بجا
غمِ دوراں بھی منوّر غمِ دوراں کیوں ہو

جناب نارائن داس طالب. پانی پتی

بلبل کہ باعثِ توہینِ گلستاں کیوں ہو — گُل سے نسبت نہ ہو جسکو وہ پریشاں کیوں ہو
قطرہ بنجائے خوشی سے جو دریا، تو بجا — قطرہ لیکن سببِ شورشِ طوفاں کیوں ہو

جذب ہے جلوۂ مقصود نگاہ و دل میں
کنجِ عزلت سببِ کلفت و حرماں کیوں ہو

طالب دہلوی

سُرخیٔ عرضِ طلب خونِ دل و جاں کیوں ہو — اس فسانے میں یہ رنگینیٔ عنواں کیوں ہو

جادۂ عشق میں ناکامیٔ ارماں کیوں ہو — کام دشوار جو ٹھہرا تو وہ آساں کیوں ہو

تنگ ہو ظرف اگر وسعتِ امکاں کیوں ہو — قطرہ دریا جو نہ ہو، شورشِ طوفاں کیوں ہو

اور بھی اس سے گلستاں میں بہار آئے گی — برقِ بیتاب نشیمن سے گریزاں کیوں ہو

نہ ہو انکار تو اقرار کی عظمت معلوم — کفرِ مشرب نہ ہو کوئی تو مسلماں کیوں ہو

مجھے معلوم ہے اس جنسِ گراں کی قیمت — عشق کہتے ہیں جسے جذبۂ ارزاں کیوں ہو

آپ خود اپنے خدا اور مرے آپ خدا — جو عقیدہ ہو مرا آپ کا ایماں کیوں ہو

منّتِ غیر گراں دل پہ گذرتی ہے اگر — خود بھی اپنا کوئی شرمندۂ احساں کیوں ہو

مجھے منظور ہے کچھ، آپ کا منشا کچھ اور — جو تمنّا ہو مری، غیر کا ارماں کیوں ہو

حدِ پرواز ہو کیا کوئی مقرر طالب
فکرِ جولاں مری پابستۂ جولاں کیوں ہو

حضرت نازاں لطیف جہاں آبادی

بیتے جی زندگیٔ دل کو گریزاں کیوں ہو
تو گر درد جو ہو، طالبِ درماں کیوں ہو

ہے یقیناً ہر اک ہستی میں فنا کا عنصر
ورنہ ہر صبح کو شب چاک گریباں کیوں ہو

کلمۂ فرما جو نہیں جبرِ مشیت اس میں
غم ہر اک ہستیٔ مقصود کا عنواں کیوں ہو

جستجو میں تری گم کردۂ منزل ہی سہی
طالبِ خضر مرا ذوقِ فراواں کیوں ہو

اس نے جب توڑ دئے دیر و حرم کی بر ملا
ہم کو پھر شکوۂ بے مہریٔ انساں کیوں ہو

ڈوبنا ہی ہو جسے ساحلِ عشرت کے قریب
اسکو ہر موج سے اندیشۂ طوفاں کیوں ہو

بن چکا درد ہی جب زندگیٔ دل نازاں
اُن کا ممنونِ کرم طالبِ درماں کیوں ہو

جناب دگمبر پرشاد صاحب گوہر دہلوی

مجھ پہ مائل نگۂ گردشِ دوراں کیوں ہو
تم جو چاہو تو مرا حالِ پریشاں کیوں ہو

گر حقیقت میں نہیں شامِ الم کی تمہید
ہر سحر میرے لئے چاک گریباں کیوں ہو

یہ تو ہے قسمتِ احساسِ فراواں گوہر
ہر نظر واقفِ انجامِ گلستاں کیوں ہو

باب هشتم

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

(جوش ملیح آبادی)

اب استاذی مرحوم کا وہ کلام ملاحظہ فرمائیں جو آج سے پہلے کبھی مجموعہ کی صورت میں شائع نہیں ہوا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ باعتبارِ نوعیت یہ باب سب سے زیادہ جاذبِ توجہ اور مرکزِ نگاہ ثابت ہوگا۔

"زبانِ دہلی" اور "گلدستۂ عقیدت" کے حوالے سے جو نظمیں دی جا رہی ہیں، ان کے لئے آپ کو لالہ امراؤ بہادر جین مینیجر بھارت بنک، بازار چاوڑی۔ دہلی کا شکرگزار ہونا چاہیئے۔ اسی طور پر حضرات معصوم کیتھلوی، مجاز، محمود لکھنوی، بیتاب بریلوی، طالب پانی پتی اور شائق ہنگامی اشتراکِ عمل کے لئے میرا نذرانۂ سپاس قبول فرمائیں۔

"کرشن دپین" آٹھ نظموں پر مشتمل ہے۔ برادرِ محترم حضرت طالب پانی پتی کے مشورے کے مطابق اس سے چار نظمیں اخذ کی جا رہی ہیں۔ یہ نظمیں آپ کو "مطلعِ انوار" اور "حرفِ ناتمام" میں نہیں ملینگی۔

"کرشن درپن" استاذی مرحوم کی پہلی تصنیف ہے۔ چونکہ یہ پمفلٹ کی صورت میں شائع کی گئی تھی، اس لئے زیادہ لوگوں کی نظروں سے نہیں گذری۔ ان نظموں کو عوام تک پہنچانا ضروری تھا۔ ادب میں ان نظموں کا پایہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں یہ منظومات زیادہ سے زیادہ اشاعت کی مستحق ہیں اور اسی مصلحت سے یہاں دی جارہی ہیں۔

اگر آپ کی تحویل میں ایسا کلام ہو جو "کرشن درپن"، "مطلع انوار"، "حرف ناتمام" اور اس مجموعہ میں شامل ہونے سے رہ گیا ہو تو ازراہِ ادب نوازی اسے راقم الحروف تک پہنچانے کی زحمت گوارا فرمائیں، آپ کی اس عنایت بے غایت کے لئے دل سے مشکور ہونگا۔

طالب دہلوی

برج بھومی

برج بھومی تجھ پہ ہندستاں ہو نازاں کیوں نہ ہو
اے بلادِ پاک تو مشہدِ زہاداں کیوں نہ ہو

وادیٔ ایمن ہے تو معمورۂ تنویرِ حسن
سرزمیں تیری تجلی گاہِ عرفاں کیوں نہ ہو

آہ! اے جولانگہِ برقِ جمالِ جاں فروز
بقعۂ نورِ ازل تیرا شبستاں کیوں نہ ہو

جلوۂ حسن آفریں تیرے صنم خانوں میں ہے
تو جہاں میں سجدہ گاہِ اہلِ ایماں کیوں نہ ہو

ذرّے ذرّے سے ظہورِ شانِ یکتائی ہے جب
رازِ وحدت تیری کثرت میں نمایاں کیوں نہ ہو

منزلِ خورشید ہے تو خاکدانِ دہر میں
تیری تابش سے فروغِ بزمِ امکاں کیوں نہ ہو

کیوں درخشاں ہو نہ ذرّہ ذرّہ تیری خاک کا
مطلعِ انوار ہے تو جلوہ ساماں کیوں نہ ہو

تو ہوئی ہے کرشن کے یُمنِ قدم سے سرفراز
تیرا رتبہ غیرتِ گردونِ گرداں کیوں نہ ہو

کنج گلیاں ہیں تری پُرپیچِ راہِ معرفت
تو چمن زارِ حقیقت رشکِ رضواں کیوں نہ ہو

پارہ ہائے دل نہ ہوں مژگاں میں کیوں بہرِ نثار
تیرا مشتاقِ تماشا گل بداماں کیوں نہ ہو

سلکِ سلم سے جُڑی ہے شانِ زیبائی تری
کرشن کی نگری! فدا تجھ پہ دل و جاں کیوں نہ ہو

دیدۂ معنی سے گر دیکھے کوئی جلوہ ترا
خلد سے ملتا ہوا آئے نظر نقشہ ترا

اے حجابِ چشم اٹھ! بے پردہ نظارہ دیکھ لوں — اپنی آنکھوں جلوۂ حسنِ خود آرا دیکھ لوں
سات پردوں میں جو پنہاں ہے نگاہِ شوق سے — بے حجابانہ وہ جلوہ آشکارا دیکھ لوں
برقِ ایمن بن کے جس نے پھونک ڈالا طور کو — خرمنِ ہستی پہ جلتے پر وہ شرارا دیکھ لوں
جس کے پرتو سے منور ہیں زمین و آسماں — بزمِ ہستی میں اسے ہنگامہ آرا دیکھ لوں
شمع جاں افروز ہے جو عالمِ اجسام میں — میں وہی نورِ مجسم آشکارا دیکھ لوں
دیدہ و دل میں سما جائے وہ حسنِ جانفریب — دید کا گر دے نگاہِ شوق یارا دیکھ لوں
گردشِ معکوس کر لے گردشِ ایامِ دہر — میں بچشمِ حال دواپر کا نظارا دیکھ لوں
پھر کرشن اوتار کی لیلا نظر آئے مجھے — دیکھتی آنکھوں وہی جلوہ دوبارا دیکھ لوں
برجِ بھومی کا ہو پھر عرشِ معلیٰ پر دماغ — پھر میں تینوں لوک سے متھرا کو نیارا دیکھ لوں
پھر سرور افزا صدائے نے بنے فردوسِ گوش — راس منڈل کا میں پھر دلکش نظارا دیکھ لوں
پھر گُکل جوڑی کی بانکی چھب نظر آئے مجھے — جلوہ اگن نند کی آنکھوں کا تارا دیکھ لوں
کنس مٹ جائے پر سنوں بنسی کی متوالی صدا — پھر شری جمنا کا تٹ امرت کی دھارا دیکھ لوں
پھر مہابھارت کا نقشہ ہو کھچا پیشِ نظر — بالمقابل کورو پانڈوں کو صف آرا دیکھ لوں
فلسفہ گیتا کا پھر سن لوں زبانِ پاک سے — رن میں ارجن کو کمربستہ دوبارا دیکھ لوں
دست بستہ پھر یہ مانگوں باصد عجز و نیاز — سایۂ دامانِ رحمت کا سہارا دیکھ لوں

پھر ہوئے ابرِ کرم رحمت کا دریا موج پر
پھر ہو اس اجڑے ہوئے بھارت کی قسمت اوج پر — (کرشن مدہر پیہرانوز)

بدنصیب گائے

(ماخوذ از کمال دہلی بابتہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۱۱ء)

(مرسلہ حضرت مغموم کیتھلوی)

او فتنہ ساز دیکھ جفا کاریاں نہ کر
مجھ بے گنہ کے قتل کی تیاریاں نہ کر
مجھ سے دمِ اخیر یہ عیاریاں نہ کر
میں گاؤ بے زباں ہوں ستمگاریاں نہ کر

قصاب کے سپرد نہ کر مجھ غریب کو
دم توڑنے دے اپنے ہی گھر بدنصیب کو

میرے لہو میں ہاتھ نہ بھر کینہ ساز تو
پھیلا نہ اتنا دامنِ صد حرص و آز تو
بیکس پہ کر نہ دستِ تعدی دراز تو
نیکی بدی کا سوچ نشیب و فراز تو

خواہاں نہ ہو تو ظلم رسیدہ کی جان کا
انسان ہے تو صبر نہ لے بے زبان کا

سامان قتل کا نہ مرے ناسپاس کر
خدمت گزاریوں کا مری کچھ تو پاس کر
دل میں ذرا خیال تو ناحق شناس کر
میں بھی تو جان رکھتی ہوں آخر قیاس کر

تو مرتے دم جواب نہ دے خانہ زاد کو
صدقے میں اپنے چھوڑ دے مجھ نامراد کو

کیوں زار و ناتوان کے پیچھے پڑا ہے تو؟ کیوں ہاتھ دھو کے جان کے پیچھے پڑا ہے تو
کیوں عیب بے زبان کے پیچھے پڑا ہے تو؟ دو دن کے میہمان کے پیچھے پڑا ہے تو

تو نے سر برائی نہ کی مجھکو مار کر
تیر ستم نہ میرے کلیجے کے پار کر

لے چل نہ چوک میں مجھے نیلام کیلئے کوششیں نہ کر مرے آلام کیلئے
کیا دل میں تیرے رحم نہیں نام کو بھی کیلئے؟ لیتا ہے جان کیوں طمع خام کیلئے؟

کیوں کان دھر کے تو نے [illegible] فغاں مری؟
نقش بر آب ہو گئیں سب نیکیاں مری؟

گردن پہ اپنی خون نہ لے بے گناہ کا کچھ تو خیال کر مرے حال تباہ کا
اُٹھا بلائے جان نہ ہو تجھ خیر خواہ کا ظالم! ستم بھی اچھا ہے بس راہ راہ کا

مجھکو نہ مار کشتۂ رنج و تعب ہوں میں
پیری میں فرط ضعف سے خود جاں بلب ہوں میں

کیوں بیکسی میں ساتھ مرا چھوڑتا ہے تو؟ کیوں مجھ فلک زدہ پہ ستم توڑتا ہے تو؟
کیوں میری التجاؤں سے منہ موڑتا ہے تو؟ کیوں اب بھی نصیب مرے پھوڑتا ہے تو؟

کیوں خاک ڈالتا ہے وفاؤں پہ تو مری؟
سب خدمتوں کو بھول گیا فتنہ جو مری؟

واللہ میں ہوں کے اپنے نمک خوار یاد رکھ میری وفائیں نمک خواریش یاد رکھ

برسوں پیا ہے دودھ نوش، یاد رکھ
بچپن ہی میں تھا تیرا تن و توش ہی یاد
پی پی کے میرا دودھ ہوا شیر اسقدر
پیاسا ہے خون کا مرے، اندھیر اسقدر

دیکھ اپنے منہ کو اپنے گریباں میں ڈال کر
اتنا بڑا کیا ہے تجھے میں نے پال کر
میں تیری ماں ہوں، سوچ لیں ذرا تو خیال کر
بہتر ہے اپنے ہاتھ سے مجھکو حلال کر
لیکن مجھے نہ بیچ قصائی کے ہاتھ تو
آنا دمِ اخیر تو دے میرا ساتھ تو

تو میری نیکیوں کا ذرا دل میں کر شمار
برسوں پلائی ہے تجھے اَمرت کی میں نے دھار
کڑیاں اٹھائیں لاکھ سہیں سختیاں ہزار
میں نے دیا نہ تجھکو کسی طرح زیر بار
ہر روز صبر و شکر سے کھا کر بھلا بُرا
رکھا ہے نعمتوں سے ترا گھر بھرا پُرا

بے عذر کھائی تو نے کھلائی جو خشک گھاس
جیسا ملا نصیب سے پانی، بجھائی پیاس
اس پر بھی رنج و غم کو پھٹکنے دیا نہ پاس
ہر وقت میں تو تیری منافع ہی کی ہوں آس
افسوس! محنتوں کا ملے یہ صلہ مجھے
اب بھی ترے ستم کا نہ ہوگا گلہ مجھے؟

بچھڑے نے میرے تیرے لئے ہل چلائے ہیں
اُسکے بھی دم سے کھیت ترے لہلہائے ہیں
کندھوں پہ اپنے آدمی کے بوجھ اُٹھائے ہیں
القصہ ہر طرح وہ ترے کام آئے ہیں

پھر بھی تو اُن پہ رحم نہ کھایا کسی طرح
تحسن کُشی سے باز نہ آیا کسی طرح

اب میں ہوئی ضعیف تو مور ہے عار ہے
اِک جانِ ناتواں تری گردن پہ بار ہے
مجھ خاکسار سے ترے دل میں غُبار ہے
میں کیا ہوئی اب تو مری ناگوار ہے

معذور دودھ دینے سے جو آجکل ہوں میں
بے موت، بے بسی سے شکارِ اجل ہوں میں

کیا ہاتھ تیرے آئیگا اب بیچ کر مجھے
بے فائدہ کا پہنچے گا اُلٹا ضرر مجھے
لے گا مول کوئی قصائی اگر مجھے
جیتا نہ چھوڑے گا کبھی بیدادگر مجھے

لے جائیگا وہ مجھکو کمیلے میں گھیر کر
تڑپائیگا گلے پہ چھُری پھیر پھیر کر

تجھ سے بصد نیاز ہے یہ التجا مری
دل سے بھُلا نہ اپنے گذشتہ وفا مری
گردن بلا میں تو نہ پھنسا بے خطا مری
میں جاں بلب رسیدہ ہوں تو لے دُعا مری

قصاب کی چھُری سے جو مجھکو بچائیگا
پُوتوں پھلیگا اور تو دودھوں نہائے گا

اہنسا

(گلدستۂ عقیدت سے ماخوذ)

اہنسا کیا ہے معبودِ دو عالم کی عبادت ہے
ثوابِ آخرت دنیا کی بے غرضانہ خدمت ہے
نفس کو پاک رکھنا اتقا و زہد و ریاضت ہے
سرِ تسلیم خم کرنا کمالِ عجز و طاعت ہے

گر ہے دستِ قدرت دستگیری کر غریبوں کی
کہ تجھ پر چارہ سازی فرض ہے حرماں نصیبوں کی

رہیگا تا کجا دنیا کا دلدادہ و شیدائی
کہاں تک تو رہیگا عیش و عشرت کا تمنائی
رہیگا تا کجا مشتاقِ خود بینی و خود رائی
کریگا تا کجے اندازِ معشوقی و رعنائی

ترا حسنِ دو روزہ پر عبث ہو شادماں ہونا
بہارِ خندۂ گل کو ہے پامالِ خزاں ہونا

اگر انساں ہے پرہیز کر ایذا رسانی سے
ضرر ذی روح کو پہنچے نہ تیری زندگانی سے
بجھا مظلوم کے دل کی لگی اشکوں کے پانی سے
ستم دیدہ جو ہوں پیش آ تو ان سے مہربانی سے

حکومت کا ہے خواہاں تو دلوں پر حکمرانی کر
بہارِ بے خزاں بن کر جہاں میں گلفشانی کر

کوئی روتا نظر آئے تو آنسو پونچھ دامن سے
مدد بیکس کی کر دامے درمے جان سے تن سے
دکھا ہرگز نہ دل خلقِ خدا کا مکر سے فن سے
نہ لے لے جان کسی کی تو خونخوار دشمن سے

محبت ہے تو دل تسخیر کر یہ حجِ اکبر ہے
یہ ہے وہ توشۂ اعمال جو بہتر سے بہتر ہے

تباہیٔ ہند

(افسوس کہ اس دلدوز مسدس کے صرف تین بند ہی حاصل ہو سکے جو درج ذیل ہیں)

آہ! اے ہند ہوئی خوب تباہی تیری — مل گئی خاک میں تو، مٹ گئی شاہی تیری
تیرہ بختی سے ملامت ہوئی راہی تیری — بڑھ گئی زلفِ سیہ سے بھی سیاہی تیری
خاک میں گردشِ دوراں نے ملا کر چھوڑا
نقشِ باطل کی طرح تجھ کو مٹا کر چھوڑا

دن بدن اب ہے تنزل کا زمانہ افسوس — تو ہوا تیرِ حوادث کا نشانہ، افسوس
ملک لغیلہ ہوا تیرا خزانہ افسوس — کارنامے ہوئے سب تیرے فسانہ افسوس
خاک اڑتی ہے صبا اب ترے ایوانوں میں
دفن ہیں چاند کے ٹکڑے ترے ویرانوں میں

وہ بلا کونسی ہے تجھ پہ جو نازل نہ ہوئی — بات آساں سی بھی کب تجھے مشکل نہ ہوئی
قطعِ بحرِ غم و اندوہ کی منزل نہ ہوئی — تیری طوفاں زدہ کشتی لبِ ساحل نہ ہوئی
آ کے اک بادِ خزاں تیرے چمن سے نہ گئی
جو بلا آئی وہ پھر اس چمن سے نہ گئی

مہاویر

مبارک ہو مبارک جینتی مہابیر سوامی کی   جہاں میں آج جنکی شہرت ہے جنکے نام نامی کی
زباں پر سب کی مہما ہو اہنسا کے پجاری کی   ریاضت کی صفا کی صدق کی شیریں کلامی کی

وہ جیون مکت ہیں اور زندۂ جاوید مرنے پر
ہے قائم جنکا یش پچیس صدیوں کے گذرنے پر

مہا یوگی ہیں وہ جو ستیہ کا پرچار کرتے ہیں   نفس کو جیت کر جو جگت کا اودھار کرتے ہیں
مبارک ہیں وہ جو نشکام پر اپکار کرتے ہیں   جو بنکر ناخدا اوروں کا بیڑا پار کرتے ہیں

پلٹ دیتے ہیں جو پاپوں بھرا جیون نئے سرے
کنارے پر لگا دیتے ہیں جو سنسار ساگر سے

مبارک ہیں جنہیں ہے پریم یکساں دوست دشمن سے   کبھی ایذا نہیں دیتے کسی کو کرم سے من سے
ہمیشہ پریم کی دھاریں نکلتی رہتی ہیں تن سے   تڑپ اٹھتے ہیں گر چیونٹی بھی جو جاتی ہے مرنے

مبارک ہیں جو دل میں دوسروں کا درد رکھتے ہیں
جو آنسو آنکھ میں اور لب پہ آہ سرد رکھتے ہیں

مبارک ہیں جو پہنچاتے ہیں سب کو فیض روحانی   جو ظلمت کو مٹا دیتے ہیں مثل شمع نورانی
جو تیاگی ہیں جنہیں یکساں ہے تن پوشی و عریانی   برابر ہیں نظر میں جنکی آلام و تن آسانی

نہ وہ دلشاد رہتے ہیں نہ وہ غمگین رہتے ہیں
ہمیشہ دھیان میں پرم پد کے لولین رہتے ہیں

وہ کامل ہیں ہم اسرارِ حق و باطل سمجھتے ہیں اہنسا کے مسائل عقدۂ مشکل سمجھتے ہیں
جو تیرِ معرفت اور رازِ آب و گِل سمجھتے ہیں مہرشی نے ہر کو جو خواب کی منزل سمجھتے ہیں

بڑا گہرا ہے اُن کا فلسفہ جو سیاد وادی ہیں
سمجھتے ہیں کہ کیا چیزیں ہیں فانی کیا اناوی ہیں

مبارک امن کا دنیا کو پیغام دیتے ہیں تو یہ عیش و عشرت ہر خاص و عام دیتے ہیں
جو مژدہ کامیابی کا ہمیں بے کام دیتے ہیں شرابِ معرفت کے بے طلب جو جام دیتے ہیں

بتا دیتے ہیں اصلی گیان کا آدرش کیا شے ہے
اُترتا ہی نہیں جسکا نشہ وہ کونسی مے ہے

مبارک ہیں جنہیں پرلوک کا بھی دھیان ہوتا ہے سراپا جنکا جیون دھرم پر قربان ہوتا ہے
وہی ہیں تو ہتشی جنکو سچا گیان ہوتا ہے وہ جیون مکت ہیں حاصل جنہیں نروان ہوتا ہے

مہاپرش اس جہاں میں ایسے ہی مہاویر سوامی تھے
جو ہر ذی روح کی رکھشا کے سچے دل سے حامی تھے

لڑکپن ہی سے سوامی پر تھا غلبہ یوگ کا طاری فضیلت دھرم کی پائی رہے پورن برہمچاری
سر و سامانِ دنیا سے طبیعت کو تھی بیزاری کیا ترکِ تعلق دکھشا کی کر کے تیاری

سمادھی کا لیا آنند تپ کر کے گئے بن میں
کیا نج روپ کا دیدار خود ایکانت سیون میں

لب اعجاز سے سب کو دیا مژدہ اہنسا کا بجایا ڈنکا ہستی میں ڈنکا جیو رکشا کا
کیا پرچار ہر سو دھرم کا اور ستیہ ودیا کا دیا پیغام اُشانتی کو ذی روحوں کی سیوا کا

کلیوں کو مشکبو شانتی کی لہر پھیلادی
شانتی برق دنیائے سر طرف پھیلادی

(ماخوذ از گلدستۂ عقیدت)

بھگت ریداس

(از زمانہ - بابتہ جنوری سنہ ۱۹۳۴ء)

بھگت ریداس کہ پیاسے تھے مئے عرفاں کے — جستجو رکھتے تھے اک مرشد کامل کی مدام
ذات کے تھے یہ مگر شومیٔ قسمت سے چمار — ان کو چھونے کے بھی قابل نہ سمجھتے تھے عوام
اہل دنیا نے ہری بھگت کو سمجھا تھا اچھوت — دور ہی دور سے کرتا تھا جو کرتا تھا کلام
ناشناسوں کی نظر ظاہری اسباب پہ تھی — آشنا رازِ حقیقت سے نہ تھے یہ خودکام
راستہ چھوڑ کے چلتے تھے سڑک پر ریداس — بند تھی ان کیلئے تھی جو گذرگاہ عوام
ایک دن آئے نظر ان کو شری رامانند — دور سے جھک کے کیا از رہِ عقیدت سے سلام
مست عرفاں کی پڑی حسن عقیدت پہ نظر — ہنس کے فرمایا کہ تم کون ہو، کیا رکھتے ہو نام؟
بولے ریداس کہ میں خشک زمیں ہوں ہمہ تن — آپ ہیں ابرِ کرم اور میں تشنہ لبِ جام
یہ تمنا ہے کہ ہو کشتِ تمنا سیراب — آپ کی اک نگہِ مہر کا سائل ہے غلام
دوڑ کر ان سے بغلگیر ہوئے رامانند — طالبِ حق کو دیا سترِ حقیقت کا پیام
مہر سی لفظوں سے لبریز ہوا سازِ نفس — بھگت ریداس کی دنیا ہوئی شیدائے کلام

عارفوں کی ہے بلندی پہ نہ پستی پہ نظر
باخدا رکھتے ہیں انسان کی ہستی پہ نظر

سچّے دوست کی پہچان

(ماخوذ از زبانِ دہلی ۔ مارچ ۱۹۵۱ء)

اک جہاں دیدہ سے پوچھا میں نے از راہِ نیاز
مجھ کو سچّے دوست میں کس طرح کیجے امتیاز

ہنس کے فرمانے لگے یہ امر تو آسان ہے
میں بتاتا ہوں جو سچّے دوست کی پہچان ہے

پر یہ مشکل ہے کہ ہے نازک زمانہ آج کل
دوست صادق کا بھی ہے دشوار پانا آجکل

ہم شریک و غمگسار و ہمدم و ہمراز و نیک
باوفا ڈھونڈے نہیں ملتا کوئی لاکھوں میں ایک

دوستی میں دو ستی[۱] ہوتی ہے یہ مشہور ہے
ساتھ پروانے کے جلنا شمع کا دستور ہے

دوست صادق ہے وہی جو ہو شریکِ درد و غم
چارہ سازِ زخمِ دل ہو، غمخوارِ رنج و الم

عیش میں ہم بزم ہو، تو رنج میں ہمدرد ہو
جان پر کھیلے اڑی مشکل میں اتنا مرد ہو

غمگسار و غم ربا ہو خاطرِ ناشاد کا
زخمِ دل پر دوست کے پھاہا رکھے امداد کا

جس طرح بھی ہو سکے دکھ میں ہو شامل ہر گھڑی
دوست کی خاطر خود اپنی جان پر جھیلے کڑی

دوست کی مشکل کو سمجھے اپنی مشکل بے گماں
چارہ گر ہو درد میں، تکلیف میں راحت رساں

حاضر و غائب دل و جاں سے فدائے دوست ہو
دستگیرِ دوست ہو، حاجت روائے دوست ہو

ہے یہی سچّی محبت اور سچّی دوستی
واہ وا کیا خوب فرماتے ہیں تلسی داس جی

دوست صادق ہے وہی جو اصل سا ہو غمگسار
سکھ میں جو پیچھے رہے اور دکھ میں بڑھ کر ہو نثار

۱؎ دوستی سنسکرت زبان کا لفظ ہے جو دو اور ستی دو لفظوں سے مرکب ہے اور ستی ایسی نسبت کی ہے جو پائے نسبت اصل میں سنسکرت ہی کا قاعدہ ہے اسکے معنی ہیں دو دلی ہو گئی طاقتیں (طالب دہلوی)

پیمانِ وفا

ماخوذ از زمانہ دہلی۔ مئی سنہ ۱۹۰ء

رکھو یقیں گر تیرے دل آویز اندازِ شباب — محوِ نظارہ ہوں جن کا اب میں با صد جوشِ شوق
کل ہی مٹ جائیں کہ سب مٹ جائیں جوں نقشِ طلسم — اور تیرے قبضۂ قدرت سے ہوں روپوشِ شوق
پھر بھی میں تیرا پرستندہ رہوں گا جانِ من — جس طرح ہوں اس گھڑی کھولے ہوئے آغوشِ شوق

مٹ ہی جائے دلفریبی حسن کی تیرے اگر — اور یہ ہونا ہے کہ ہر وقفِ خزاں فصلِ بہار
پھر بھی اس ویرانۂ دلکش پر اک اک آرزو — شوق سے ہوتی رہے گی گرد پھر پھر کر نثار

یہیں جب تک ترے قبضے میں ہیں حسن و شباب — اور عارض پر ترے بہتے نہیں اشکِ رواں
تب ہی تک محدود ہے اظہارِ جذبِ شوقِ دل — اور ہو سکتی ہے ظاہر حسرتِ عشقِ نہاں
بلکہ جوں جوں اس طرح عرصہ گذرتا جائے گا — روز افزوں تجھ سے الفت ہوگی مجھ کو اے جہاں

کیونکہ وہ دل الفتِ صادق ہو جس میں جاگزیں — تا دمِ آخر نہیں دیتا محبت کو جواب
جس طرح سورج مکھی کا پھول از وقتِ سحر — قبلہ رو رہتا ہے تا وقتِ غروبِ آفتاب

شکوۂ بیداد

(ماخوذ از "زبان" - دہلی - مورخہ اگست و ستمبر ۱۹۰۸ء)

نہ جائیگا دھواں اُوپر ہی اوپر گرم آہوں کا — پڑیگا صبر تو آخر کسی پر داد خواہوں کا
رہیگا رنگ لاکر خون، ناکردہ گناہوں کا — خدا کے سامنے انصاف ہوگا بے پناہوں کا

ستم دیدہ جو ہیں اُن کو ملیگی داد محشر میں
شہیدوں کو فرشتے غسل دینگے آبِ کوثر میں

رہیگا شاہدِ خوں ذرہ ذرہ خاکِ مقتل کا — قیامت تک نہ ہوگا، بارِ خونِ بیگنہ ہلکا
جگر کے داغ روشن ہو کے دینگے کام مشعل کا — رہیگا دودِ آہِ گرم ٹکڑا بن کے بادل کا

فلک تا حشر گردش میں رہیگا بے سکوں ہوکر
پشیمانی سے چکرایا کرے گا سرنگوں ہوکر

وفورِ خوف سے تھرائے گا عرشِ بریں برسوں — رہینگے تھام کر دل مضطرب گردوں نشیں برسوں
لہو روئیگی قتلِ بیگنہ پر تیغِ کیں برسوں — رہیگی رنگِ خوں سے سرخ مقتل کی زمیں برسوں

رہیگا تا بہ محشر شور برپا داد خواہی کا
زبانِ تیغ پر شکوہ رہیگا بیگناہی کا

کبھی تو آہِ دلِ بیتاب سے غم رنگ لائیگی — کسی دن تو بہارِ اشکِ گلگوں رنگ لائیگی

ستمگاری تری سفاکِ گردوں رنگ لائیگی — شفق بنکر کسی دن سُرخیٔ خوں رنگ لائیگی

بُرے دن آنے ہیں کیوں بھُولا ہی فلک تیرا
مٹا دیگی کسی کی آہِ سوزاں نقش تک تیرا

جگر چھلنی نہ کر تیرِ ستم سے دلفگاروں کا — ترے سر چڑھ کے بولیگا لہو آفت کے ماروں کا
فلک پھل پائیگا کیا دل دُکھا کر بیقراروں کا — ستمگر صبر کیا خالی ہی جائیگا ہزاروں کا

کسی دن نالۂ آتش فشاں کر دیگا شق تجھکو
کسی دن پھونک دیگی آتشِ رنگِ شفق تجھکو

کریگی کام اپنا طاقتِ ضبطِ فغاں کبتک؟ — نہ دیگی آتشِ سوزِ دروں آخر دھواں کبتک؟
رہینگے آہ غلطیدہ بخونِ آتش بجاں کبتک؟ — بھلا سہتے رہینگے جورِ پیہم نیم جاں کبتک؟

رہیگا تا کجا یوں بخت برگشتہ غریبوں کا؟
کبھی تو اوج پر ہوگا ستارہ بدنصیبوں کا!

خدایا! ہندوالوں کا فقط فریادرس تُو ہی — دلِ پروردۂ دامانِ حسرت کی ہوس تُو ہی
اسیرانِ بلا کا دستگیر و ہمنفس تُو ہے — ستم دیدوں غریبوں کا سہارا ہی تو بس تُو ہی

ترا فضل و کرم ہی آسرا ہے نیم جانوں کا
تری رحمت کے بل پر ہے سہارا ناتوانوں کا

سالِ نو

مطبوعہ "زمانہ" بابتہ ماہ جنوری سنہ ۲۳ء

(مرسلہ بابو کرشن گوپال صاحب مغموم بی اے)

آئے وہ دن نصیب ہو جاہ و جلالِ نو
آنکھوں سے اپنی دیکھیں فروغِ جمالِ نو
چمکے فرازِ چرخِ وطن پر ہلالِ نو
حاصل عروجِ نو ہو، میسر کمالِ نو

یارب! دیارِ ہند کو راس آئے سالِ نو
بہبودیٔ وطن کے لئے ہو یہ فالِ نو

ہر سمت دور دورۂ امن و اماں رہے
آشوبِ روزگار سے آسودہ جاں رہے
ارزاں ہو عیش، جنسِ تباہی گراں رہے
راحت کدہ یہ خطۂ ہندوستاں رہے

یارب! دیارِ ہند کو راس آئے سالِ نو
بہبودیٔ وطن کے لئے ہو یہ فالِ نو

فتنہ نہ ہو، فساد نہ ہو، شور و شر نہ ہو
ہندوستاں میں خانہ خرابی کا گھر نہ ہو
جھگڑوں سے داد خواہوں کا چھلنی جگر نہ ہو
دامانِ خاک خونِ شہیداں سے تر نہ ہو

یارب! دیارِ ہند کو راس آئے سالِ نو
بہبودیٔ وطن کے لئے ہو یہ فالِ نو

سرسبز کشتِ ہند ہو دل باغ باغ ہو — بادِ بہارِ عیش سے تازہ دماغ ہو
غم سے نصیب اہلِ وطن کو فراغ ہو — ہر سو مئے طرب کا چھلکتا ایاغ ہو

یارب! دیارِ ہند کو راس آئے سالِ نو
بہبودیٔ وطن کیلئے ہو یہ فالِ نو

افراد متحد ہوں، بہم اتفاق ہو — دل پر کسی کے بارِ کشاکش نہ شاق ہو
غارتگرِ طرب نہ خمارِ نفاق ہو — شیشہ مئے عناد کا بالائے طاق ہو

یارب! دیارِ ہند کو راس آئے سالِ نو
بہبودیٔ وطن کیلئے ہو یہ فالِ نو

قحط و وبا کا ہونے نہ پائے گذر یہاں — دن رات ہو ترقیٔ علم و ہنر یہاں
لائے نہالِ صنعت و حرفت ثمر یہاں — اقبال و اوج و جاہ و حشم کا ہو گھر یہاں

یارب! دیارِ ہند کو راس آئے سالِ نو
بہبودیٔ وطن کیلئے ہو یہ فالِ نو

انصاف کا ہو عہد، ستم ہو نہ جور ہو — بگڑا ہوا نصیب، نہ دنیا کا طور ہو
بدلے ہوئے دہر، زمانہ کچھ اور ہو — اپنی زمین، اپنا فلک، اپنا دور ہو

یارب! دیارِ ہند کو راس آئے سالِ نو
بہبودیٔ وطن کیلئے ہو یہ فالِ نو

قطعات

(بر وفات ممتاز الشعراء منشی پیارے لال رونق دہلوی)

مرسلہ حضرت مغموم بی اے

صد حیف! آج رونقِ شیریں سخن نہیں — اس انجمن میں زیبِ دہ انجمن نہیں
اپنی جگہ جو فرد تھا دورِ جدید میں — وہ نکتہ سنج ماہرِ رنگِ کہن نہیں

آج رونق جو نہیں بزمِ سخن سونی ہے — کیوں نہ مغموم ہوں سب یاس کی افزونی ہے
خلشِ خارِ جدائی ہے دلوں کے اندر — مرگِ رونق کا یہ صدمہ کوئی بیرونی ہے؟

آہ! دلی میں تھے گنتی کے مشاہیرِ ادب — ایک اُنہیں سے بھی کم ہوگیا اے چرخِ غضب!
محفلِ شعر کے تھے رُکن جنابِ رونق — خالی خالی ہے جگہ اُنکی تو افسردہ ہیں سب

کاملِ فن تھے، یگانہ تھے جنابِ رونق — مایۂ نازِ زمانہ تھے جنابِ رونق

یاد سے انکی سخن سنج رہینگے بیتاب — وہ دلآویز فسانہ تھے جنابِ رونق

درج ذیل جگر پارے میرے حسنِ عقیدت کا مظہر ہیں۔ — طالب دہلوی

بہار باغ کیسی جب ہوں گلہائے چمن رخصت — فروغِ بزم پھر کیا جب ہو شمعِ انجمن رخصت
ترستی ہیں نگاہیں قہر[1] صاحب اور مائل[2] کو — کہ ہوتے جارہے ہیں رفتہ رفتہ اہلِ فن رخصت
کسے بزمِ سخن میں اب دماغِ محفل آرائی؟ — ہوا ہے آہ کیسا اوستادِ کہن رخصت
مزا باقی رہا طالب کچھ شعر خوانی کا — ہوئی ہمراہ رونق، رونقِ بزمِ سخن رخصت

۱؎ سوید انت رتن منشی سورج نرائن قہر دہلوی (۲) منشی جگیشور پرشاد مائل۔ ایڈیٹر تبان دہلی

سہرا

فدائے رنگِ رُخِ گلعذار ہے سہرا
شگفتگی سے سراپا بہار ہے سہرا

جمالِ نوشہ کا آئینہ دار ہے سہرا
ضیائے رُخ سے جواہر نگار ہے سہرا

لڑی لڑی سے ٹپکتا ہے رنگِ زر پاش
غرورِ حسن، ادائے وقار ہے سہرا

ہنسی گندھے ہوئے پھولوں کی بھی نہیں رکتی
کہ ایک خندۂ بے اختیار ہے سہرا

ہو ایسی جنبشِ مستانہ ہے جو لڑیوں کو
رُخِ حسیں پہ فدا بار بار ہے سہرا

اثر ہوائے خزاں کا نہ ہوگا جس پہ کبھی
سدا بہار گلوں کا وہ ہار ہے سہرا

شعاعِ مہر منور ہے ہر لڑی اس کی
ضیائے صبحِ شبِ انتظار ہے سہرا

بنی ہیں کرشن کی رادھا جو دیوی اندرانی
خوشی سے دونوں کی جیبِ نثار ہے سہرا

ہو نیک فال یہ شادی کشن بہاری لال
گلِ مراد کا اک لالہ زار ہے سہرا

ریاضِ خلد میں ہیں باغ باغ منشی دھر
کہ رُخ پہ پوتے کے جانِ بہار ہے سہرا

مبارک آپ کو لالہ چتر بہاری لال
نظر کا نور ہے، دل کا قرار ہے سہرا

بہت ہی شاد ہیں جسٹس جنابِ گنگا ناتھ
برائے بزمِ طرب پیشکار ہے سہرا

کنول دلوں کے کھلائے نہ کیوں مسرت سے
نول کشور کا کیا پُر بہار ہے سہرا

جنابِ برق کی گوہر فشانیاں کیا خوب
جوابِ سلکِ دُرِ آبدار ہے سہرا

کروکشیتر

میدانِ کروکشیتر ہے وہ خطۂ ویراں — ہر ذرے میں جسکے ہے نہاں گنجِ شہیداں
آثارِ تباہی ہیں ہر اک سمت نمایاں — عبرت کا نگاہوں کیلئے ہے سر و ساماں
تہذیبِ کہن دفن ہے اس خاک کے نیچے
پنہاں ہیں جواہر خس و خاشاک کے نیچے

پیوندِ زمیں ہے اسی جا شوکتِ دیریں — ہے گردِ سرِ راہ یہیں حشمت و تمکیں
وہ عہد کہ تھا ہند کی تاریخ میں زرّیں — مدفون یہاں اسکی ہے صد عظمتِ پیشیں
ہر تودۂ گِل مخزنِ اجلالِ سلف ہے
اس خاک کے ذرّوں کو ستاروں پہ شرف ہے

جاری یہیں وہ خون کا سیلاب ہوا تھا — میدانِ وغا جس سے کہ سیراب ہوا تھا
دامانِ زمیں حلقۂ گرداب ہوا تھا — بھارت کا سفینہ یہیں غرقاب ہوا تھا
تاثیر یہ ہے خون کے دریائے رواں کی
ابتک بھی زمیں سرخ نکلتی ہے یہاں کی

کورو یہیں شمشیر بکف ہو کے لڑے تھے — پانڈو یہیں صف بستۂ پیکار کھڑے تھے
کشتوں کے دمِ رزم یہیں کھیت پڑے تھے — جھنڈے یہیں ویروں کی شجاعت کے گڑے تھے
ہنگامۂ خونریز سے رن کانپ اٹھا تھا
لرزاں تھی زمیں چرخِ کہن کانپ اٹھا تھا

بھیشم نے دکھائی تھی یہیں شانِ شجاعت
ایجادِ فنِ جنگ بہ ہر برج کی عظمت
جنگاہ میں برپا تھی قیامت پہ قیامت
ناگاہ شکھنڈی نے کیا پست بہ حکمت
تیروں کی یہیں سیج پہ آرام کیا تھا
فردوس کے جانے کا سرانجام کیا تھا

درونا نے یہیں قلعہ وہ تیار کیا تھا
بھیم نے دلیرانہ جسے توڑ دیا تھا
جیدرتھ کے تیغ نے لہو اسکا پیا تھا
مقتول کا بدلہ یہیں ارجن نے لیا تھا
دھندلی سی جھلک ڈوبتے سورج کی کرن کی
شاہد تھی کماندار کے مردانہ پن کی

تیروں سے کرن کے یہیں طوفان اٹھا تھا
جس سمت دُشنش پھیر دیا حشر بپا تھا
ناوک جو چھٹا شست سے پیغامِ قضا تھا
پانڈوں پہ کڑا وقت یہیں آکے پڑا تھا
ارجن کے محافظ یہیں بھگوان بنے تھے
یہ پریم کا ثمرہ تھا کہ رتھبان بنے تھے

عرفاں کا کھلا تھا اسی بھومی میں خزانہ
ویدوں کا جواہر ہے گیتا کا ترانہ
ہر لفظ ہے جسکا سبق آموزِ زمانہ
ہے جانِ تصوف یہ بھارت کا فسانہ
جب تک کہ جہاں مہر سے پُر نور رہیگا
میدان کورکشیتر کا مشہور رہیگا

ماخوذ از کرشن درپن

سوزِ بیوگی

ماخوذ از زبان، دہلی - اپریل ۱۹۰۸ء

تودۂ تیرِ حوادث ہا آہ میں ناشاد ہوں   تختۂ مشقِ جفائے چرخِ بے بنیاد ہوں
کشتۂ جور و قتیلِ خنجرِ بیداد ہوں   اُف میں ناکامِ تمنا خانماں برباد ہوں

سوزشِ دل ہے عیاں پُر درد آہوں سے مری
رات دن حسرت برستی ہے نگاہوں سے مری

ہائے یہ حرماں نصیبی اور یہ حسن و شباب   ہائے یہ جوشِ جوانی اور یہ رنج و عذاب
ہائے یہ کلفت کی راتیں اور میں خانہ خراب   ہائے یہ خونِ تمنا اور یہ چشمِ پُر آب

ہجر کا صدمہ کوئی پوچھے دلِ دلگیر سے
چینِ بستر کم نہیں مجھکو دمِ شمشیر سے

یہ شبِ غم اور یہ یاس و تمنا کا ہجوم   دل پہ آتی ہیں امڈ کر غم کی گھٹائیں جھوم جھوم
سوزِ غم سے اس طرح جلتی ہوں میں کمبخت شوم   اُٹھتی کونپل کو جلائے جس طرح بادِ سموم

سوکھ کر کانٹا ہوا تن، غم سے کاہیدہ ہوں میں
گلشنِ آفاق میں نخلِ خزاں دیدہ ہوں میں

بڑھ گئی زلفِ پریشاں سے پریشانی مری   ہوگئی صد غیرتِ آئینہ حیرانی مری

عقدہ حل ہوتی قسمت سے آسانی مری   قہر ہے اس کم سنی میں خانہ ویرانی مری

کب گلہ ہے مجھکو جورِ آسمانِ پیر کا

مجھکو شکوہ ہے تو ہے پھوٹی ہوئی تقدیر کا

آہ یہ جوشِ سرشکِ چشمِ پُرخوں حیف ہے   زرد ہیں غم سے مرے رخسارِ گلگوں حیف ہے

نیم جاں ہوں اسقدر بیدادِ گردوں حیف ہے   کمسنی میں تیرگی بختِ واژوں حیف ہے

تختۂ مشقِ ستم کرتا ہے کیوں گردوں مجھے

کب ہنسایا تھا ہے رُلاتا ہے جو اشکِ خوں مجھے

اے گنہگاروں کے حامی وائے کریم کارساز   اے خطا بخشِ غریباں خالق و بندہ نواز

ملتمس ہوں تیری خدمت میں بصد عجز و نیاز   مجھ سیہ قسمت پہ کر دستِ کرم اپنا دراز

سایۂ دامانِ رحمت میں چھپا لے تو مجھے

جان سے بیزار ہوں، جلدی اٹھا لے تو مجھے

نذرِ غالب

کمال۔ دہلی

دل اگر وہ آشنا نہ ہوا   پھر برابر ہے، وہ ہوا، نہ ہوا

سخت جانی کا عقدۂ دشوار   ناخنِ تیغ سے بھی وا نہ ہوا

ٹوٹ جاتا تو چین آ جاتا   دل ہوا، کوئی آبلا نہ ہوا

اُف بتِ سنگدل کے دل پہ کبھی   اثرِ نالہ و بکا نہ ہوا

(در سلسلۂ حضرت مخدوم)

بانسری اور شاعر

بانسری! مجھ کو تری خوش قسمتی پر رشک ہو — کرشن کے لبہائے لعلیں تک رسائی ہو تری
دیکھنے میں بہ حقیقت بانس کی پوری ہے تو — اس پہ یہ طرہ کہ عالم میں گرہائی ہے تری
ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے ترا تسخیرِ قلب — کس قدر جادو اثر نغمہ سرائی ہے تری
روح تازہ پھونکتی ہے قالبِ بیجاں میں تُو — جاں نوازی گویا اک معجز نمائی ہے تری
تجھ میں اے شاخِ بریدہ کیوں ہے اتنی دلکشی — کیا سبب؟ مشتاق کیوں ساری خدائی ہے تری

کچھ تو بتلا دے بڑائی کا تری کیا راز ہے؟
بانسری والے کی تو کیوں ہمدم و دمساز ہے؟

نے ہوئی گویا کہ اے ناواقفِ اسرارِ غیب — مرتبہ سمجھیگا تو کیا عقل کے دشمن میرا
دیدۂ حق بیں سے مجھ کو دیکھ اے ظاہر پرست — ہے بظاہر پردہ دارِ حسن پیراہن میرا
دل مرا آلائشِ حرص و ہوا سے پاک ہے — معصیت کے داغ سے بے لوث ہے دامن میرا
صاف باطن ہوں مجھے صدق و صفا سے کام ہے — آئینہ سے بھی زیادہ قلب ہے روشن میرا
کیوں لبِ معجز نما تک دسترس مجھ کو نہ ہو؟ — ہو چکا ہے پہلے ہی کرشن ارپن تن من میرا

دل ترا صدقِ مجسم ہو اگر میری طرح
نورِ صادق تجھ میں بھی ہو جلوہ گر میری طرح

(کرشن دیپن)

نوحۂ سرور جہاں آبادی

(ماخوذ از ادیب، ماہ اگست ۱۹۱۰ء)

(مرسلہ حضرت کیلاش ورما شائق ہنگامی بی۔ اے)

اے اجل! کس کا چراغِ زندگی گُل کر دیا؟ کس کی میت پر جوانا مرگ کا غل کر دیا؟
خون کس کی حسرتوں کا بے تأمل کر دیا؟ ختم کس کی زیست کا دورِ تسلسل کر دیا؟

کس گلِ شاداب کو تو نے ملایا خاک میں؟
پھونک کر اُف کر دیا کس کو خس و خاشاک میں؟

چاک کس کا پردۂ دامانِ ہستی کر دیا؟ کس کا وقفِ نیستی سامانِ ہستی کر دیا؟
اُف یہ کس کو خانماں ویرانِ ہستی کر دیا؟ تو نے رخصت کونسا مہمانِ ہستی کر دیا؟

شور برپا ہے یہ کس کی مرگِ حسرتناک کا؟
اے اجل کس کو کیا پیوند تو نے خاک کا؟

یہ ستم تو نے جلائے ناگہانی کیا کیا؟ کس کے ارمانوں پہ پھیرا تو نے پانی کیا کیا؟
کس کی ہستی تو نے کر دی آہ فانی کیا کیا؟ خاک میں کس کی ملا دی زندگانی کیا کیا؟

صاعقہ بنکر جلا دی کس کی کشتِ آرزو؟
کس کی قسمت سے مٹا دی سرنوشتِ آرزو؟

تیرے ہاتھوں کون وقفِ پائمالی ہوگیا؟ کس کا پیکر نقشِ تصویرِ خیالی ہوگیا؟

کس کا پیمانۂ عشرت سے خالی ہوگیا؟ کون مٹ کر نذرِ صد آشفتہ حالی ہوگیا؟

حسرتیں نالاں ہیں کس کے خانۂ ویراں میں آہ؟

کفرقہ ڈالا یہ تو نے کس کے جسم و جاں میں آہ؟

یہ نیا ہی تو نے داغ تازہ کس کی موت کا؟ کھینچتے ہیں اقربا خمیازہ کس کی موت کا؟

درد و غم ہے سب کو بے اندازہ کس کی موت کا؟ گونجتا ہے خلق میں آوازہ کس کی موت کا؟

کس کی میت پر ہجومِ حسرت و ارمان ہے؟

الوداعِ آخری کا کس کی یہ سامان ہے؟

کس کو بارِ زندگانی سے سبکدوشی ہوئی؟ خاک ہو کر خاک میں کس کو ہم آغوشی ہوئی؟

جان دیکر کس کو حاصل خود فراموشی ہوئی؟ لب بلب کس کے دہن کو مُہرِ خاموشی ہوئی؟

ہوگئی وقفِ خزاں کس کی بہارِ زندگی؟

نقش باطل ہوگئے کس کے نگارِ زندگی؟

کس کا تو نے اے اجل چھلکا دیا جامِ حیات؟ کس کو تو نے کر دیا صد حیف ناکامِ حیات؟

کردشِ صبحِ قیامت کس کی ہے شامِ حیات؟ تجھ سے ہاتھوں ہو گیا کس کا سر انجامِ حیات؟

خرمنِ ہستی یہ کس کا پھونک کر اُف کر دیا؟

اک زمانہ کو جو سرگرمِ تاسف کر دیا؟

ہائے حسرت اے اجل کمبخت بے مہرِ ہلاک اُف تری سفاکیاں تو نے کیا اسکو ہلاک

جسکی ملت پر نظموں کی تھی اک عالم میں دھاک سچ تو یہ سانحہ ہے اُسکا مرگ دردناک

جسکے نغموں کی صدا آتی تھی کل تک کان میں
اب نہیں اُسکا پتہ بھی عالمِ امکان میں

آہ اے دار السرورِ باغِ جنت کے مکیں　　اے سرورِ خوش بیاں اے تاجِ شہرت کے نگیں
تیرے غم سے ہیں دلِ اہلِ قلم اندوہگیں　　یہ وہ صدمہ ہے تلافی جسکی ہو سکتی نہیں

قابلِ صد رنج و حسرت ہے تری بے وقت موت
دے گئی داغِ جدائی سب کو تیری سخت موت

رونق بزمِ سخن تھی تیرے دم سے سربسر　　گُل نئے پھولا کئے تیرے قلم سے سربسر
یہ نمایاں ہے تری طرزِ رقم سے سربسر　　پھول تو چنتا تھا گلزارِ ارم سے سربسر

تھی سرور افزا بہت تیرے لئے تابِ سخن
کھل گیا تھا تیری نظموں سے نیا بابِ سخن

درحقیقت تیرا اندازِ تخیل تھا نیا　　ہر روش میں تیرے لفظوں کا تسلسل تھا نیا
نیچرل نظموں میں تیرا رنگ بالکل تھا نیا　　تیری محفل میں جو چھلکا ساغرِ مُل تھا نیا

یہ ٹپکتا ہے ترے ہر شعرِ تر سے بالیقیں
تُو نے سینچا ہے اسے خونِ جگر سے بالیقیں

آئینہ ہر شعر ہے روشن خیالی کا تری　　مصرعہ مصرعہ ہے مرقع خوش مقالی کا تری
شوخیٔ مضموں نتیجہ طبعِ عالی کا تری　　چستیٔ بندش ہے نمونہ باکمالی کا تری

گو کہ تھی تیری طبیعت فطرتاً مشکل پسند
ہوتی تھیں لیکن تری پُر درد نظمیں دل پسند

آہ اے شیوا بیاں سرمایۂ نازِ سخن — غرقِ حیرت کس لئے ہے اے سرفرازِ سخن؟
کیوں نہیں اب چھیڑتا تو پردۂ سازِ سخن؟ — دم بخود کس فکر میں ہے نغمہ پردازِ سخن؟
تیرے نغموں کیلئے سب گوش بر آواز ہیں
تو اٹھاتا کیوں نہیں، جو پردہ ہائے راز ہیں؟

اسقدر بھی کیا سرورِ بادۂ سرجوش ہے — اپنی ہستی کا بھی جو خواب تجھکو ہوش ہے؟
کیوں فسردہ تیرے دل کی آتشِ خس پوش ہے؟ — آہ بلبل شعلہ زباں، تو کس لئے خاموش ہے؟
تیرے ہونٹوں پر ہے یہ مہرِ خموشی کس لئے؟
راز ہے کوئی، وگرنہ پردہ پوشی کس لئے؟

خالی از عظمت نہیں ہے تیرا اندازِ سکوت — تجھ پہ شاید کھل گیا ہے عقدۂ رازِ سکوت
دل ہی دل میں چھیڑتا ہے پردۂ سازِ سکوت — نقدِ جاں دیکر ہوا ہے تو ہم آوازِ سکوت
اب نہ آئینگی تری دلکش صدائیں کان میں
نام پر باقی رہے گا عالمِ امکان میں

گو فلک نے کر دیا ہے تجھکو پیوندِ زمیں — کب مٹا سکتا ہے لیکن تیرا نقشِ دلنشیں؟
سب کہیں گے تیری نظموں پہ صلائے آفریں — ہے سخن ہی سے بقائے نام و شہرت بالیقیں
نقشِ باطل ہو نہیں سکتا کبھی نام سرور
ہند میں جبتک رہیگی گردشِ جامِ سرور [1]

---

[1] جامِ سرور یعنی حضرت سرور مبرور کی نظموں کا مجموعہ

ایک باوفا کنیز اور بیوفا آقا

(ماخوذ از "زبان"۔ دہلی، بابتہ جولائی ۱۹۰۸ء)

دل گرفتہ اپنے شیدا سے ہو کیوں جانِ جہاں؟ کس لئے ہو میرے دستِ شوق سے دامن کشاں؟
کیوں روا رکھتا ہے مجھ پر ہجر کی قیدِ گراں توڑتا ہے کس لئے اب وعدۂ وصلِ رواں؟
اپنی عشرت گاہ سے کرتا ہے کیوں مجھکو بدر

رات دن تجھ سے اٹھائی لذتِ کیفِ وصال تیرے سایہ میں بسر کی زندگی آسودہ حال
کیا نہ تھیں آنکھیں مری شام و سحر محوِ جمال؟ کیا نہ رہتی تھی ترے قدموں میں اے خوش خصال؟
تیری خدمت میں نہ کیں کیا مدتیں میں نے بسر؟

ایک دم بھی تو اگر ہو میری آنکھوں سے نہاں تیرہ و تاریک ہو میری نگاہوں میں جہاں
میں غلامِ نرگسِ مخمور ہوں اے جانِ جاں جلوۂ دیدار ہی سے تیرے دل ہے شادماں
تیری خدمت میں ہی خوش ہے یہ تری تفتہ جگر

ہمسرِ چرخِ بریں ہے تیرے کوچہ کی زمیں ذرہ ذرہ ہے یہاں کا غیرتِ ماہِ مبیں
مشک کو بھی تیری خاکِ در سے کچھ نسبت نہیں تیری عشرت گاہ سے بدلوں نہ میں خلدِ بریں
رخِ روشن کے عوض مانگوں نہ میں شمس و قمر

بےخبر ہوں سب سے تیرا جلوۂ رخ دیکھکر پھیر لی ہے تیرے نورِ حسن میں سب سے نظر
جان سے پیارا ہے تو اے راحتِ قلب و جگر سب سے بہتر آرزوئے دل ہے تو ہی سر بسر
یہ بتا کیونکر جیونگی تجھ سے رہ کر دور تر؟ (ترجمہ فارسی)

رازونیاز

نرگسِ مست ہے خجل چشمِ نگار دیکھکر | اوس چمن پہ پڑگئی رُخ کی بہار دیکھکر
لیتے ہیں مجھ سے نوک کی زار و نزار دیکھکر | تیز زبانِ خار ہے پائے فگار دیکھکر
بزمِ عدو کا حال سب آئینہ ہوگیا مجھے | نرگسِ نیم خواب میں رنگِ خمار دیکھکر
جامِ شرابِ ناب دے، خیر ہو تیری ساقیا! | توبہ سے ہاتھ دھوئیے، ابرِ بہار دیکھکر
پیشِ نگاہ آئینہ کیوں ہے بناوٹوں کے بعد | اپنی نظر نہ ہو تمہیں، رُخ کا نکھار دیکھکر
اب کے خدا ہی ہے اگر جسم پہ تار بھی ہے | جوشِ جنوں ہے جوش پر، جوشِ بہار دیکھکر
دل اُنھیں میں نے کیا دیا، دشمنِ جاں بنالیا | کرتے ہیں مشقِ جور وہ، عاشقِ زار دیکھکر
ماہِ تمام ماند ہے، تابشِ حسنِ یار سے | آئینہ آب آب ہے، روئے نگار دیکھکر
آئے جو وقتِ نزع وہ، اشک بھرے آنکھ میں | ضبط نہ اُن سے ہوسکا حالِ فگار دیکھکر
وقفِ فنا ہر ایک شے ہستی کالعدم میں ہے | رازِ ثبات کھُل گیا حالِ شرار دیکھکر

توڑے ہیں مجھ پہ کیسا ستم، برقِ حزیں ہیں کیا کہوں
اُس نے لحد تارجاں سے مجکو نثار دیکھکر

(زبانؔ دہلی)

سہرا

جو سر پہ باندھے دولتِ شباب ہی سہرا
خجل ہے رُخ سے گُلِ آفتاب ہے سہرا

بنے عارضِ نوشہ نقاب ہے سہرا
دُلہن کے پردۂ رُخ کا جواب ہے سہرا

رسا نہ تھی جگہ شوق جیسے نوشہ تک
زہے نصیب وہاں باریاب ہے سہرا

سر کے رُخ سے لُٹاتا ہے دولتِ دیدار
کہ معدنِ کرمِ بے حساب ہے سہرا

اُلجھ کے رہ گئے تارِ نگاہ لڑیوں میں
بجائے چشمِ تماشا حجاب ہے سہرا

شمیم پھولوں کی اسکے ہے فرحت بخشِ دماغ
جھلک میں غیرتِ رخِ گلاب ہے سہرا

رقم ہے ہر ورقِ گل پہ دفترِ اخلاص
خلوصِ مہر و وفا کی کتاب ہے سہرا

یہ دے رہا ہے نویدِ بہارِ صبحِ امید
مسرت اسکی ہے تعبیرِ خواب ہے سہرا

یہ جشنِ عیش مبارک ہو سب عزیزوں کو
کہ بوستانِ مسرت کا باب ہے سہرا

پرکھ لیں گوہرِ مضموں کو برقِ اہلِ نظر
کہ جوہرِ جگہ انتخاب ہے سہرا

غزل

کیا کیا دلِ حزیں پہ قیامت گذر نہ لی
ہم مر رہے تھے مر گئے اس نے خبر نہ لی

اتنا کہا نہ چاہنے والوں سے دل کبھی
تو نے دعا کسی کی بھی اے فتنہ گر نہ لی

بیٹھے برق وہم کو دیکھ کر دم سے کھینچ کر
تو نے فلک کی آہِ رسا بے اثر نہ لی؟

(از محترمہ حضرت بیتاب بریلوی)

کرشن جنم

(از کرشن درشن)

دکھایا جلوہ جب شمعِ شبستانِ جہاں تو نے — بنایا مطلعِ انوار تیرہ خاکداں تو نے
کیے رازِ نہاں سترِ حقیقت کے عیاں تو نے — کیا ہندوستاں کو رشکِ صبحِ جناں تو نے

جو پھیلا نور تیرا جاگ اٹھی تقدیر بھارت کی
ترے یمنِ قدم سے بڑھ گئی توقیر بھارت کی

تری ہستی ہوئی پردہ کشائے رازِ عرفانی — تری ذاتِ مقدس سے ملی تعلیمِ روحانی
ترے حسنِ جہاں افروز سے کی نور افشانی — تری شانِ کرم سے ہو گئی رحمت کی ارزانی

ترے جلوے کے شامل نور پھیلا حسنِ اوّل کا
دیا گم گشتگانِ حق کو جس نے کام مشعل کا

ہوا تجھ سے ظہورِ جلوۂ حسن آفریں کیا کیا — ہوئی سیرابِ نظارہ نگاہِ دوربیں کیا کیا
مٹے حرفِ غلط بن بن کے وہمِ دلنشیں کیا کیا — تری تعلیم کے قائل ہوئے اہلِ یقیں کیا کیا

تصوف کے کھلائے گلشنِ ہستی میں گل تو نے
رموزِ معرفت وا کر دیے اے عقلِ کل تو نے

زمینِ ہند نازاں ہے وجودِ پاک پر تیرے — کبھی نقشِ قدم تھے ثبت ہر اک خاک پر تیرے
زمیں پر نور برسا جلوے تھے ہفت افلاک پر تیرے — کھلے کب رازِ مخفی قوتِ ادراک پر تیرے

تجھے ہر اک بقدرِ وسعتِ حدِ نظر سمجھا
کوئی اوتار سمجھا اور کوئی فوق البشر سمجھا

اندھیرے پاکھ کی تھی اشٹمی اور شب تھی بھادوں کی   جو گذری نصف شب اوجِ فلک سے چاندنی اتری
ہوئیں خیرہ نگاہیں حسن کی تیرے ضیا پھیلی   منور ہو گیا تاریک تھا جو صفحۂ ہستی
ترانے تیری پیدائش پہ گائے اپسراؤں نے
زمیں پر پھول برسائے فلک سے دیوتاؤں نے

ہوئیں ماں باپ کی آنکھیں منور کنجِ زنداں میں   جگہ تسکینِ خاطر کو ملی قلبِ پُرارماں میں
ہوئی آکاش بانی کنس کو خوابِ پریشاں میں   ادھر تیرے سمائی خواب بنکر چشمِ درباں میں
پتا دیکھا جو آرام جگر موذی کے چنگل میں
شتابی لے گئے بسدیو جی متھرا سے گوکل میں

یہاں پر نند جی کے زیرِ سایہ پرورش پائی   یہیں پر شعلۂ حسنِ مجسم نے تپش پائی
چڑھے پروان شانِ دلربائی کی روش پائی   زمانے کے مسخر کر لئے دل وہ کشش پائی
سنائے راگ جب وحدانیت کے جانفزا نے سے
کیا خود رفتہ و سرمست سب کو نغمۂ نے سے

ہوئی جب کورو پانڈو میں مہا بھارت کی تیاری   پئے جنگ و جدل جب معرکہ رن میں پڑا بھاری
مقابل آئیں جب دونوں سپاہیں بہرِ ہند آری   خیالِ خام سے ارجن پہ وحشت سی ہوئی طاری
اسے آگاہ تو نے کر دیا رمزِ حقیقت سے
کیا گم گشتہ رہ کو آشنا راہِ طریقت سے

کھلیں آنکھیں اُٹھا حجابِ میاں سرپردہ حائل   نظر آئی حقیقت گھٹ گیا اندیشۂ باطل
مخالف پر ظفر یابی ہوئی میدان میں حاصل   تری مشکل کشائی سے ہوا حل عقدۂ مشکل

تری ذاتِ سراپا فیض کیا تھی بحرِ رحمت تھی
پئے اہلِ نظر آئینۂ رازِ حقیقت تھی

ترے حسبِ ہدایت جو عقیدت رکھتے ہیں گیتا میں   جو اپنے نیک اعمال کرشن آرپن کرتے ہیں دنیا میں
نہیں رکھتے ہیں مطلق امتیاز ادنیٰ و اعلیٰ میں   دوئی کھو کر وہ ہو جاتے ہیں خود گم ذاتِ یکتا میں

وہی سرمست ہوتے ہیں سرورِ جاودانی میں
انھیں ہوتا ہے حاصل ہوش پیدا دنیائے فانی میں

رنگ و بو

(مرسلہ حضرتِ طالب۔ پانی پتی)

وہ الفت مرے فتنہ گر ہی نہیں   وہ آنکھیں، وہ دل، وہ نظر ہی نہیں
غضب ہے ترا حسنِ نظارہ سوز   کہ رخ پہ ٹھہرتی نظر ہی نہیں
اڑاتا ہوں پرزے خطِ شوق کے   میسر مجھے نامہ بر ہی نہیں
جو دل کی طرح کھائے مژگاں کے تیر   کوئی ایسا سینہ سپر ہی نہیں

مرے پاس سے کیوں غضب ہو گئے
ارے اور دنیا میں گھر ہی نہیں

گُلِ پژمردہ

ماخوذ از زبان ۔ دہلی ۔ مورخہ فروری ۱۹۱۰ء

صبحدم نکلا پئے تفریح میں شوریدہ سر — ہو گیا اک گلشنِ شاداب میں میرا گذر
ابرِ رحمت سے سراسر وہ چمن سیراب تھا — بارور تھے آمدِ فصلِ بہاری سے شجر
راحت بخشِ روحِ رواں موجِ نسیمِ صبح تھی — فرح بخشِ دل جگر تھی نکہتِ گلہائے تر
قطرۂ شبنم پڑے تھے سبزۂ بیگانہ پر — یا کہ تھے بکھرے ہوئے فرشِ زمرد پر گہر
تھیں ہوا سے جنبشیں یا نخلِ دستِ نازنیں — شاخِ نخلِ سبز سے اٹھتا نہ تھا بارِ ثمر
لالۂ پر داغ پر جوبن برستا تھا غضب — اک بہارِ جانفزا تھی سبزۂ نوخیز پر
شاخِ سنبل یوں لچکتی تھی ہوائے تیز سے — جس طرح بل کھائے یار زلف سی نازک کمر
چہچہہ زن ہر طرف تھے خوش نوایانِ چمن — شاخِ گل پر نغمہ خواں تھی بلبلِ شوریدہ سر
ہر طرف تھا جلوۂ سیرِ بہارِ دیدِ گل — چشمِ مشتاقِ تماشا کو ملا ذوقِ نظر
خوب جی بھر کر رہا محوِ تماشائے چمن — سیرِ گلشن سے میں ہوا محظوظ قصہ مختصر
بس پلٹنے ہی کو تھا میں چمن سے ناگہاں — اک گلِ پژمردہ پر بھی جا پڑی میری نظر
تھا عجب حسرت بھری تصویر وہ پامالِ غم — چوٹ سی دل پر لگی حالِ پریشاں دیکھ کر
وہ گلِ پژمردہ بولا دیکھتا کیا ہے مجھے — پائمالِ دستِ بیدادِ خزاں ہوں بے خبر
تیغ چلتی ہے مری برگِ خزاں دیدہ چمن — سر بسر تصویرِ عبرت ہوں کوئی دیکھے اگر

خاکِ گلشن پر پڑا ہوں اب بحالِ زار میں — یا کبھی جانِ چمن تھا میں گلِ خستہ جگر

آنکھ مجھ سے مت چرا دلدادہ سیرِ چمن — چشمِ معنی خیز سے کر میری حالت پر نظر

نازپرورِ چمن تھا میں گلِ رعنا کبھی — حلقۂ آغوشِ نخلِ سبز میں تھا جلوہ گر

دستِ قدرت نے عطا کیں تھیں مجھے رنگینیاں — حسنِ دل افروز کی تصویر تھا میں سر بسر

زینت افزائے چمن تھا حسنِ دل آرا مرا — جلوہ افگن تھا بصد انداز شاخِ سبز پر

تازگی بخشِ دلِ افسردہ تھی خوشبو مری — میرا حسن جانفزا تھا جلوہ افروزِ نظر

میرے سر سہرا رہا تارِ نگارہ شوق کا — مجھ پہ ہی پڑتی تھی مشتاقوں کی ہر پھر کر نظر

میرے ہی دم سے معطر گلشن شاداب تھا — میری ہی خوشبو سے تھی مہکی ہوئی بادِ سحر

مجھ پہ پھر پھر کر تصدق ہوتی تھی بادِ صبا — میرے سر پر وار کر شبنم لٹاتی تھی گہر

خندہ زن تھا گریۂ شبنم پہ میں مغرورِ حسن — شورِ بلبل کو سمجھتا تھا فغانِ بے اثر

حسن کو سمجھا ہوا تھا میں بہارِ بے خزاں — دل میں آتا تھا نہ فکرِ پائمالی بھول کر

حسنِ رنگیں تھا مرا از بسکہ نظارہ فروش — اتفاقاً پڑ گئی گلچیں کی بھی مجھ پر نظر

اس ستمگر نے یہ میری جان پر توڑا ستم — رکھ لیا دامن میں اپنے شاخِ گل سے توڑ کر

گرمِ بازاری ہوئی پھر بھی نہ میرے حسن کی — لے گئے گلچیں سے ہاتھوں ہاتھ مجھکو سیمبر

زینتِ لالہ رخوں نے خوب میرے حسن کی — جعدِ مشکیں میں مجھے گوندھا چڑھایا اپنے سر

میری خوشبو نے کیا تازہ دماغِ مہوشاں — ہو کے پژمردہ بھی میں کچھ کچھ رہا فرحت اثر

پوری ہو گئی آخر بہارِ حسن کی — مٹ گئی افسوس میری خوشنمائی سر بسر

تازگی جاتی رہی کافور خوشبو ہو گئی
ہر طرح سے ہو گیا برباد میں خستہ جگر
گر گیا سب کی نظر سے اسقدر افسوس ہیں
آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں اب دیکھتا کوئی بشر
کھل گیا رازِ ثباتِ عالمِ فانی مجھے
ہے یہاں ہر شے سے رنگِ بے ثباتی جلوہ گر
شادی و غم کا مرقع ہے مرا حالِ زبوں
میری حالت سے سبق سیکھیں جو ہوں اہلِ نظر

سر بسر تصویرِ عبرت با دلِ افسردہ ہوں
میں گلِ تر تھا کبھی اب تو گلِ پژمردہ ہوں

جگر پارے

(مرسلہ حضرت مغموم کیتھلوی)

صبحِ شبِ وصال بہت یاد آئیگی
پنہاں رات بھر رہے مرے دل کی آرزو
پوری کرو، کرو نہ کرو، اختیار ہے
تم کان دھر کے سن تو لو سائل کی آرزو
کھائے ہیں اتنے داغ اُمیدِ وصال میں
پھولوں میں تل رہی ہے مرے دل کی آرزو
دُزدِ حنا پہ شک ہے، ذرا ہاتھ کھولئے
چوری گئی ہے آج مرے دل کی آرزو
آئینہ دیکھ لو، یہ برابر کی چوٹ ہے
تم کو اگر ہے مدِ مقابل کی آرزو
بجھ تشنہ لب کی پیاس اسی سے بجھے گی کچھ
مجھکو ہے آبِ خنجرِ قاتل کی آرزو
یوں منہ سے کہہ کے تا بھی کھو دوں غرض مجھ
پوری کرو تو تم سے کہوں دل کی آرزو
اے شمع سب ہیں تیرے جلانے کی فکر میں
تجھ کو عبث ہے گرمیٔ محفل کی آرزو

ویر بھگوان

جو بیسویں اوتار تھے دنیا میں مہاویر — سرتاقدم گیان کی ویرگ کی تصویر
آزادِ ازل کرم کی توڑے ہوئے زنجیر — نروان کی ظاہر تھی رُخِ پاک سے تنویر

اِک نور تھا جو پیکرِ خاکی میں نہاں تھا
فانوس سے جو شمع صفت جلوہ فشاں تھا

تصویرِ سکوں، تیاگ کی مُورت تھے مجسم — طوفانِ حوادث سے طبیعت نہ تھی برہم
دائم تھے حواس آتمک اطمینان میں قائم — کیفِ مئے عرفاں سے سدا ہی کا تھا عالم

لرزاں نفسِ پاک نہ تھا بیم و رجا سے
جنبش میں نہ تھی شمع کی لَو موجِ ہوا سے

فردوسِ بریں چھوڑ کے آئے تھے زمیں پر — ظلمت کے مٹانے کو مثالِ مہِ انور
لبریز تھا دل دادِ خلائق سے سراسر — اُمڈا ہوا سینے میں تھا اُلفت کا سمندر

آلام رسیدوں کے لئے دافعِ غم تھے
تردامنوں کے حق میں یہ دریائے کرم تھے

گھر اتنا طبیعت میں تھا اُپکار کا احساس — دولت کا نہ ثروت کا نہ شوکت کا کیا پاس
شاہانہ حشم ترک کیا لینے کو سنیاس — صحرا کی ہوا آئی تپسیا کے لئے راس

شاداب ہوا نخلِ ریاضت جو ثمر سے
ڈھلنے معانی لبِ تقریر سے برسے

پیغامِ اہنسا کا زمانے کو سنایا　　ذی روحوں کو آزار سے ایذا سے بچایا
اُپدیش دیا نقشِ جہالت کا مٹایا　　جو راستۂ منزلِ مقصد تھا دکھایا

سیراب ہوئے تشنہ لبِ بادۂ حقیقت
گمراہوں کا رُخ پھیر دیا سوئے حقیقت

دیتے تھے تصوّف کا سبق گیان کی تعلیم　　ویدانت کے اسرار کی عرفان کی تعلیم
سرمایۂ راحت تھی یہ فیضان کی تعلیم　　یہ موکش کا مژدہ تھا یہ نروان کی تعلیم

مسرور ہوئے حسنِ رُخِ ذات سے لاکھوں
آزاد ہوئے بندِ مکافات سے لاکھوں

اعجاز نگاہوں میں تھا تاثیر زباں میں　　گویائے تقریر کا انداز بیاں میں
تھی مظہرِ کشش فلسفۂ روحِ رواں میں　　گھر کر گئے الفاظ دلِ پیر و جواں میں

پروانے ہوئے شمعِ ہدایت پہ تصدّق
سب برق ہوئے تیاگ کی مورت پہ تصدّق

(از گلدستۂ عقیدت)

نامۂ منظوم بنام حضرت محروم

(مرسلہ حضرت مغموم کیتھلوی بی۔اے)

کس حال میں ہو جنابِ عالی؟ — خط لکھنے کی کیا قسم ہے کھا لی؟
موصول ہوا کلامِ محروم — لیکن نہ ملا پیامِ محروم
آنکھیں ہوئیں شاد، دل ہوا ناشاد — یہ طرفہ ہے غمزدہ پہ بیداد
بیمار، نصیبِ دشمناں ہو؟ — یا برقِ حزیں سے سرگراں ہو؟
صدمہ کوئی جانِ زار پر ہے؟ — یا مجھ پہ عتاب کی نظر ہے؟
مصروفِ مطالعۂ کتب ہو؟ — یا کام میں محو روز و شب ہو؟
سرشار ہو بادۂ سخن سے؟ — فرصت نہیں یا غمِ وطن سے؟
یا شغل کوئی نیا نکالا؟ — پابندِ الم ہو بالا بالا؟
ہوتا نہیں دل کا حال معلوم — کھلتا نہیں خامشی کا مفہوم
مشتاق سمجھ کے تن رہے ہو — اس زعم میں ہو، تو بن رہے ہو
ہوں بارِ زمیں میں ننگِ ہستی — شیوہ ہے پر آشنا پرستی
واجب نہیں مجھ سے کج ادائی — یہ بے رخی اور یہ بے وفائی
میں آپ کا اسیرِ دامِ غم ہوں — دل خستۂ خنجرِ الم ہوں

میں عین شباب میں ہوں ناشاد / وہ گل ہوں، بہار میں ہوں برباد
کاہیدہ و زار، وقفِ آلام / غم دیدہ و نامراد و ناکام
افسردہ دلی بلائے جاں ہے / ہوش اپنا نہ فکرِ امتحاں[۱] ہے
ہیں منزلوں ہم طریق آگے / ہیں پانوں نہ میرے تھک کے جا لگے
اس رنج میں ہوں کباب کروں کیا / گردِ پسِ کارواں بنوں کیا
رو رو کے یہ دل میں سوچتا ہوں / اس فکر سے ہاتھ ہی اٹھاؤں
ہے بارِ گراں ہجومِ افکار / سچ پوچھو تو جان سے ہوں بیزار
کھانا غم و غصہ، اشک پینا / جینے میں ہے کوئی یہ بھی جینا
اچھا ہے مگر جو دم گذر جائے / کیوں شکوۂ بخت تا زباں آئے
کیوں برق سے اضطراب چھوٹے؟ / کیوں رشتۂ عروسِ غم سے ٹوٹے؟
ہے دردِ دلی سپردِ نامہ / بیساختہ لکھ دیا ہے نامہ
دو گے نہ اگر جوابِ محروم / سمجھونگا میں جیتے جی ہی مرحوم

ازبسکہ ہے خط کی اضطرابی
ارسال ہے کارڈ بھی جوابی

---

۱ استاذی مرحوم ان دنوں منشی فاضل کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھے۔

حضرتِ برق کے جواب میں

(مرسلہ حضرتِ مغموم کیتھلوی بی اے)

(جولائی سنہ ۱۹۲۲ء)

اے مشفق و مہربانِ مخدوم — اے یادِ تو حرزِ جانِ محروم
اے بلبلِ گلشنِ معانی — دانندۂ رموزِ نکتہ دانی
اے تاجِ سخن طرازِ دہلی — اے باعثِ فخر و نازِ دہلی
من بعد سلامِ شوق افزوں — لب پر ہے عرضِ مدعا یوں
گردوں کا یہ بڑھ چکا ہے آزار — میں زیست سے، زیست مجھ سے بیزار
از بسکہ اسیرِ دامِ غم ہوں — اور کشتۂ خنجرِ الم ہوں
غم دیدہ، ستم رسیدہ، دلگیر — حیرت زدۂ فسونِ تقدیر
افسردہ، ملول و بیدل و زار — بازارِ جہاں میں جنسِ بیکار
خط لکھنے کو جب قلم اٹھایا — فوراً دل میں خیال آیا
اظہارِ غمِ نہاں کروں کیا — حالت اپنی بیاں کروں کیا
احباب کو حالِ غم سنا کر — کیوں بیٹھے بٹھائے کیجیے مضطر

پھر برق کہ پیکرِ وفا ہے
گھبرا جائے، یہ نا روا ہے

بس یہ ہے باعثِ خموشی　　لازم ہے خطا پہ جرم پوشی
ہر چند ہوں خاکِ راہِ تقصیر　　پر کچھ نہیں اور وجہِ تاخیر
اس عذر کو عذرِ لنگ کہہ کر　　کرنا نہ ستم، ستم زدہ دل پر
یہ لطف و کرم، یہ مہربانی　　پھر آپ سے مجھ کو سرگرانی؟
مدّت ہوئی ہو چکا سراپا　　موقوف مطالعۂ کتب کا
مصروفیت اور کچھ نہیں ہے　　افکار میں خاطرِ حزیں ہے
آمیزشِ تُرشئ محن سے　　مستی گئی بادۂ سخن سے
جز گریۂ غم نہیں رہا شغل　　کہنہ ہے کوئی، نہ ہے نیا شغل
تنّا بنّا نہ سیکھ پایا　　دلّی بھی گئے مگر نہ آیا
یہ طعنۂ سخت کج ادائی　　محروم کو دیجیے نہ بھائی!

صادق ہے، خاکسار ہے یہ
کچھ بھی ہو، وفا شعار ہے یہ

تقریظ بر کلامِ محروم طبع اول

(از مرسلہ حضرتِ مغموم کیتھلوی۔ بی اے)

جلوۂ شاہدِ مضموں ہے کلامِ محروم
پئے تسخیرِ دل، افسوں ہے کلامِ محروم

مستِ صہبائے سخن کرنے بے دُردیہ پر
غیرتِ بادۂ گلگوں ہے کلامِ محروم

ہر ورق اسکا ہے اک دفترِ جذباتِ لطیف
حدِ توصیف سے بیروں ہے کلامِ محروم

تیر و نشتر کا اثر رکھتے ہیں اشعار تمام
دشنہ ریزِ دلِ محزوں ہے کلامِ محروم

ایک ایک نظم ہے اشعارِ مسلسل کی لڑی
نور کا گیسوئے شبگوں ہے کلامِ محروم

از سرِ ہوش یہ مصرعہ پئے تاریخ لکھو
برق بآ عطرِ گل مضموں ہے کلامِ محروم

قطعہ

(حضرتِ محروم کی نظم محرومؔ کا وطن سے متاثر ہو کر)

حیرت کا ہے مقام کہ یہ خطۂ زمیں
صحرائے پرخطر ہو عمل جس کے نام سے

محروم سا سخنورِ شیریں کلام برقؔ
پیدا ہو ایسی خاک سے ایسے مقام سے

۱۹۷۰۵
محمد ۔ سمبت ۱۹۷۲ بکرمی

آنسوؤں کی وادی

(مرسلہ حضرت مغموم کیتھلوی۔ بی۔ اے)

جو تلخ کام ہے لذت کشِ غمِ دوراں — جسے نصیب یہاں روز داغِ تازہ ہے
شہیدِ برشِ شمشیرِ یاس ہیں ارماں — لہو جسے پئے روئے امید غازہ ہے

جو سر سے پاؤں تلک افسردگی کی ہے تصویر — چراغِ کشتہ ہے بزمِ نشاطِ ہستی میں
گرا ہے نظروں سے جو مثلِ اشکِ بے تاثیر — پڑا ہے غایتِ افتادگی سے پستی میں

ہے جس کا سنگِ حوادث سے چور شیشۂ دل — جو نیم جان گرانباریِ محن سے ہے
فلک زدہ ہے گرفتارِ دامِ صد مشکل — شکستہ حال غمِ حوصلہ شکن سے ہے

برنگِ سبزۂ بیگانہ جو باغِ دہر میں ہے — نہیں ہے جس کا کہ پرسانِ حالِ زار کوئی
غریب یکہ و تنہا عذابِ قہر میں ہے — نہ ہم نفس ہے، نہ مونس، نہ غمگسار کوئی

اڑا ہے رنگ تپِ غم سے مثلِ شمعِ سحر — جو ہے وفورِ تحیر سے پیکرِ خاموش
لگی ہے ضبط سے گو مہرِ خامشی لب پہ — زبانِ حال ہے جس کی نگاہِ یاس فروش

لطیف جس کے ہیں احساس نکہتِ گل سے — جبیں پہ سختیِ ایام چوٹ لگتی ہے
جو تیرہ روز پریشاں ہے بڑھ کے کاکل سے — جگر میں آتشِ غم رات دن سلگتی ہے

وہ ملک ہیں جسے اُمید کامیابی ہے — وہ فنکار ہے جس کی نظر میں مستقبل
ستم نصیب گرفتار مد و جزر ہے — کہ دل غریب ہے کشتِ امید کا حاصل

جدا علی سے یہاں وقف نامرادی ہے
نظر میں انکی جہاں آنسوؤں کی وادی ہے

منظومہ ۲۴- اپریل سنہ ۱۹۱۸ء

غزل

(ماخوذ از مخمسات جاوید جلد اوّل، مولفہ مرحوم الاسری رام ایم اے۔ پریس دہلی)

ابرو کا وار اور دلِ بیقرار پر — کیوں رکھ لیا غریب کو خنجر کی دھار پر؟
اُس برق وش نے جس کے تبسم کی لہر پر — بجلی گرائی خرمنِ صبر و قرار پر
سنئے تو کچھ نہیں یہ بُرا ماننے کی بات — دل دے تو کوئی آپ کو کس اعتبار پر؟
لی ہوگی جیتے جی مری کچھ آپ نے خبر — کچھ بعد مرگ آئیں گے میرے مزار پر

کنجِ قفس سے ہائے رہائی نہ ہو سکی
ہر چند عندلیب نے مارے ہزار پر

مثنوی سحر

(مرسلہ جناب کیلاش ورما شائق ہنگامی بی اے)

اے سحر طرازِ خوش بیانی — اعجاز نمائے نکتہ دانی
نقاشِ ادائے حسنِ جانسوز — جذبات نگارِ عشقِ دلدوز
جادو ہے ترے سخن سخن میں — ساحر ہے تو شاعری کے فن میں
دشینت و شکنتلا کا قصہ — ہے زورِ قلم کا تیرے حصہ
اردو میں یہ جدتِ سخن ہے — شیشہ ہے نیا مئے کہن ہے
انداز کلام ہے دلاویز — ہر مصرعہ تر ہے کیف انگیز
گلزار نسیم کی روش پر — گلکاریاں تو نے کی ہیں یکسر
تقلید میں اصل کی جھلک ہے — گلہائے قدیم کی مہک ہے
افسانہ نیاز و ناز کا ہے — اک تذکرہ سوز و ساز کا ہے
ماضی کا ہے حال کچھ ہویدا — تہذیب کہن کی شان پیدا
رشیوں کے وہ آشرم کا منظر — نظارۂ دشت روح پرور
وہ بہر شکار و سیر جانا — دشینت کا تیرِ عشق کھانا
وہ حسنِ شکنتلا کی تاثیر — معصوم اداؤں کی وہ تسخیر
گلشن میں نیا شگوفہ کھلنا — لڑتے ہی نظر دلوں کا ملنا

سرنامۂ شوق کی وہ تحریر — پتے پہ کنول کے دل کی تصویر
دونوں کی وہ رسم کتخدائی — وہ وصل، وہ ساعتِ جدائی
چور کا رنج مول لینا — دُرباشا رشی کا شاپ دینا
تقدیر کے ہاتھوں ردِّ تدبیر — دشینت بشکنتلا کی تقریر
راجہ کا وہ پھر انگوٹھی پانا — بھولا ہوا عہد یاد آنا
بیتابیٔ دل، تلاشِ جاناں — دن پھرنے کا غیب سے وہ ساماں
دشینت کی زور آزمائی — دیوانِ سپہ سے وہ لڑائی
وہ اندر کی بزم کا نظارا — فردوس کا جلوۂ دلآرا
ناکام کا کامگار ہونا — گم گشتہ سے پھر دوچار ہونا
وہ عشق کی حسن سے ملاقات — وہ ہجر کے بعد وصل کی رات
اے برقؔ یہ داستانِ رنگیں — ہے لائقِ آفریں و تحسیں

(از زمانہ بابتہ نومبر ۲۶ء)

ابرِ بہار

مطلعِ روشن ہے ظلمت خانۂ ابرِ بہار — برق ہے زینت دہِ کاشانۂ ابرِ بہار
ہیں نوائے سازِ فطرت کے مرے کان آشنا — رعد سے سنتا ہوں میں افسانۂ ابرِ بہار
بسکہ حق میں تشنہ لب ہیں نونہالانِ چمن — ہو گیا اندازۂ پیمانۂ ابرِ بہار
شاہدِ بارانِ رحمت ہے جہانِ رنگ و بو — برگ برگِ گل پہ ہے افسانۂ ابرِ بہار

سحر یعنی منشی اقبال ورما سحرؔ ہتگانوی [illegible]

جلوۂ ویر

درد مند بیکساں درد آشنا پیدا ہوا
خستہ جانوں کا ضعیفوں کا عصا پیدا ہوا
غمزدوں کا گمرہوں کا آسرا پیدا ہوا
غم شریک و غمگسار و غم رُبا پیدا ہوا
کشتۂ عمر رواں کا ناخدا پیدا ہوا
ویر ہی دنیا میں سچا رہنما پیدا ہوا

امن کا پیغام لایا تھا زمانے کے لئے
کشت و خوں کا نام دنیا سے مٹانے کیلئے
رحم کا، اُپکار کا سکہ چلانے کیلئے
گمرہوں کو موکش کا رستہ دکھانے کیلئے
خضر منزل مظہر صدق و صفا پیدا ہوا
ویر ہی دنیا میں سچا رہنما پیدا ہوا

جیو رکھشا کا سبق اُس نے بچشم تر دیا
شانتی کا، دھرم کا پیغام جاں پرور دیا
درد سے اُس نے ستمگاروں کے دل کو بھر دیا
رسم قربانی ہی کو قربان اُس نے کر دیا
خلق کا راحت رساں حاجت روا پیدا ہوا
ویر ہی دنیا میں سچا رہنما پیدا ہوا

اُس پہ ظاہر راز تھا آغاز میں انجام کا
اُس کے ہر اُپدیش میں تھا فلسفہ "نشکام" کا
وہ سراپا درد تھا غمخوار خاص و عام کا
کیوں نہ پھر ڈنکا بجے دنیا میں اُس کے نام کا؟
کون کہہ سکتا ہے ایسا دوسرا پیدا ہوا
ویر ہی دنیا میں سچا رہنما پیدا ہوا

پوسٹنے قابل ہے جو خار جگر پیدا ہوا ہے ... صداقت کیش کا آنکھوں سے اسپر صاد ہے
برق تازہ ورسکے لطف و کرم کی یاد ہے ... جینتی کے اُنسے اِک زمانہ شاد ہے

دھرم کی صورت مجسم دیوتا پیدا ہوا
دیری دنیا میں سچا رہنما پیدا ہوا (از گلدستۂ عقیدت)

نغمۂ معرفت

لو نیرنگ ہستی رہزنِ دل ہو گیا ... ہر قدم راہِ طلب میں پہلی منزل ہو گیا
سا ایں بیدار جب احساسِ کامل ہو گیا ... منزلِ ہستی کا ہر فقرہ مجھے دل ہو گیا
ب ِمانی رکش صورت گرِ دل ہو گیا ... آپ کا آئینہ مدِ مقابل ہو گیا
بساطِ دہر میں تھا نقطۂ رازِ حیات ... پیکرِ خاکی میں جو بن گیا وہ دل ہو گیا
لیا ہستی بنا پردہ حجابِ راز کا ... سازِ ہے مضراب جو تارِ رگِ دل ہو گیا
ن کو ہنگامہ آرائی ہوتی تھی منظر ... رنگ گلشن بن گیا، نیرنگ محفل ہو گیا
اٹھا لائی زندگی ہنگامہ زارِ آرزو ... محشرستان تمنا خانۂ دل ہو گیا
ظاہر بھی کیا اُسکا جلوہ بے حجاب ... پردۂ تابِ نگاہِ شوق حائل ہو گیا
ہ حسنِ حقیقی کی لطافت دیکھنا ... قوتِ ادراک کو احساس مشکل ہو گیا

برقؔ اُس کی زندگی ہے درحقیقت زندگی
جس کو دنیا میں سکونِ قلب حاصل ہو گیا (از گلدستۂ عقیدت)

نسیمِ عرفاں[۱]

(افتخار الشعراء حضرت بیخود دہلوی کی نظم)

اے شاعرِ خوش بیانِ منور   اے مفخرِ سخنوراں، منوّر
سرآمدِ طرزِ نکتہ دانی   دلدادۂ شاہدِ معانی
نقاشِ ادائے حسنِ فطرت   غمازِ نوائے رازِ قدرت
سرمستِ شرابِ نابِ عرفاں   جاں باختۂ سرودِ مستاں
تو ہے مئے معرفت کا ساقی   تا دیر رہے گا نام باقی
گیتا کو کیا ہے نظم کیا خوب   پیرایہ ہے دلنشیں خوش اسلوب
اُردو میں یہ فلسفہ نگاری   یہ حسنِ رقم، یہ سحر کاری
اعجازِ سخن یہ گلفشانی   رنگینی، شگفتگی، روانی
یہ رازِ جلی کی ترجمانی   یہ سترِ خفی کی غیب دانی
تالیف کا حق ادا کیا ہے   حق یہ ہے کہ اصل کا مزہ ہے
فردوسِ لطف ہے حسنِ تحریر   ویدانت کے فلسفے کی تفسیر
فرحت دہِ جاں، نسیمِ عرفاں   ہے پیکِ بہارِ باغِ رضواں
تازگیِ روح، وجد انگیز   بوئے گلِ معرفت سے لبریز
گنجینۂ جوہرِ طریقت   آئینۂ جلوۂ حقیقت

---

(۱) نسیمِ عرفاں، مولوی منشی بشیشور پرشاد صاحب منور لکھنوی کی بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ

یہ اہلِ نظر کا ارمغاں ہے اکسیرِ حیاتِ جاوداں ہے
بھگوان کرشن کا یہ اپدیش ویدوں کا ہے سلسلے پس و پیش
مقبول ہو برقؔ یہ صحیفہ
ہر طالبِ حق کا ہو وظیفہ

ضیائے وید سے معمور ہے ہر دل کا کاشانہ

(ماخوذ از گلدستۂ عقیدت)

تجلی پاش ہو ہر سو شعاعِ حسنِ جانانہ
ضیائے وید سے معمور ہے ہر دل کا کاشانہ

اگر نروان ہو کافی حقیقت تو ہے دیوانہ
جو چڑھا دے دھرم کی ویدی پہ جان و دل کا نذرانہ

اہنسا کا رہیگا تا ابد دنیا میں افسانہ
یہ ہے زریں اصولِ زندگی، فعلِ حکیمانہ

حقیقت بیں نظر ہی دیکھ دنیا کے تماشوں کو
تو ہو چیتن نہ رکھ ان سے جو دیں چھوڑیں کبھی یارانہ

مرقع تیاگ کا ہے زندگی مہاویر سوامی کی
لیا ویراگ چھوڑا اس نے تاج و تختِ شاہانہ

اہنسا کا اگر عامل ہے، دل میں درد پیدا کر
تصدق جان کر دے بیکسوں پر دردمندانہ

ستا ہرگز کسی کو تو نہ قول و فعل سے دل سے
ہر اک ذی روح پر جاری ہے فیضِ کریمانہ

گلِ مضموں چنے ہیں برقؔ ہم نے فکرِ رنگیں سے
کہ یہ پشپانجلی ہے ویر کی محفل کا نذرانہ

عرفانیات

حسن خود اپنے ہی انداز کا شیدائی تھا ۔ جو تماشا تھا، وہی آپ تماشائی تھا
پس پردہ جو ترا جلوۂ رعنائی تھا ۔ حسن آئینہ پئے چشم تماشائی تھا
گل خوش رنگ میں بو حسن میں زیبائی تھا ۔ تیرا جلوہ کہیں پنہاں کہیں پیدائی تھا

مرسلہ حضرت بیتاب بریلوی

نقش صناع حقیقی میں یہ نیرنگی ہے ۔ کسی تصویر سے ملتی کوئی تصویر نہیں
تابش حسن سے خیرہ ہوئی جاتی ہے نظر ۔ پردۂ روئے درخشاں ہے یہ تنویر نہیں
کھلی آنکھوں نظر آتا ہے جو نیرنگ حیات ۔ جز فنا اور کچھ اس خواب کی تعبیر نہیں
زینت عالم اسباب ہے نیرنگی سے ۔ رونق ہستی فانی ہے یہ تغیر نہیں
دل میں قائم ہے پرتو ترے رخ کا کیونکر ۔ عکس سایہ ہے کچھ آئینہ کی جاگیر نہیں
تن بہ تقدیر رہے دار مکافات میں برقؔ ۔ اور راضی برضا رہنے کی تدبیر نہیں

مرسلہ حضرت مغموم کیتھلوی

نہ گل پھولوں میں ہو جس سے گھسیٹا جلکا نوش ۔ برنگ سبزۂ باغ دہر میں رہ سب سے بیگانہ
نیاز و ناز حسن و عشق ہو جائینگے پھر روشن ۔ کر اپنے دل میں پیدا سوز و ساز شمع و پروانہ
نفس کی آمد و شد ہم کو یہ پیغام دیتی ہے ۔ کہ دم میں زیست کا ہی ختم ہو جانے کو افسانہ
برنگ ابر تر سیلاب کر آتش بجانوں کو ۔ پرائی آگ میں بیساختہ گر مثل پروانہ

(ماخوذ از گلدستۂ عقیدت)

تقریظ

دستۂ گل ہے شعلہ زارِ نظر
سامری شے ہے شعلہ زارِ نظر

تازگی کا وفور ہے اس میں
راحت افزا سرور ہے اس میں

یہ ہے مرقع بہار کا نظم
نقش بستہ ہے یا ترانۂ نظم

بس جو رنگینیٔ بیاں کہیے
گل مضموں کا بوستاں کہیے

کتنا مژدہ آفریں کلام ہے یہ
مے عنب دل کا جام ہے یہ

کہتے ہیں نظم فلسفے کے نکات
بھر دیا رنگ نغمیٔ جذبات

ہے کہ انداز شوخیٔ تحریر
دل پہ کھنچے ہیں نقش نقشِ تصویر

لطفِ مضموں بھی ہے زباں بھی ہے
حسنِ معنی بھی ہے بیاں بھی ہے

ایک مجموعۂ فصاحت ہے
ایک شیرازۂ بلاغت ہے

شعر شعر اس کا داد کے قابل
مصرع مصرع ہے داد کے قابل

ارمغانِ بہارِ علم ہے یہ
منظرِ شاعری کا قلم ہے یہ

یہ ہے اس سید القوم کا کلام
جس کا مشہور یوگراج ہے نام

جو بہشتی سخن کا نام لیوا ہے
جس کا کسب کمال شیوہ ہے

اسکو پرکھیں کہاں ہیں اہل نظر
شعلہ زارِ نظر ہے سلکِ گہر

جوں ہو ہوں ہیں اسکے فعلنے
اس سے غافل نہ ہوں کبھی غافلنے

---

۱ شعلہ زار یعنی سید الاقلیم پنڈت یوگراج نظر سہارنپوری کی دلآویز نظموں کا مجموعہ افسوس کہ ابھی ناشائع مکمل نہ تھا کہ فوت ہو گئے۔ طالب دہلوی

قدرِ سب اس کی ہاتھوں ہاتھ کریں　　اہلِ شعر و سخن کی بات کریں
نغمہ ہائے برقِ حزیں　　ہو دل افروز یہ کلامِ متیں
خلعتِ شہرتِ دوام ملے
اس کو حسنِ قبولِ عام ملے

اعجازِ تغزّل

(مرسلہ حضرت بیتاب بریلوی)

بانکپن کی جو حسینوں میں ادا ہوتی ہے　　عاشقوں کیلئے پیغامِ قضا ہوتی ہے
نیچی نظروں کی نگاہ وش بھی بلا ہوتی ہے　　اسی شوخی پہ تو قربان حیا ہوتی ہے
دلکشی جبیں ہو انداز اُسے کہتے ہیں　　چھین لیتی ہے جو دل کو وہ ادا ہوتی ہے
بھری محفل میں تری آنکھ نے مارا مجھکو　　اس کو آتی ہے اجل جس کی قضا ہوتی ہے
ہمہ تن گوش ہوں میں وصل کا سائل ہو کر　　ہاں نہیں منہ سے ترے دیکھئے کیا ہوتی ہے
ان حسینوں کی ادائیں بھی نرالی دیکھیں　　جس کی نظروں میں ہیں اُن سے حیا ہوتی ہے
مر کے منزل پہ پہنچتے ہیں مسافر اس کے　　جان پر کھیل کے طے راہِ فنا ہوتی ہے
عہدِ پیری میں کہاں رہتا ہے وہ جوشِ شباب　　نوجوانی بھی کوئی دن کی ہوا ہوتی ہے
برقؔ پرکالۂ آتش ہیں حسینانِ جہاں
تم کو ان میں مروّت نہ حیا ہوتی ہے

کفرِ عشق

گلدستۂ شگفتہ بیانی ہے کفرِ عشق
گلزارِ نظم و گنجِ معانی ہے کفرِ عشق

ساحر کی فکرِ طبع کا مجموعۂ لطیف
اعجازِ حسنِ سحر بیانی ہے کفرِ عشق

ڈوبی ہوئی ہے رنگِ تصوف میں ہر غزل
جذباتِ معرفت کی کہانی ہے کفرِ عشق

سرِ مطلعِ حقائقِ فطرت کہوں اسے
یا کارنامۂ ہمہ دانی ہے کفرِ عشق

پردے میں نظم کے ہے حقیقت کا انکشاف
دیدانت کا پیام زبانی ہے کفرِ عشق

حسنِ ازل کی اس میں ہیں وہ برق پاشیاں
گویا کہ طورِ جلوہ فشانی ہے کفرِ عشق

دیکھیں بچشمِ شوق اے اہلِ دل تمام
گنجینۂ رموزِ معانی ہے کفرِ عشق

اے برقؔ یہ صحیفۂ رنگیں ہے بے مثال
دیوانِ نظمِ غالبِ ثانی ہے کفرِ عشق

۱؎۔ کفرِ عشق، سالکِ راہِ طریقت، مجموعۂ فضیلت، شاعرِ شیوا زباں جادو بیاں آنجہانی پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کی کل اردو نظموں، غزلوں اور دیگر متفرق کلام کا نادرِ روزگار مجموعہ ہے۔

طالب دہلوی

تیر و نشتر

جو ہم پیمانۂ اُسکی نرگسِ ناز آفریں ہوتی — کسے پھر حسرتِ جامِ شرابِ آتشیں ہوتی؟
نظر رد کی ہوئی، چتون پہ بل چیں بر جبیں ہوتی — نہیں کا لطف جب تھا یوں ترے منہ سے نہیں ہوتی
جو دلمیں آگ تھی، لب آہِ آتشیں ہوتی — بھڑکتی آتشِ اُلفت کہیں ظاہر کہیں ہوتی
سرِ محشر اُدھر خلقِ خدا نظارہ بیں ہوتی — اِدھر دستِ طلب ہوتا اور اُنکی آستیں ہوتی
مزا تھا وصل میں بیباک چشمِ شرمگیں ہوتی — نکلتا پہلوئے اقرار جسمیں وہ نہیں ہوتی
نہ ہوتی لاگ درپردہ اگر حُسن و محبت میں — تو دل کے پار کیوں تیری نگاہِ اولیں ہوتی
مزا تھا حشر تک جاتا نہ حسن و عشق کا جھگڑا — ہماری اُنکی آپس میں جو ہوتی تھی یہیں ہوتی
نہ ہوتا محو جسکا نقشِ اوّل تا دمِ آخر — محبت صفحۂ دل پر وہ حرفِ دلنشیں ہوتی
دوبالا بانکپن ہوتا ادائے دلربائی میں — اگر شوخی کی پردہ دار چشمِ شرمگیں ہوتی

نہ مٹتی برق شانِ پردہ داری جوشِ وحشت میں
مزا جب تھا کہ پیوندِ گریباں آستیں ہوتی (حضرت مغموم)

کچھ نہیں جز خامشی فریادِ بلبل کا جواب — ایک چپ سو کو ہراتی ہے یہ ہر گُل کا جواب
مست ہوں صدقے میں ساقی کی گلابی آنکھ کے — بے پیئے ہے میری مستی نشۂ مُل کا جواب
پُر عرق ہو کر ترے رخسارِ تابِ حُسن سے — بن گئے ہیں شبنم آلودہ رخِ گُل کا جواب

جلوے ہیں لاکھ بلبلے سو مری تربت پہ پھول — رنگ ہو تو بنیا ہے چادرِ گل کا جواب
ہا پوچھیں عشق کیا شے ہے کہ ہیں — دم بدم ہیں کیا وہاں اہلِ تجاہل کا جواب
سن کے شوقِ آرزو وہ مسکرا کے چپ ہوئے — اک ادائے شرمگیں ہے دیدِ سائل کا جواب
واہ وا کیا گل کھلائے تیغِ قاتل واہ وا — میرا اک اک زخمِ تن ہے خندۂ گل کا جواب
سرخیٔ رنگِ شفق کیوں ہو نہ رنگیں سر بسر — دامنِ عاشق بنا ہے دامنِ گل کا جواب
جب صبا نے مشامِ جاں معطر کر دیا — ہے شمیمِ زلفِ جاناں نکہتِ گل کا جواب
وقفِ پرواز ہے کنجِ قفس میں عندلیب — اے نسیمِ صبح تو پہنچا اسے گل کا جواب

کس قدر لے بہرِ گل ہے محوِ استغنائے حسن
چھوٹے منہ دیتا نہیں فریادِ بلبل کا جواب (حضرت مغموم)

بقائے رنگ کہاں گلشنِ جہاں کے لئے — بہارِ خندۂ گل وقف ہے خزاں کیلئے
شاں ہیں تکلم مری زباں کے لئے — ملا ہے دل مجھے ضبطِ غمِ نہاں کیلئے
ماند ہستی نہ ہو سوزِ غم ہے دل — ہزار تیر ہیں اک قلبِ خونچکاں کیلئے
الم سے سراپا ہوں شعلۂ خاموش — زبانِ شمع ہے ازرہِ بیاں کیلئے
غیر انجمن میں ہے آتشِ گل تیز — ہے یہ آگ نہ بلبل کے آشیاں کیلئے
راتی پھرتی ہے صبا ... — نہ ہیں زمیں کیلئے ہوں نہ آسماں کیلئے
سے ٹپکتا ہے رنگِ سوز بیاں ... — یہ آج حشر کا ساماں ہے کہاں کیلئے؟

شکل عیاں ہے غصے سے ابرو تن پر   چمکی ہے تیغ دودم ایک نیم جاں کیلئے
ہے جس کے واسطے ہونے اسی کو زیبا ہے
کہ راستی ہے ناوک ستم کماں کے لئے
(حضرت بیتاب بریلوی)

نقش جو اصل کی ہوتی کبھی تاثیر نہیں   دہن تنگ گل کی طرح غنچۂ تصویر نہیں
نگہ ناز سے بچتا کوئی نخچیر نہیں   جو بہک جائے نشانے سے یہ وہ تیر نہیں
کارگر وصل کی ہوتی کوئی تدبیر نہیں   راہ پر آئیں وہ، ایسی مری تقدیر نہیں
دل کے بہلانے کو کافی تری تصویر نہیں   اسمیں ہے حسن ادا، خوبئ تقریر نہیں
اس نے یہ کہہ کے کماں کو کیا مجھ پر خالی   آج مقتل میں نشانہ نہیں یا تیر نہیں
قتل کرنے مجھے کس شان سے وہ آتے ہیں   تیر ترکش میں نہیں، ہاتھ میں شمشیر نہیں
عیب بھی حسن ہے ان لالہ عذاروں کیلئے   ان کی دزدیدہ نظر داخل تزویر نہیں
برق دکھلائیں کسے گرمئ تاثیر کلام
آج اس بزم میں دلی کے مشاہیر نہیں   (حضرت [illegible])

فروغ انجمن ہے سوز و ساز شمع و پروانہ   ہم ان معنوں کو دو جگری محفل سمجھتے ہیں
نگاہ ناز دور سے ڈالتی ہے عمل پردہ پردہ   ہمیں گھر بیٹھے ہم خوب سب قاتل سمجھتے ہیں

جہاں - اخلاقیہ بیان [illegible] حضرت [illegible] الدین تبریزی کی

تجاہل ہے سوالِ وصل پر انجان بن جانا — ادائیں کہہ رہی ہیں مدعا ہے حل سمجھتے ہیں

وئی طوفاں زدہ سمجھے گردابِ بلا پہنچے — کہ بس کشتی کو یاران لبِ ساحل سمجھتے ہیں ؟

ٹھکانا دیکھو یہی گردشِ قسمت کے ماروں کا — کہ جس جا پاؤں شل ہو جائیں وہیں منزل سمجھتے ہیں

ہنسی آتی ہے مجھکو برقؔ اُن کی سادہ لوحی پر
جو اس دار المحن کو عیش کی منزل سمجھتے ہیں

(حضرت بیتاب بریلوی)

ہاں یہ قطرۂ شبنم ٹپکتے ہیں رُخِ گُل سے — پسینہ آگیا ہے گرمیٔ فریادِ بلبل سے

ی پھولوں کے ماتم نہ مجھی کو شادیٔ بلبل کی — ہنسی زخموں نے میرے چھین لی ہے خندۂ گل کی

لکت سے دمِ رفتار گِن گِن کر قدم رکھیے — کہیں نازک کمر بل کھا نہ جائے بارِ کاکُل سے

چھلتے سے کسی کے خونِ ناحق چھپ نہیں سکتا — عیاں ہے خونِ بلبل سرخیٔ رنگِ رُخِ گُل سے

بہاران جا تلک آ ہی جاتی ہے اسیری میں — تو یہ فیضِ گُل بادِ بہاری کے توسل سے

ب آموزِ میخانہ ہے طرزِ انکساری کا — کہ ہر شیشہ ملا کرتا ہے جھک کر ساغرِ گُل سے

ا بے فیض سے ہوتا ہے کس کو فیض دنیا میں — نہیں آتی ہے خوشبو نام کو بھی شمع کے گُل سے

قناعت چاہیے انسان کے لئے برقؔ دنیا میں
بہت سی مشکلیں آسان ہوتی ہیں توکُل سے

ماخوذ از زبانِ دہلی

حاصل ہوئے خارِ الم و داغِ جگر بھی
کانٹے بھی ملے باغِ جہاں سے گلِ تر بھی

اغیار تو سیراب ہوئے بارِ دگر بھی
او مستِ مئے حسن! کوئی جام اِدھر بھی

تم دیکھ لو محفل میں کنکھیوں سے اِدھر بھی
کیا میرے مقدر کی نہیں نیم نظر بھی

آئینے سے مجھ ایسے نہیں ملتی ہے نظر بھی
آتے ہی جوانی تمہیں کیا لگ گئے پر بھی؟

چھپتا ہے کہیں محفلِ دشمن کا اثر بھی
غماز ہے جھینپی ہوئی چتون بھی نظر بھی

فرقت سے جوانی میں چراغِ سحری ہوں
ظاہر ہیں مری شام سے آثارِ سحر بھی

دیکھی ہے محبت میں اپنی آنکھوں سے ہم نے
شامِ شبِ امید بھی، فرقت کی سحر بھی

سیراب تمنا ہوں لب تشنۂ الفت!
آنسو بھی ہیں پینے کے لئے خونِ جگر بھی

آنکھوں میں رہے یا رہے دل میں ترا جلوہ
اس کے لئے موجود یہ گھر بھی ہے، وہ گھر بھی

جلنے کا مزا جب ہے کہ اے سوزِ محبت
خاکستر پروانہ بنے شمعِ سحر بھی

ہستی سے گیا سوئے عدم خاک میں مل کے
لپٹی رہی دامن سے مرے گردِ سفر بھی

اشکوں سے صفا ہو کے نکلتے ہیں یہ شکوے
مژگاں سے الجھتا نہیں دامانِ نظر بھی

مخمور ہوں میں برقؔ مئے نابِ سخن سے
بے کیف ہے ہستی سے مری تشنۂ زر بھی

مرسلہ حضرت بیتاب برہی

بے تکلیف خاموشی دمِ عرضِ وصال
انصاف یہ ہے یہ بھی تصویرِ دل آرائی تھا

مرسلہ حضرت بیتاب

خراشِ ناخنِ غم سے بھرے ہیں زخمِ جگر　　　خزاں نصیب چمن میں بہار باقی ہے
جو دل ہی بجھ گیا کیا لطفِ زندگی اے برقؔ　　　یہ ہم نے مانا جوانی ہزار باقی ہے

(مرسلہ حضرت بیتاب بہاری)

کافی ہے ایک جنبشِ بادِ فنا مجھے　　　مثلِ حباب بحر ملی ہے بقا مجھے
تیرِ نگاہ ناز کی اس میں خطا نہیں　　　دل آپ کہہ رہا ہے نشانہ بنا مجھے

مرسلہ حضرت بیتاب بہاری

تیرِ قضا کی زد پہ ہدف بن کے آگیا　　　دل آپ ہو گیا ترے پیکاں کے سامنے

(راز زمانہ)

ہیں دل میں رنج و غم کے فسانے بھرے ہوئے　　　لاکھوں سناؤں گر کوئی دردآشنا ملے

جس طرف آئیگی یہ شکلِ قیامت آئے گی　　　ترک سنگی کیا کسی پر جب طبیعت آئیگی
ہم اگر خاموش ہیں تو کچھ اسی میں خیر ہے　　　ورنہ اُف بھی کی تو یہ سمجھو قیامت آئیگی

مرسلہ حضرت معصوم کیتھلوی

اقرارِ وفا کا بھی کیا اُس نے زبانی　　　کچھ اور اشاروں سے بھی ارشاد ہوا ہے
آیا ہے تصور دلِ برباد میں تیرا　　　اُجڑا ہوا گھر پھر سے کہ آباد ہوا ہے
پیش آیا وہی تھا جو رقم لوحِ جبیں پر　　　قسمت کا نوشتہ مری روداد ہوا ہے
تا زیست ہی مختارِ عمل خاک کا پتلا　　　جب خاک ہوا ہستی برباد ہوا ہے

یہ برقیؔ مرے حسنِ تخیل کا ہے اعجاز
ہر شعر مرا مستحقِ داد ہوا ہے

(از زمانہ کانپور)

ادھر ذوقِ تماشا اور ہے حدِ سرِ فزوں وہ بھی
ادھر اک بے نیازی دشمنِ صبر و سکوں وہ بھی

غمِ الفت ہے دل میں موجزن درد دروں وہ بھی
تڑپ ہے قلبِ مضطر میں بہ انداز سکوں وہ بھی

بظاہر فرق ہے فرہاد و مجنوں کے فسانوں میں
حقیقت میں تھا یہ بھی کشتۂ ذوقِ جنوں وہ بھی

حیات افروز عالم! دیکھ لی شانِ کرم تیری
عطا عمرِ رواں کی ہے اسپ عمرہ بے سکوں وہ بھی

غضب کی کامگاری، نامرادی عشق میں اپنی
حقیقت میں ہے یہ بھی خوبیِ بختِ نگوں وہ بھی

کسی کا نیم جلوہ برقِ آشوبِ قیامت ہے
مگر حق میں ہے برقِ خرمنِ صبر و سکوں وہ بھی

(از زمانہ کانپور)

ذوقِ نظارہ کہیں دیدہ سے معذور نہیں
پردۂ قلب میں کیا جلوۂ گہِ طور نہیں

(از زمانہ کانپور)

نہ ہوتا قیس رسوا پردہ رہ جاتا محبت کا
تجھے شرمِ وفا کے لیے محمل نشیں ہوتی

(مغموم)

جنھوں نے آنکھ ملائی وہ زخم کھا کے چلے
غضب کے تیر تری چشمِ سرمہ سا کے چلے

مرسلہ حضرت مغموم

دم ہو گیا فنا مرا آہِ رسا کے ساتھ
گل شمعِ زندگی ہوئی موجِ ہوا کے ساتھ

ضد ہے شبِ وصال دلِ مبتلا کے ساتھ
در پردہ مل گئی تری شوخی حیا کے ساتھ

مرسلہ حضرت مغموم

برق بے کیف گذرتے ہیں شب روز فنا		مے انگور نہیں، ساغر پر نور نہیں

مرسلہ حضرت مغموم

در پیش نہیں ہیں نئی روز و شب مجھے		دار المحن میں کیا ہوا امید طرب مجھے
ناآشنا ہے لذت شادی ہوں دہر میں		جو تشنۂ صد لب ہیں ملے ہیں وہ لب مجھے

مرسلہ حضرت مغموم

شور آتش الفت کو آنسو کیا بجھائینگے؟		یہ شعلے ایسے چھینٹوں سے کہیں خاموش ہوتا ہے؟
تو دلگیری کی سب یوں لہر اٹھتی ہے طبیعت میں		کبھی اُترے ہوئے دریا میں جیسے جوش ہوتا ہے

مرسلہ حضرت مغموم

تیر قتل ممنی ہے نازکی اور سخت جانی میں		بس اب کھل جائیگا ہر تیغ قاتل کتنے پانی میں

مرسلہ حضرت مغموم

کبھی تو ہم سے ہوگی تیری برگشتہ نظر سیدھی		پھرینگے دن ہمارے بھی ہوئی قسمت اگر سیدھی
پھنسے ہے ابل گئے سدم مرقد میں دم لے کر		تھکے ہارے مسافر ہیں، ذرا کر لیں کمر سیدھی

مرسلہ حضرت مغموم

باب نهم

اُن ادب نواز ہستیوں کی جانب سے جنھوں نے یہ معلوم
ہونے پر کہ "یادگارِ برق" زیرِ ترتیب ہے، اپنے تاثرات بصورتِ
نظم مرحمت فرمائے۔

طالب۔ دہلوی

یادِ برق

(از قلمِ سحر رقم شاعرِ اعظم مصوّرِ غم جناب منشی تلوک چند صاحب محروم بی اے)

برقِ مرحوم کی جو یاد آتی ہے
محروم! دلِ زار کو تڑپاتی ہے

وہ طبعِ شگفتہ اور خنداں چتون
بجلی سی خیال میں چمک جاتی ہے

وہ طبعِ رواں، وہ خوش بیانی تیری
وہ نکتہ رسی، وہ نکتہ دانی تیری

اے برق ترا شباب میں مر جانا
تھی چشمک برق زندگانی تیری

اے برقِ نظر فروز! تجھکو کھو کر
احباب ترے بیٹھے ہیں بے بس ہو کر

کیا یاد ہماری بھی کبھی آتی ہے؟
کرتے ہیں تجھے جو یاد ہم رو رو کر

مُرسلہ حضرت مغموم

قطعات

(از مولانا عبدالحق صاحب اختر واصفی)

(۱)

دریغا وا دریغا - وا دریغا | کہ رفتہ برق تابندہ ز دنیا
ز شعرے شعر او بالا نشستہ | بہ نثرہ نثر او عہدے ببستہ
امام شاعراں بودو یگانہ | بہ استادیئے او قائل زمانہ
بود سعدی و حافظ را بشیراز | بذات برق ہندی کرد صد ناز
نوشت اختر سنش از فرق بیباک | تا بہ برق مہر آسا بر افلاک

ھ۱۳۵۲ ۲۰ + ۱۳۵۲

(۲)

دریغا سخن سنج جادو بیاں | چو برق جہاں شد ز چشم نہاں
فصاحت بلاغت کنیزان او | معانی بیاں خانہ زادان او
فصیحے نزاید جہاں آں چناں | بلیغے نہ بیند دگر بہ الزماں
اگرچہ ہمہ عمر در شعر باخت | نظیری بدنیا لطیفش نیافت
سنش گفت اختر بہ فرق الم
کہ سرپیر سخن شد عطارد رقم

ء۱۹۳۶ = ۱ + ۹ ...

(مرسلہ حضرت مغموم)

گلہائے عقیدت

(جناب گلشن جلال آبادی)

لب پہ جس لحظہ آیا نام برقؔ — دل کو یاد آگیا پیام برقؔ
عصر حاضر کے شاعروں کیلئے — مشعل راہ ہے کلام برقؔ

گوشہ قلب میں ہے جائے برقؔ — زندہ اب تک ہیں نغمہائے برقؔ
تھی صدا اسکی، بانگِ رستاخیز — اور اعلانِ "قُم" نوائے برقؔ

سن کے گلشن نوائے سازِ برقؔ — دل ہوا آشنائے رازِ برقؔ
مایۂ فخر ہے وطن کے لئے — باہمہ اوجِ فن، نیازِ برقؔ

(مرسلہ حضرت مغموم)

نذرِ عقیدت

(جناب چودھری اقبال احمد شوق سہسوانی)

(مرسلہ جناب رائے مایا کرشن سکسینہ۔ رئیس سہسوان ضلع بدایوں۔ یو۔پی)

جذبۂ کیف ادا برق کی تقریر میں تھا — اور جادو کا اثر شوخیٔ تحریر میں تھا

وہ کلام اور وہ اندازِ بیاں کیا کہنا — یہ زباں کیا تھی کہ جوہر دمِ شمشیر میں تھا

حسن و خوبی کرہ الفاظ کی ترتیب و نشست — جیسے دریا کوئی طوفاں گہِ تحریر میں تھا

وہ سلاست وہ لطافت وہ ادائے مضمون — قلزمِ حسنِ بیاں موجۂ تقریر میں تھا

بے تکلف وہ مضامین، وہ معیارِ بلند — تیر و نشتر کا اثر شعر کی تاثیر میں تھا

جوشِ آمد کہ سرِ آب پہ تیرے کوئی — حسنِ بندش، کہ نوشتہ خطِ تقدیر میں تھا

شعریت جسکی اداؤں سے نمایاں ہو جائے — حسنِ ایجاد وہ اس پیکرِ تصویر میں تھا

فطرتاً جسکو عطا کی گئی تکمیلِ مذاق — خلقتاً جس کا عمل ذوق کی تعمیر میں تھا

شکل تھی یا کوئی آئینۂ نیرنگِ جمال — حسن تھا یا کوئی کمالِ فنِ تسخیر میں تھا

اپنی کوشش سے ملا ہو جسے یا اوجِ عروج — یہ کمال ایک فقط برق کی تعمیر میں تھا

جو بہ اندازِ عمل ایک مناسب انسان — جسکا ہر فعل کسی مصرفِ تعمیر میں تھا

جسکی ہر بات ہو دلبر تو ادائیں دلکش — یہ کرشمہ فقط اس حسنِ جہانگیر میں تھا

برق کی مدحت تعریف کروں کیا اے شوق — حسن کا دیوتا اس پیکرِ تصویر میں تھا

تصحیح الاغلاط

غلط نامہ طویل ہو جانے کے خیال سے اعراب اور اضافتوں کی غلطیاں درج نہیں کی گئی ہیں۔ اگرچہ اضافتوں کی غلطیاں اکثر جگہ رہ گئی ہیں، اور بعض مقامات پر مضاف کی جگہ مضاف الیہ میں اضافت لگ گئی ہے۔

حتی الوسع یہ کوشش کی گئی ہے کہ اور غلطیاں نہ رہیں لیکن پھر بھی یہ دعوی نہیں کیا جاسکتا کہ یہ مجموعہ کتابت کی غلطیوں سے پاک ہے جو غلطیاں رہ گئی ہیں انکے لئے ہم معافی طلب ہیں۔

چونکہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن جلد شائع ہونیکی امید ہے اسلئے ہم اُن حضرات کے بہت ممنون ہونگے جو اس مجموعہ کی خامیوں سے ہمیں آگاہ فرمائیں۔

طالب دہلوی بی اے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۴	۶	تھیں	دُکھتی تھیں
۱۶	۱۳	بقولیکہ	بقولے
۱۸	۱۵	کرنی	کرنا
۳۲	۱۲	ہی	دہی
۴۲	۱۷	٭	بھی
۷۱	۵	شعر	اشعار

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷۱	۱۲	تھے	لیک
۹۳	۶	ہی	سہی
۱۰۰	۱۰	چلبتا	ارچا
۱۰۰	۱۰	ہنسا	اہنسا
۱۳۸	۷	کرشن درپن	کرشن درپن میں
۱۴۶	۴	اخضر	اخضر
۱۴۷	۵	جلوہ میمیں	جلوۂ رنگیں
۱۴۹	۸	دوسر	دوسرے
۱۴۹	۱۱	کبی	کبھی
۱۸۵	۸	سجھا	سمجھتا
۲۱۰	۱۳	ہے	×
۲۱۶	۸	نوشچار	نوشنمار
۲۱۹	۴	زرمگاہ	رزمگاہ
۲۱۹	۵	ممکد	کلکد
۲۲۷	۹	اگر ہے	ہواگر
۲۲۷	۱۰	فرش	ہے فرش
۲۲۹	۱۱	سدائے	صدائے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۴۶	۱۷	بھئے	بھئے دیکھ
۲۴۸	۱۷	دیکھ	دیکھ کر
۲۵۲	۱۱	بیں	بیس
۲۵۷	۱۰	ہندی	بندی
۲۶۱	۱۳	میں	میں بھی
۲۶۲	۱۷	آن	اُن
۲۶۴	۱۰	منظہر	منظر
۲۹۴	۹	گر	گر
۲۹۸	۷	پلتے	چلتے
۳۰۰	۵	بے	بسے
۳۰۴	۱۷	جاۓ	جانے
۳۰۶	۸	تاۓ	ناۓ
۳۰۷	۱۷	ان	اس
۳۰۸	۵	ریہ	ریز
۳۱۸	۱۴	میرے	برسے
۳۲۳	۱۲	خیط	خرط
۳۲۸	۱۰	حم	خم
۳۲۹	۳	نکھنوی	لکھنوی
۳۶۳	۱۱	مشعرفاشہ	معرفاشہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۸۷	۳	جوش ملیح آبادی	انیس لکھنوی
۳۹۲	۷	تُو	تُو نہیں سُنتا
۳۹۲	۸	یتلیاں	پتلیاں
۳۹۲	۱۰	جان	جاں
۳۹۷	۱۰	بیرے	تیرے
۳۹۸	۶	پیئے	پیے
۴۰۰	۱۰	ریا	زبا
۴۰۰	۱۵	میں	میں ہ
۴۰۹	۵	بہمن	ا بہمن
۴۱۵	۹	تاب	ناب
۴۲۶	۳	لوڑے	توڑے
۴۳۲	۴	مئے بے دُرد	مے بے دُرد
۴۴۰	۱۱	لے	نے
۴۴۴	۴	ٹیرنگی	نیرنگی
۴۴۴	۳	حا	حبا
۴۴۸	۱۲	آموزِ	آموز
ج	۱	بایب	باب

حرفِ ناتمام

آپ جناب منشی مہاراج بہادر برق کے نام و کلام سے یقیناً واقف ہونگے۔ اب انکے کلام کا دوسرا مجموعہ موسومہ حرف ناتمام شائع کیا گیا ہے۔ اس میں مرحوم کی وہ تمام ادبی سیاسی، منظر نگاری اور واقعاتی نظمیں شامل ہیں جو مطلع نور کا جزو نہ تھیں۔ اس کے علاوہ مرحوم کے چیدہ چیدہ اشعار اور منتخب غزلیں بھی صحیح مجموعہ کردی گئی ہیں اور وہ قطعے بھی شامل کر دئے گئے ہیں جو بعض نامی شعراء نے آپکے انتقال پُر ملال سے متاثر ہوکر تحریر فرمائے ہیں۔

حرفِ ناتمام کی حقیقی منزلت آپ کو اس وقت خاص طور پر معلوم ہوگی جب علامہ حضرت کیفی، محبِ وطن بیرسٹر آصف علی ایم ایل اے ممبر سنٹرل اسمبلی، جناب ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی لٹ، خواجہ محمد شفیع بی اے اور حضرت خواجہ حسن نظامی جیسے اربابِ ادب کے تحریر کردہ مقدمہ ملاحظہ فرمائینگے۔

ہر قدردان علم و ادب کے کتب خانہ میں حرف ناتمام کی موجودگی ضروری ہے آپ سے بھی درخواست ہے کہ برائے کرم اس کی کم از کم ایک جلد خرید فرماکر برق مرحوم کی یہ دوسری یادگار اپنے پاس رکھیں۔

حرف ناتمام ۴۰۸ صفحات اور [illegible] پر مشتمل ہے۔ نیز کاغذ سفید دبیز اور چکنا استعمال کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں مصنف کا عکس تحریر بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ ٹائٹیل نہایت دیدہ زیب ہے۔ باوجود ان خوبیوں کے یہ تحفہ نایاب [illegible] فی جلد علاوہ محصولڈاک مندرجہ ذیل

پتہ سے دستیاب ہو سکتا ہے

ملنے کا پتہ

[illegible] چند سکسینہ طالب بی اے چاوڑی بازار گلی تاخان

دہلی